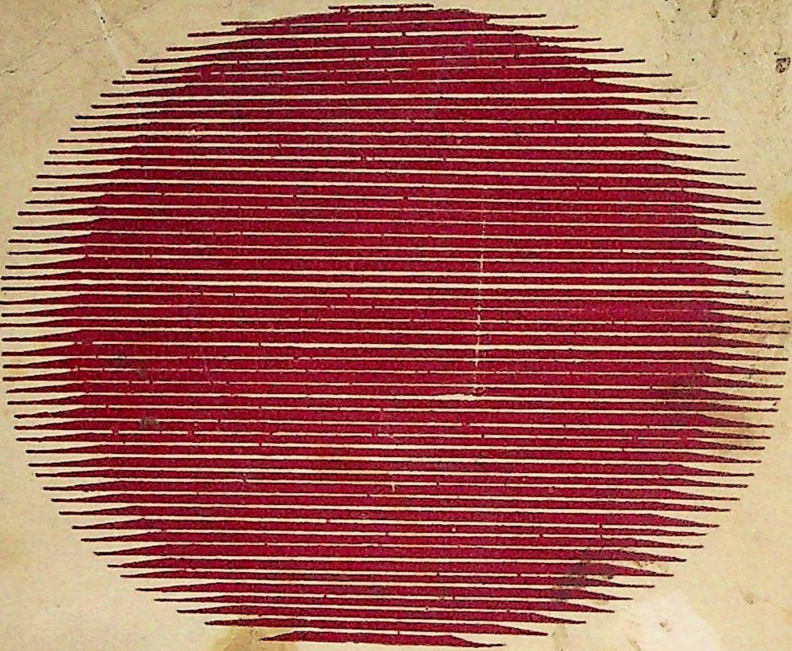

11

مشاہیر نمبر (ہمارا ادب)

MASHEER NUMBER

Part # ②

(Hamara adab)

ہمارا ادب

(مشاہیر نمبر)

جلد دوم

۱۹۷۸—۱۹۷۷

نگران

محمد یوسف ٹینگ

ترتیب

رشید نازکی

معاون

محمد اسد اللہ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجیز، سرینگر

ناشر : سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر

مطبوعہ : جے کے آفسیٹ پرنٹرس دھلی

کتابت : شریف احمد اندرابی

سرورق : بھوشن کول

سالِ اشاعت : ۱۹۷۹ء

قیمت :

ترتیب

۱	پیش لفظ	رشید نازکی	۵

مشائخ

۲	آچاریہ واسوگپت	ڈاکٹر بلجی ناتھ پنڈت	۱۰
۳	سید بُلبُل شاہؒ	پروفیسر عبدالاحد رفیق	۲۰
۴	حضرت بابا داؤد خاکیؒ	محمد اسد اللہ	۲۸

سلاطین

۵	راجہ ہنسیل	ڈاکٹر ٹی۔ این گنجو	۶۸
۶	راجہ میگواہن	رسوٗل پونپر	۹۶
۷	سلطان شہاب الدین	محمد امین شکیب	۱۰۶
۸	راجہ رنجیت دیو	جیتندر شرما	۱۱۸

علماء و شعراء

۹	کھیشمندر	پروفیسر پی۔ این پُشپ	۱۳۰
۱۰	ملا احمد کشمیری	پروفیسر مرغوب بانہالی	۱۴۴

۱۱ حبّہ خاتون پروفیسر شفیع شوق ۱۵۶
۱۲ محمود گامی ناجی منوّر ۱۷۱
۱۳ پرمانند موتی لال ساقی ۱۷۹
۱۴ اشیور کول بدری ناتھ کلا ۱۹۰
۱۵ مہجور پروفیسر مشعل سلطانپوری ۲۰۰
۱۶ سید میرک شاہ اندرابی سید نبیہ احمد اندرابی شہید ۲۲۰

مؤرخین

۱۷ ملک حیدر چاڈورہ ڈاکٹر عبدالمجید متو ۲۴۲
۱۸ عبدالوہاب شائق رشید اہرہ بلی ۲۴۷

وزراء

۱۹ شری بھٹ ارجن دیو مجبور ۲۶۰
۲۰ سید مبارک خان بیہقی محمد امین رفیقی ۲۶۵

مجاہدِ آزادی

۲۱ بادا جتوّ بلدیو پرشاد شرما ۲۷۸

مہم جو

۲۲ رسول گلوان عبدالغنی شیخ ۲۸۸

پیش لفظ

پچھلے دو تین سال سے ہم نے 'ہمارا ادب' کا مزاج بدلنے کی کوشش کی ہے۔ عام طور پر یہ سالنامہ 'انتھالوجی' کی شکل میں قارئین کے پیش ہوتا تھا۔ انتھالوجی کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن " دینِ بزرگاں خوش نکرد" کے مصداق اس تبدیلِ آب و ہوا میں ہماری دروں بینی کا کچھ دخل ہو یا نہ ہو لیکن ہماری خوش نیّتی کا ضرور حصّہ ہے۔ ایسی تالیفات اب گنجینۂ معانی کے بجائے کشکول بننا شروع ہوگئی تھیں اور اس عمل میں ' مُدیر و مُصنّف کو بغیر کسی کدو کاوش کے خوان یغما ہاتھ آنے لگا تھا، کونسی تخلیقات شہکار مانی جائیں' مدیر کی مرضی پر موقوف تھا، اور مُصنّف کو تو بہرحال زحمتِ تخلیق سے نبرد آزما ہونا ہی نہیں پڑتا تھا۔ غرض بقول کسے، 'مُشکل تو یہی تھی، کہ مُشکل ہی نہ تھی۔ اس دائرہ کار سے ہٹ کر سوچتے ہوئے ہم نے فیصلہ کیا کہ ایسے 'سالناموں' کو ریاست کے تمدّنی پہلوؤں کی بازیافت کے لئے وقف کیا جائے، تاآنکہ ریاست کی تاریخ تمدّن کے دِلآویز اور وسیع پہلوؤں سے نقاب کُشائی کی جاسکے۔ چنانچہ اسی تناظر میں ادارہ نے سب سے پہلے 'کشمیری لوک ادب نمبر' ترتیب دیا، جو خاصا مقبول ہوا۔ پچھلے سال مختلف تمدّنی دائروں کے عظمائے رِجال کا تذکرہ 'مشاہیر نمبر' کے نام سے شائع ہوا۔ اور اس سال ہم اسی عنوان

کی جلد دوم قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اگلے سال شاید اس سلسلے کا 'آثارِ قدیمہ نمبر' شائع ہو جائے۔ اس سے دراصل ہمارا مقصد ریاست کی تاریخ تمدّن مدوّن کرنے کی راہ ہموار کرنا ہے۔ یہ کام انتہائی صبر طلب اور ہمّت آزما ہے۔ لیکن اگر گردشِ دوران کو ٹال کر کے منصوبہ بند طریقے پر کام کیا جائے تو آئندہ محقّقین کے لئے راہ اُستوار ہو سکتی ہے اور اس تناظر میں ہمارا کام وقت کا بھاؤ ہو نہ ہو، ہر وقت کی چیز ضرور ہو گا۔ ظاہر ہے ایسا کام رسماً نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کے لئے پہلے ہی نشانات مقرر کرنے کی ضرورت ہے یا ایسا ہی ہونا بھی ہے، حالانکہ اس عمل اور ردّ عمل میں ہمیں مصائب کی حد تک مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، عنوانات مقرر کرنے کے بعد قلمکار معاونین کا تعاون پہلا ہفتخوان ہے جو طے کرنا پڑتا ہے، ہمارے عنوانات چونکہ یہاں کی ہزاروں سال کی تاریخ و تمدّن پر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے سنسکرت، عربی، فارسی ہندی اور کشمیری اہلِ قلم مخصوص عنوانات کے EXPERTS کی حیثیت سے ڈھونڈنا لازمی بن جاتا ہے۔ اکثر حضرات اپنے عنوان کا حق تو ادا کرتے ہیں، لیکن اُردو زبان سے بقدرِ ضرورت بھی آشنا نہیں ہوتے۔ اس لئے ایسے مضامین و مقالات کی تصحیح ایک الگ کام بن جاتا ہے۔ اس کے بعد کاتب حضرات کی عنایات کا نزول شروع ہوتا ہے اور مسطر پر اکثر بار پروف ریڈر کی گُلکاریاں کتابت سے بڑھ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی پروف ریڈر اس قدر اُوب جاتا ہے کہ بڑی بڑی عبارتیں رہ پاتی ہیں۔ یہ مشکل فارسی اور عربی نظم و نثر میں اور بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے کہ اصل عبارت یا شعر کا سیاق و سباق سے الگ کر کے عبارت کی صحت یا عدمِ صحت کا اندازہ کرنا بذاتِ خود ایک فن ہے۔ جو بنیادی طور پر ان زبانوں کا مزاج شناس ہونیکا مدعی ہے۔

بہرحال ان تمام مراحل سے گذر کر سالنامے کی صحت و عافیت کا انتظام کرنا مہم جوئی کے باوصف ہمارے فرائض میں شامل ہے اور ہم بقدرِ ظرف یہ خطرہ مول لینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس صورتحال سے ہمارے کچھ صاحبِ قلم حضرات چیں بجبیں نظر آتے ہیں، لیکن ہمیں افراد کے بجائے اصول کا احترام کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم جو چیز قارئین کے سامنے رکھ آئے ہیں، اس کی افادیت ایسے صاحبِ قلم حضرات کی ناخوشگواری سے کس حد تک مجروح ہو سکتی ہے۔ ہمارے قارئین پچھلے تین سالناموں کو پڑھ کر اس کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں، ہم اپنے تحقیق شناس سیکرٹری جناب محمد یوسف ٹینگ کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اس طریقِ عمل کو نہ فقط سراہا ہے بلکہ اپنا عملی اشتراک ہر وقت وقف رکھا ہے۔ یہ دراصل اُن کے فیضان کا نتیجہ ہے کہ ایسے دشوار تر مراحل سے ہم دلِ شگفتہ اور جبینِ کشادہ کی سوغات سے کبھی محروم نہیں ہوتے، میں اپنے ساتھیوں کا بھی شکر گذار ہوں جن کا اشتراکِ عمل اس طرح کی تحقیقات میں ہر وقت میرے ہم عنان رہتا ہے۔ ایسے احباب ہیں جناب محمد امین ابنِ مہجور، جناب موتی لال ساقی، جناب محمد احسن احسن، جناب بشیر اختر اور جناب محمد اسد اللہ وانی کا تذکرہ نہ کرنا ناسپاس گذاری کے مترادف ہے۔ جناب محمد احمد اندرابی، منتظم طباعت، جس خوش سلیقگی اور نفاست سے ہماری مطبوعات کو شائع کرواتے ہیں وہ بذاتِ خود اُن کی شیریں نفسی اور سعی جمیل کی دلیل ہے

زیرِ نظر سالنامے میں مقالات کی روش ہزار رنگ ہے، اور تمدنی معاملات پر لکھتے ہوئے یہ اندازِ نظر قابلِ فہم بھی ہے لیکن اس کے ہرگز

یہ معنی نہیں کہ ادارہ مقالہ نگار حضرات سے بالکلیہ متفق بھی ہے، ہم ہر قسم کے موزون خیالات کی پذیرائی کے قائل ہیں لیکن کسی کے طرفدار نہیں۔

جہانی میکند شوخی کدام اظہار و کو ہستی
ہنوز ایں نقش ہا در خامۂ نقاش جا دارد

(بیدل)

رشید نازکی

مشایخ

ڈاکٹر بلجی ناتھ پنڈت

آچاریہ واسُوگُپت

آج کل بھارت میں گُپت یا گُپتا کہلانے والے لوگ عموماً بنیا قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر پرانے زمانے میں اس نام کے برہمن بھی ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر چانکیہ کا دوسرا نام وِشنو گپت تھا۔ جیوتش شاستر کے ایک برہمن مُصنف برہم گُپت بھی بہت مشہور ہیں۔ دراصل اس زمانے میں سنسکرت زبان میں ملتے جلتے نام چلتے تھے جو سماج میں دو مختلف جماعتوں کیلئے استعمال ہوتے تھے۔ ایک نام تھا گپت (गुप्त) اور دوسرا تھا گُپتا (गोप्ता = गोपता)۔ پہلے نام کی ایک بنیوں کی جماعت تھی اور دوسرے نام کے لوگ برہمن ہوا کرتے تھے۔ اسی جماعت کے برہمن وِشنو گُپت اور برہم گپت تھے۔ اسی جماعت کے ساتھ تعلق رکھنے والا ایک عالموں اور فاضلوں کا خاندان مملکتہ کنوج میں رہا کرتا تھا۔ اس خاندان کے ایک عظیم عالم اتری گُپت تھے۔ برہمنوں کا گُپتا نام چانکیہ کے وقت سے پہلے ہی بگڑ بگڑ کر گپت بن چکا تھا۔ اسواسطے اتری گپت کو بھی دنیا میں لوگ گپتا نہیں گُپت ہی کہتے تھے۔ وہ آٹھویں صدی میں اس دنیا میں موجود تھے۔ اُس صدی میں جب مہاراجہ للتادِتیہ نے ملک گیری کی مُہم میں شمالی ہندوستان پر فوج کشی کی تو واپسی پر وہ جگہ جگہ سے اچھے اچھے عالموں کو بڑی عزت کے ساتھ کشمیر لے آئے۔ اُنکے لئے یہاں زمینوں اور مکانات کا انتظام کر کے انہیں مستقل طور پر یہاں ہی بسایا۔ اُسی سلسلے میں اتری گُپت کو بھی کشمیر میں لے آ کر اُنہیں موجودہ شہر سرینگر میں بسایا۔ انکا خاندان یہاں خوب پھیلا اور پھولا اور اس میں بہت سے عالم اور ادیب پیدا ہوئے جن میں سب سے زیادہ مشہور آچاریہ ابھنو گپت ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ آچاریہ واسو گپت بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔ انہوں نے اپنے متعلق یا اپنے آباو اجداد

اپنے کے متعلق خود کچھ بھی نہیں لکھا ہے ۔ نہ ہی اور کسی مصنّف کی کسی بھی کتاب میں انکے ذاتی حالات کے متعلق کوئی شہادت ملتی ہے ۔ اندازاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی اتری گپت کے ہی خاندان میں پیدا ہوئے ہونگے کیونکہ ایک تو اس خاندان میں بہت سے یوگی و عالم پیدا ہوتے ہی رہے اور دوسرے کشمیر میں اس زمانے میں کسی اور گپت نام کے برہمن خاندان کی موجودگی کی کوئی بھی شہادت نہیں مل رہی ہے ۔ آچاریہ وسوگپت نے دنیا بھر کے یوگیوں اور عالموں کی روحانی تربیت کیلئے ایک بیش قیمت نسخہ پیش کیا ہے ۔ وہ نسخہ شیوہ سُوتر نام والا شاستر ہے جس کی اہمیت کشمیر کے شیوی فلسفہ میں مسلّمہ ہے ۔

آچاریہ واسوگپت کے خاص شاگرد کا نام بھٹ کلٹ تھا ۔ انہوں نے شیوہ سُوتر میں درج شدہ فلسفہ کے اصولوں کی تشریح اپنی کتاب سپندہ کاریکا میں کی ۔ اس کتاب کی ایک مختصر تشریح بھی انہوں نے لکھی ۔ اس تشریح کا نام سپندہ سروسوہ (स्पन्द सर्वस्व) یا سپندہ ورتی ([illegible]) ہے ۔ اس تشریح میں انہوں نے صاف الفاظ میں یہ کہا ہے کہ انہوں نے یہ سپند نام کا علم اپنے استاد کامل آچاریہ واسوگپت سے حاصل کیا ۔ اس لئے واسوگپت اور بھٹ کلٹ کو تقریباً ایک ہی وقت کا مانا جا سکتا ہے ۔ کلہن نے اپنی راجہ ترنگنی میں کہا ہے کہ مہاراجہ اونتی ورمن کے دور حکومت میں کشمیر میں بھٹ کلٹ جیسے سدھ لوگوں نے عوام کی بہبودی کیلئے جنم لیا ۔ اونتی ورمن کا عہد حکومت ۸۵۵ء سے ۸۸۳ء تک کا ہے ۔ اس واسطے بھٹ کلٹ کو نویں صدی کے آخری حصہ میں مانا جا سکتا ہے ۔ اسکے مطابق اسکے اُستاد آچاریہ واسوگپت کا زمانہ نویں صدی کا پہلا حصہ ہونا چاہئے ۔

واسوگپت کے شاگردوں کے سلسلے میں آگے چل کر سدھ بھٹ بھاسکر پیدا ہوئے ۔ انہوں نے شیوہ سوتر پر ایک منظوم تشریح لکھی جسے شیوہ سوتر وارتک کہتے ہیں ۔ اس کتاب میں واسوگپت کے شاگردوں کا سلسلہ اس طرح سے بتایا گیا ہے ؛ ۱۔ واسوگُپت، ۲۔ بھٹ کلٹ، ۳۔ بھٹ پردیمن، ۴۔ پرگیارجن، ۵۔ مہادیو بھٹ، ۶۔ بھٹ شری کنٹھ، ۷۔ بھٹ بھاسکر ولد بھٹ دواکر

اس طرح سے بھٹ بھاسکر وسوگپت کے بعد ساتویں پشت کے اُنکے شاگرد تھے۔ انکو شیوہ سُوتر کے فلسفہ کا اور اسکے آغاز کی تواریخ کا علم لگاتار کا رسل اُستادوں کے سلسلے سے حاصل ہوا تھا۔ اس لئے جو کچھ انہوں نے اپنے اُس شیوہ سُوتر وارتک میں لکھا ہے وہ سب کچھ صحیح ہونا چاہئیے وہ لوگوں میں مروج سُنی سنائی کہانی جیسی بات نہیں ہو سکتی ہے۔

بھٹ بھاسکر نے آچاریہ وسوگپت اور شیوہ سوتر کے متعلق جو واقفیت پیش کی ہے وہ یہ ہے۔

" آچاریہ وسوگپت کو کوہ مہادیو پر کسی سدھ یعنی فقیرِ کامل کے ارشاد سے شیوہ سُوتر نام والی کتاب اور اسکے علم عمل کے راز حاصل ہوئے۔ اُسنے سارے علم عمل کے سمیت اس شاستر کو اپنے شاگرد بھٹ کلٹ کو عطا کر دیا" بھٹ بھاسکر کے کہنے کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ وسوگپت کو شیوہ سوتر نام والا شاستر اور اسکے سارے راز بذریعہ الہام حاصل ہوئے۔ یوگ کا ابھیاس کرنے والے فقیرِ کامل کیلئے ایسا الہام ہونا ناممکن نہیں۔ بارھویں صدی میں دکن کے چول نام والے ملک میں مہیشورانند نام والے ایک یوگی کو اسی طرح سے ارشاد ہوا تھا۔ اس یوگی نے اپنی کتاب مہارتھ منجری کی پریمل महार्थ मञ्जरी परिमल نام کی تشریح میں اپنے اُس عجیب، غریب تجربے کا ذکر مفصل طور پر خود کیا ہے۔ اس طرح سے آچاریہ وسوگپت کو کسی خدائی مہربانی سے شیوہ سُوتر نام کی کتاب اور اسکی اصلی تعلیم حاصل ہو گئی، اور اس نے اپنے قابل شاگردوں کے ذریعے انہیں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اتنی بات بھٹ بھاسکر کی شہادت سے ہمیں معلوم ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے وسوگپت کو شیوہ سُوتر کا مصنف نہ مان کر صرف اسکو ظاہر کرنیوالا اور سکھلانے والا استاد ہی ملا جاتا ہے۔

وسوگپت کے وقت سے کم از کم ایک سو سال پہلے کشمیر کی وادی میں ایک باکمال یوگی آ کر مستقل طور پر بس گئے تھے۔ انکا نام سنگمادتیہ संगमादित्य تھا۔ وہ وحدت کے نظریئے پر مبنی اور مروج فلسفۂ شیو کے علم اور اسکے عمل کے پورے ماہر تھے اور اس فلسفہ کو جگہ جگہ سکھاتے رہتے تھے۔ انکے اپنے خاندان میں اور انکے شاگردوں کے سلسلے میں بہت سے

ایسے فقیرِ کامل اور عالِم، فاضِل، تجربہ کار فلسفہ دان پیدا ہوئے جنکو شیوہ فلسفہ کی ترکِ त्रिक نام کی شاخ کی خدائی کتابیں بذریعہ الہام حاصل ہو گئیں۔ ان کتابوں کو ترک آگم کہتے ہیں۔ انمیں سے کچھ ابھی تک موجود ہیں۔ اگرچہ بہت ساری ختم ہو گئیں ہیں۔ اُن کتابوں کی بنیاد پر کشمیر میں اصولِ وحدت پر ٹھہرے ہوئے شیوہ فلسفہ کی تعلیم رائج ہو گئی۔ آگم شاستر عموماً شیوجی اور پاروتی کے درمیان ہوئی گفتگو کی شکل میں نمودار ہوئے ہیں۔ ان میں انسانی زندگی کے دنیاوی اُخروی اور روحانی مقاصد اور انجام کے متعلق بہت ساری باتوں پر مفصل طور پر ذکر ہوا ہے۔ اُمیں بے شمار مقاصد کی غرض سے کی جانے والی بہت سے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کے بے شمار طریقوں کا ذکر ملتا ہے۔ پرمیشور کے ساتھ پوری وحدت کی حالت کو حاصل کرنے کا جو زندگی کا آخری مقصد ہے۔ اُسکو حاصل کرنیکے ذرائع بھی آگم شاستروں میں بتائے گئے ہیں اور انمیں اصولِ وحدت کے فلسفہ کا بھی ذکر ہے۔ مگر ایسی باتیں ان میں اس طرح سے اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہیں کہ انکو ڈھونڈھ نکالنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایک گھنے جنگل میں سے کسی خاص بوٹی کو جمع کرنا یا گہرے سمندر میں سے موتیوں کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ علمِ فلسفہ کے اعلیٰ اصولوں کو ڈھونڈھنے والا اور انہیں اکٹھا کرنیوالا آدمی بہت قسم کی مذہبی تعلیم کے اصولوں اور طریقوں کے ذکر کے اس گھنے جنگل میں عموماً گمراہ ہو جاتا ہے۔ اُن مفصل آگم شاستروں کے مقابلے میں شیوہ سوتر ایک ایسی مختصر خدائی کتاب ہے جس میں وحدت کی اونچی حالت کو بہت جلد اور بہت آسان طریقے سے حاصل کرنے کے ذرائع پر صاف الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ وحدت کے نظریئے پر مبنی شیو فلسفہ کے بنیادی اصولوں کے علم کو بھی کہیں کہیں درج کیا گیا ہے۔ اسطرح سے شیوہ سوتر ایک بہت اونچے درجے کی روحانی کتاب ہے۔ بنیادی طور پر یہ فلسفہ شیو کی عمل کی کتاب ہے اور کہیں کہیں اُسکے علم پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ ویسے اُس علم پر لکھی گئی سب سے پرانی کتاب آچاریہ سومآنند کی شیوہ درشٹی शिव दृष्टि ہی ہے۔ علمِ فلسفہ کے طریقے کے مطابق کیا گیا شیوہ فلسفہ کا مفصل ذکر شیوہ درشٹی میں ہی ملتا ہے۔ آچاریہ سومآنند بھی کشمیر

میں نویں صدی کے آخری حصہ میں بقید حیات تھے۔ واسوگپت اور سوم آنند نے کشمیر کے فلسفہ شیو کے عمل اور علم کو ترتیب میں لایا۔ آگے اُسی صدی میں آچاریہ اُتپل دیو نے اِس فلسفہ کے علم کو بہت بلندی پر چڑھایا۔ اس شاستر کے عمل کو پوری طرح سے ترتیب میں لانے والے آچاریہ ابھینو گُپت دسویں صدی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کشمیر کے فلسفہ شیو کے اِن دونوں پہلوؤں کی واقعی اصلی صورت پر فیصلہ کن تشریح اپنی بہت ساری کتابوں کے ذریعے سے کی۔ اس طرح سے انکی خدمات نے اس شاستر کو پورے عروج پر پہنچا دیا۔

آچاریہ واسوگپت کو جس طریقے سے شیوہ سوتر حاصل ہوئے اُس وقت کے مصنفین جیسے سوم آنند، اُتپل دیو، رام کنٹھ وغیرہ نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ صرف اُتپل ویشنو نے اپنی سپندہ پردیپکا स्पन्द प्रदीपिका میں اس بات پر تقریباً وہی لکھا ہے جو بعد میں بھٹہ بھاسکر نے لکھا اور جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

بارہویں صدی میں آچاریہ کھشمیہ راج نے شیوہ سوتر پر ایک ومرشنی- विमर्शिनी نام کی تشریح لکھی۔ اُسی صدی میں آگے اُنکے شاگرد وردہ راج نے شیوہ سوتر پر ایک اور وارتک کو لکھا۔ اِن دونوں مصنفوں نے یہ لکھا ہے کہ مہادیو پہاڑ پر آچاریہ واسوگپت کو خواب میں بھگوان شیو کے درشن ہوئے اور یہ ارشاد ہوا کہ " اِس پہاڑ کی ایک چٹان پر شیوہ سوتر کندہ کئے گئے ہیں۔ اُس چٹان کی پہچان یہ ہے کہ وہ تمہارے ہاتھ کے دھکے سے کھڑی ہو جائیگی اور اُس کا نچلا حصہ تمہارے سامنے آجائیگا۔ اُسی پر شیوہ سوتر کندہ ہیں۔ اِن سوتروں کو نقل کر کے اُنکا پرچار کرو" واسوگپت نے ایسا ہی کیا اور ایک بڑی چٹان ہاتھ سے چھوتے ہی کھڑی ہو گئی۔ اس پر سے واسوگپت نے شیوہ سوتر کی نقل اُتار لی اور بعد میں وہ چٹان پھر سے اپنی پرانی حالت میں بیٹھ گئی اور شیوہ سوتر والا اسکا پہلو پھر سے زمین میں غائب ہو گیا۔ ہاروَن سے کچھ میل اوپر داراپہامہ کی طرف ایک جگہ پر ایک بہت بڑی چٹان اب بھی موجود ہے۔ لوگ اُسے شنکرپل یعنی شیوجی کی چٹان کہتے ہیں۔ مگر اسے پھر سے اوپر اُٹھا کر اور کھڑا کر کے کھشمیہ راج کی بات کی پوری سچائی کا امتحان کسی نے نہیں کیا۔ اس کہانی میں گنجا

تاریخی لحاظ سے کہاں تک سچائی ہے اور کہاں تک بھگتوں کی شردھا ہے۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا ہے خاص طور جبکہ بھٹ بھاسکر اور اُتپل ویشنو نے اسکا مفصل ذکر نہیں کیا ہے۔

اسوقت شیوہ سوتر تین حصوں یا ابواب میں دستیاب ہے۔ مگر بھٹ بھاسکر نے اپنے وارتک میں کہا ہے کہ شیوہ سوتر کے چار حصے تھے جنمیں سے بھٹ کلٹ نے پہلے تین حصوں میں بتائے گئے اصولوں کی تشریح اپنی سپندہ کارِکاؤں میں کی اور چوتھے حصے کی ایک۔ اور کتاب تتوارتھ چنتامنی तत्वार्थ चिन्तामणि میں۔ سپندہ کارِکا موجود ہے۔ اس کتاب کی متعدد شرحیں دستیاب ہیں۔ مگر دوسری کتاب اب کہیں بھی نہیں ملتی ہے۔ اُتپل ویشنو کی سپندہ پردیپکا میں اس کتاب کے حوالے ملتے ہیں اور آگے ابھینو گپت نے بھی اُسکا ذِکر کیا ہے۔ مگر نہ تو شیوہ سوتر کا چوتھا حصہ ہی کہیں مِل رہا ہے اور نہ بھٹ کلٹ کی وہ دوسری تشریح میسر ہے

شیوہ سوتر کے پہلے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر ایک جاندار کا اپنا اندرونی روپ بذات خود مکمل طور پر پرمیشور ہی ہے۔ مگر پھر بھی اسے اسکا احساس نہیں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پرمیشور کے خدائی کھیل کے اندر اسی کی ملاقاتوں کے اثر سے ایک ایک جاندار کی اپنی حقیقت چھپی رہتی ہے۔ اُس سے وہ محدود اور بے جان چیزوں جیسے انفرادی جسم، عقل، جان وغیرہ کو ہی اپنا آپ سمجھ کر ساری دنیا کو اپنے سے الگ سمجھتا ہوا حیوانی جبلتوں کے اثر سے محدود طریقہ سے جانتا ہوا اور کام کرتا ہوا لگاتار جینے اور مرنے کے چکر میں پھنسا رہتا ہے۔ وہ اپنی اصلی حقیقت کو نہیں سمجھتا ہے اور دنیا کے سبھی کاروباروں کو چلاتی رہنے والی پرمیشور کی طاقتوں کے ماتحت رہتا ہوا اس سمندر روپی دنیا کے اندر لگاتار ہچکولے کھاتا رہتا ہے۔ مگر اپنی اصلی حقیقت کو سمجھ لینے کی ایک بہت زوردار چاہ کو اگر کوئی جاندار پوری طرح سے کام میں لگا دے تو اسکے ذہن پر پڑا ہوا نا سمجھی کا پردہ ایک دم ہٹ جاتا ہے اور اسکی اصلی حقیقت خود بخود چمک اٹھتی ہے۔ اس حالت میں وہ حقیقت دماغ کی طاقت سے نہیں، بلکہ ایک عجیب و غریب روحانی اُجالے سے چمک اُٹھتی ہے۔ اس چمک کے اندر دل، دماغ اور باقی سب کے سب حواس اسوقت کیلئے

غائب ہو جاتے ہیں اور صرف ایک روحانی وحدت کا اُجالا چاروں طرف چھا جاتا ہے۔ اصلی حقیقت کے اس طرح سے چمک اٹھنے پر ایسے یوگی کو جو جو روحانی تجربات Experiences ہوتے ہیں اُنکا بھی ذکر شیوہ سوتر کے اُس حصے میں کیا گیا ہے۔ جس کا پرانا نام چیت پرکاش یعنی روحانی اُجالا ہے۔ کھشمیہ راج نے بعد میں اسکا نام شامبھوہ اوپائے शाम्भवोपाय رکھا اور وردہ راج نے بھی اسکی نقل کی۔ شیوہ سوتر کے دوسرے حصے میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اپنی حقیقت کے اس طرح سے چمک اٹھنے کے بعد اسکے ایک اور نتیجے کے طور پر یوگی کے دماغ میں کس کس طرح سے ایک حقیقی علم خود بخود نمودار ہو جاتا ہے اور کس کس طرح سے وہ اس حقیقت کو دماغی سطح پر بھی سمجھنے لگتا ہے کہ "میں سب کچھ بھی ہوں اور سب کچھ سے برتر بھی ہوں! سب کچھ مجھ میں ہے اور میں سب کچھ میں ہوں۔ یہ ساری دنیا میرا کھیل ہے۔ یہ مجھ سے پیدا ہوتا ہے اور مجھ میں ہی جذب ہوتا ہے۔ ایسے یقین کے پکے ہو جانے پر یوگی کو جو جو اور روحانی تجربات سامنے آتے ہیں انکا بھی ذکر شیوہ سوتر کے اس حصے میں کیا گیا ہے۔ اس حصے کا پرانا نام سہج ودیودے सहज विद्योदय۔ یعنی خود بخود ظاہر ہونیوالا حقیقی علم ہے۔ بعد کے مصنفوں نے اسے شاکتہ اوپائے शाक्तोपाय کا نام دیا ہے۔

شیوہ سوتر کے تیسرے حصے میں مفصل طور پر ان باتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس حقیقی علم کے بار بار تجربے سے یوگی کے اندر کس کس قسم کی روحانی طاقتیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ وہ کس کس قسم کے کرشمے کر سکتا ہے اور کس کس طرح سے دنیا کا کاروبار کرتے ہوئے بھی اسکی نظر کے سامنے اسکی حقیقی اصلیت چمک اٹھتی ہے۔ اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ ایسا یوگی کس طرح سے اس جسمانی حالت میں ٹھہرتا ہوا بھی اسی دنیا میں نجات کو حاصل کرتا ہے۔ اُس نجات کو جیون مکتی کہتے ہیں جیون مکتی کی حالت میں رہنے والے یوگی کے برتاؤ، کرتوت، نظریہ وغیرہ کس قسم کے ہوتے ہیں یہ بات بھی شیوہ سوتر کے اس تیسرے حصے میں مفصل طور پر کہی گئی ہے۔ اس حصے کا پرانا نام وبھوتی سپند विभूति स्पन्द یعنی روحانی طاقتوں کا ارتعاش ہے۔ مگر آگے کھشمیہ راج وغیرہ نے

اسے تو پلئے [redacted] نام دیا ہے ۔ ان تین حصّوں کے پرانے ناموں کا استعمال ایک تو بھٹ بھاسکر کے وارتک میں اور دوسرے بھٹ کلٹ کے سپندہ سروستوہ [redacted] میں کیا گیا ہے شیوہ سوتر کی تعلیم کا یہ خلاصہ ہم نے بھٹ بھاسکر کی تشریح کیمطابق دیا ہے کیونکہ آچاریہ وسوگپت کی صحیح تعلیم یہی ہے [redacted] بھاسکر کا وجود وسوگپت کے خاص شاگردوں کے سلسلے کے اندر ساتویں پشت میں آتا ہے ۔ اسکا وقت اندازاً دسویں صدی کا آخری حصہ ہے ۔ اسکے بعد گیارھویں صدی کے شروع میں کھیشمہ راج نے شیوہ سوتر ومرشنی نام کی تشریح لکھی اور اسکے بعد اسکے شاگرد ورده راج نے بھی شیوہ سوتر وارتک نام کی ایک اور تشریح لکھی ۔ ان دو کتابوں میں شیوہ سوتر کی تعلیم ایک نئے طریقے سے پیش کی گئی ہے ۔ ان دو مصنفوں میں سے کوئی بھی وسوگپت کے اپنے شاگردوں کے سلسلے میں نہیں آتا ہے ۔ کشمیر کے فلسفۂ شیو میں تین درجوں کے یوگ کی تعلیم دی گئی ہے ۔ اُن میں سے سب سے بلند درجہ شامبھو یوگ [redacted] کہلاتا ہے ۔ اسکے مطابق اپنی قوتِ ارادی (Will Power) کے ذریعے ایک دم اپنی حقیقی اصلیت کو پہچان لینا ہوتا ہے ۔ دوسرے درجے کا یوگ شاکت یوگ [redacted] کہلاتا ہے ۔ اُس میں اصلی حقیقت کو بار بار ذہن نشین کرتے کرتے اسکے گیان کو پکا کرنا ہوتا ہے ۔ تیسرے درجے کے یوگ کو آنوہ یوگ [redacted] کہتے ہیں ۔ اس میں اپنی قوتِ عقل پر یا اپنی جان پر یا سانسوں پر یا سانسوں کی آواز پر یا جسم کے اندر مختلف مرکزوں پر یا باہری دنیا کے مختلف عناصر پر اپنے خیال کو ٹھہرا کر اُس اُس عنصر کی واقعی حقیقت کے خیال کو دماغ میں پکا کرنا ہوتا ہے اور اسکے ذریعے سے اصلی حقیقت کو ٹھیک طرح سے جاننا یا پہچاننا ہوتا ہے ۔ یوگ کی یہ تین قسمیں تین اُپائے بھی کہلاتی ہیں ۔

کھیشمہ راج اور ورده راج کی رائے میں شیوہ سوتر کے تین باب انہی تین قسم کے یوگوں پر روشنی ڈالنے کی غرض سے لکھے گئے ہیں ۔ انکی رائے میں ان تین ابواب میں یہی بتایا گیا ہے کہ کس کس طرح سے ایک یوگی کو اصلی حقیقت کو جاننے کیلئے ان تین قسموں کے یوگوں کے تجربات کرنے چاہئیں ۔ اگر ایسی بات ٹھیک ہوتی تو پہلی [redacted] کے یوگ سوتر کیطرح

شیوہ سوتر کی ابتدا نچلے درجے کے یوگ سے یعنی آنوہ اوپائے سے کی گئی ہوتی اور سلسلہ وار شاکت اوپائے اور شامبھوہ اوپائے پر روشنی ڈالی گئی ہوتی۔ پھر بھٹہ کلٹ نے بھی اپنے سپندہ سروسو کے تین ابواب کے نام یہ تین اوپائے ہی رکھے ہوتے۔ اسی طرح سے بھٹ بھاسکر نے بھی کیا ہوتا۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ بھٹ بھاسکر کا نظریہ اور ہی قسم کا ہے۔ انکی رائے میں شیوہ سوتر کے شروع میں یہی سکھایا گیا ہے کہ شامبھوہ اوپائے کے ذریعے ایک دم اپنی اصلی حقیقت چمک اٹھتی ہے۔ اسکے لئے کسی اور ابھیاس کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ اس کے چمک اٹھنے کے بعد اسکے جو جو نتائج خود بخود سامنے آتے ہیں انکا ذکر پہلے حصے کے باقی سوتروں میں اور اگلے دو حصوں کے سوتروں میں کیا گیا ہے۔ اس طرح سے شیوہ سوتر کا استاد سیدھے شامبھوہ یوگ کے عمل کرنیکا ہے۔ باقی اوپائے اور انکے نتائج اس سے خود بخود ہاتھ میں آجاتے ہیں۔ اس بات کو ابھینو گپت نے بھی تنتر سار میں بیان کیا ہے۔ انکی رائے میں سچی عبادت کرنیوالے لوگ کو شامبھوہ اوپائے کو لیکر کے اُسے آزمانا چاہئے۔ اگر عابد اس پر ٹھہر نہ سکے تو تب اسے نچلے نچلے درجے کے یوگ پر اُتر آنا چاہئے۔ ہمارے استادِ کامل کا بھی یہی ارشاد ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ فتح کدل کے سوامی رام جی بھی یہی فرماتے تھے۔ اس واسطے ہماری رائے میں وسوگپت کی اصلی تعلیم کے متعلق بھٹ بھاسکر کا نظریہ ہی صحیح نظریہ ہے کھشیمہ راج نے صرف یہ جتلانے کیلئے کہ وہ بھی ایک نئی کھوج کر سکتے ہیں۔ شیوہ سوتر پر اپنے طریقے کی نئی تشریح لکھی۔ وردہ راج انہی کے نقش قدم پر چلے۔

شیوہ سوتر پر لکھی ہوئی ایک مختصر تشریح بھی ملتی ہے۔ جسے شیوہ سوتر ورتی शैव सूत्र वृत्ति کہتے ہیں اور جسکے لکھنے والے کا نام کتاب میں درج نہیں کیا گیا ہے۔ مگر اس تشریح کو اگر غور سے پڑھا جائے تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ کھشیمہ راج کی شیوہ سوتر ومرشنی کا ایک مختصر خلاصہ ہے۔ اس میں نہ تو کوئی نئی بات ہی درج ہے اور نہ کوئی نئے طریقے کی تشریح ہے۔ اسکے تین ابواب کے نام بھی شیوہ سوتر ومرشنی والے ہی نام ہیں۔

اتنی تشریحوں کے باوجود بھی شیوہ سوتر میں بتائے ہوئے علم اور عمل کے فلسفیانہ اصول آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے ہیں۔ آچاریہ وسوگپت نے شیوہ سوتر کی بنیاد پر جس سپندہ شاستر کی پوری تعلیم بھٹّ کلٹ کو دی، اسی تعلیم کو بھٹّ کلٹ نے اپنی سپندہ کارِکا اور سپندہ سروستوہ میں آسان لفظوں میں کیا۔ مگر انکے الفاظ کا اصلی مطلب اتنا گہرا ہے کہ اُسے صحیح طور پر وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو بھگوان شِو کے سچے بھگت ہوں اور جن پر شِو جی نے اپنی عنایت عطا کی ہو۔

کشمیر میں بزرگوں کی زبان سے ایسا سنا ہے کہ آچاریہ وسوگپت نے بھگوت گیتا پر ایک تشریح لکھی تھی جسے واسوی ٹیکا کہا جاتا تھا۔ مگر نہ تو وہ ٹیکا ہی اسوقت کہیں مل رہی ہے اور نہ ہی اُسکے حوالے کسی اور کتاب میں مل رہے ہیں۔

آچاریہ وسوگپت کشمیر میں کِس جگہ پر رہائش کرتے تھے اس بات کے متعلق یہی اندازہ لگایا جاتا ہے کہ وہ ہارون کے آس پاس کہیں رہتے تھے۔ ہم نے رہناواری کے ایک بزرگ سے ایک بار ایسا سنا تھا کہ ہارون سے کچھ اوپر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جسکا نام وُسنۃ پور یعنی وسوپور [illegible] ہے۔ مگر مجھے ابھی تک خود وہاں جاکر یا محکمہ مال کے کاغذات کی پڑتال کر کے اِسبات کی سچائی کا امتحان کرنیکا موقعہ نہیں ملا۔ اس واسطے یقینی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا ہے۔ کشمیر کے فلسفہ شِو کی کتابوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے جن پرانے استادوں کو آجکل کی دنیا جانتی ہے انمیں سے سب سے پرانے استاد آچاریہ وسوگپت ہی ہیں۔ اسی واسطے کچھ عالموں نے انہیں اس فلسفہ کا بانی بھی ٹھہرایا ہے۔ مگر جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے فلسفیانہ طریقہ پر لکھی ہوئی اِس فلسفہ کی سب سے پرانی کتاب دراصل سوم آنند کی شِیوہ درِشٹی ہی ہے۔ اسی میں ترک [illegible] کی بنیاد پر شِیوہ فلسفہ کے اصولوں کو ٹھہرایا گیا ہے اور باقی فلسفوں کے اصولوں کی بھی خوب پڑتال کی گئی ہے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود بھی شیوہ سوتر کی اور آچاریہ وسوگپت کی اپنی خاص اہمیت ہے جسکو کوئی نظرانداز نہیں کرسکتا۔ کشمیر کے فلسفۂ شِو کے آغاز اور عروج کی تواریخ میں آچاریہ وسوگپت کی ایک خاص جگہ ہے جسکو دنیا بھر کے شیوہ فلسفہ کے عالم ہمیشہ سے مانتے آئے ہیں۔ اور اسوقت بھی مانتے ہیں ★

پروفیسر عبدالاحد رفیق

سید بلبل شاہ رح

ہندوستان میں اسلام صوفیائے کرام نے پھیلایا۔ ان صوفیوں کا مقصد اور طریق کار فقط غیر مسلموں میں اشاعت اسلام نہ تھا۔ اور نہ تبدیلی مذہب انکا اولین مقصد تھا۔ انکے دروازے ہر ایک کیلئے خواہ وہ ہندو تھا یا مسلمان، امیر یا غریب کھلے تھے۔ اور انکا کام ہر ایک میں بلا کسی تفریق و امتیاز کے ارشاد و ہدایت تھا۔ ایک غیر مسلم کے قبول اسلام سے انہیں جتنی خوشی ہوئی تھی شاید اس سے زیادہ ایک مسلمان کے ترکِ گناہ سے ہوتی۔ صوفیہ کے اس مطمحِ نظر نے انکو اپنے مشن میں کامیاب بنالیا۔ یہ صوفیا ہر ایک کو خواہ وہ ہندو تھا یا مسلمان، ایک بلند تر روحانی زندگی کا پیغام دیتے اور اسکا عملی نتیجہ یہ تھا کہ کفار اسلام کی جانب راغب ہوتے اور عام مسلمان ایک پاک اور بے عیب زندگی کی طرف مائل ہوتا۔ اور صوفیاء حقیقی اسلام کی توسیع اور اشاعت چاہتے تھے۔ جسکی ضرورت فقط غیر مسلموں کو نہیں بلکہ بہت سے مسلمانوں کو بھی تھی۔ انکا مقصد یہ بھی نہ تھا کہ دوسرے مذہبوں اور انکے بانیوں کی بدگوئی کرکے اپنے مذہب کی فضیلت اور فوقیت ثابت کرتے۔ دوسرے مذاہب کی جانب انکا طرز عمل انتہائی روا داری اور صلح پسندی کا تھا۔ بلکہ غیر مسلموں میں سے جو شخص انکی اپنی کرامات یا پاک زندگی دیکھ کر انکے اور انکے مذہب کے قائل ہو جاتے انہیں اپنے دامن کے نیچے جگہ دینے کیلئے وہ ہر وقت تیار ہوتے تھے۔ عہ[1]

بہر حال جب دہلی میں اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ اور حالات کا رخ بدل گیا اور اسلام کی تبلیغ

عہ آب کوثر: شیخ اکرام، ایم اے، ڈی، لٹ۔

واشاعت کا عظیم انقلاب پیدا ہوگیا۔ اس سے مسلمان صوفیوں اور مبلغوں کو ملک کے دور دراز حصّوں میں بے کھٹکے جانے کا موقع ملا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم وجہ تاتاریوں کا حملہ تھا۔ جس نے اسلامی دنیا کا نظام زندگی درہم و برہم کر دیا اور جوق در جوق علماؤ مشائخ اسلامی ممالک سے جان بچا کر ہند میں پناہ گزین ہوئے اس زمانے کے تمام صوفی اور مشائخ ان ممالک سے آئے جہاں تاتاریوں نے ان کیلئے زندگی دوبھر کر دی تھی۔ اور اگرچہ منگولوں کے حملے سے باہر کے اسلامی ممالک کو بے انتہا نقصان پہنچا۔ لیکن ہندوستان کو فائدہ رہا۔ اور ان بزرگوں کی کوشش سے اسلام کو بڑی ترقی ہوئی۔ مسلمان تاتاریوں کو یاجوج ماجوج سمجھتے تھے۔ اور اس لئے اپنی مقدس اور عزیز چیزوں کو ان سے محفوظ کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مسلمان جہاں کہیں وہ تھا خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا اور اسلام کی حفاظت اور ترقی کیلئے اپنی جان جوکھوں میں ڈال دی۔ اور انکی کوشش بار آور ثابت ہوئی اور نہ صرف تاتاری حلقہ بگوش اسلام ہوئے بلکہ مذہبی جوش کا سیل گراں اسلام کو ان علاقوں میں لے گیا جہاں ابھی تک اس مذہب کا نام بھی نہ پہنچا تھا۔[1]

کشمیر میں پہلا مسلمان راجہ داہر کے بیٹے کے ساتھ سنہ ۷۱۵ء میں وارد ہوا تھا۔ اور اس مسلمان کا نام حمیم بن سام تھا۔ جو کہ ملک شام کا رہنے والا تھا اور راجہ داہر کی محمد بن قاسم کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد اسکے بیٹے کے ساتھ کشمیر کی سیر کو آیا تھا۔ چنانچہ مشہور مؤرخ و محقق خواجہ عبدالحمید عرفانی اپنی کتاب 'ایران صغیر' میں فرماتے ہیں:۔

> "بعد از شکست خوردن و کشتہ شدن راجہ داہر بدست محمد بن قاسم پسر داہر باتفاق یک نفر عرب بنام حمیم بن سامہ کہ اصلاً از شام بود۔ بکشمیر وارد شدہ و مورد تکریم راجہ کشمیر قرار گرفت و تاریخ ورود رو در حدود سال ۷۱۵ء میلادی می باشد"[2]

---

[1] آب کوثر از شیخ محمد اکرام ایم، اے، ڈی لٹ

[2] 'ایران صغیر' از خواجہ عبدالحمید عرفانی

لیکن اِکے دُکے مسلمان اسکے بعد بھی کشمیر میں آتے رہے اور راجہ ہرش کے عہدِ حکومت میں (۱۰۸۹ء سے ۱۱۰۱ء تک) بعض مسلمان کشمیری فوج میں ملازم تھے۔ ۱؎

ایک اطالوی سیاح مارکو پولو کی یادداشتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۷۵ء سے پہلے مسلمانوں کی ایک کافی تعداد کشمیر میں موجود تھی۔ جن کی سادہ زندگی نے یہاں کے مقامی باشندوں کو کافی متاثر کر لیا تھا۔ اور وہ عوام میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اسلام کی سادہ تعلیمات نے عوام کے دل میں اسلام کا مذہب قبول کرنیکی چاہت پیدا کر دی تھی۔ خواجہ عبد الحمید عرفانی "ایوان صغیر" میں فرماتے ہیں:۔

> "از یادداشت ہای (مارکو پولو) سیاح معروف ایتالیائی معلوم می شود۔ کہ در حدود سال ۱۲۷۵ء میلادی عدۂ قابل ملاحظہ از مسلمانہا در کشمیر وجود داشتہ است از منابع دیگر نیز پیداست کہ چون مردم از کیش ہندو و قیود سخت تنقیدات شدیدش خستہ شدہ بودند تعلیمات سادہ اسلامی مورد توجہ آنہا قرار گرفتہ و علماء و روحانیان مسلمان در محافل و دربار مورد تکریم بودند" ۲؎

سرزمین کشمیر میں صوفیوں اور مشائخ کیلئے ماحول بڑا سازگار تھا۔ اس لئے یہاں بھی مقدس ہستیاں اور نامور علماء و اولیاء مصلحین مبلغین کثرت سے وارد ہوئے۔ انمیں حضرت سید شرف الدین عبد الرحمان بلبل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات پیش پیش ہے۔ جو شاہ نعمت اللہ فارسیؒ کے مرید تھے اور جنکا تعلق سلسلہ سہروردیہ سے تھا۔ اور وہ سہدیو کے دور حکومت میں منگولوں کے خوف سے کشمیر میں ایک ہزار پناہ گزینوں کے ساتھ ترکستان سے آئے تھے۔ ترکستان انکا آبائی وطن تھا۔ جہاں منگولوں نے انکی زندگی اجیرن بنا دی تھی۔ ۳؎

۱؎ "آب کوثر" از شیخ محمد اکرام ایم، اے، ڈی لٹ ۲؎ "ایوان صغیر" از خواجہ عبد الحمید عرفانی

۳؎ "کشمیر انڈر سلطانز" از محب الحسن

حضرت سید بلبل شاہ کے نام کے متعلق مختلف تذکروں میں مختلف باتیں بیان کی گئی ہیں کہیں سید عبدالرحمان قلندر بلبل شاہؒ کہیں سید شرف الدین عبدالرحمان اور لقب بلال بتایا گیا ہے۔ اور بعض تاریخوں میں "حضرت بابا" اور کہیں بلبل شاہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری واقعات کشمیر میں فرماتے ہیں:۔

"مخفی نماند کہ جناب حضرت بابا را بعضے شاہ بلبل موسوم کردند و بعضے ہا شاہ بلالے میگویند"[1]

قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی اپنی تاریخ "نگارستان کشمیر" میں انکا ذکر یوں کرتے ہیں:۔

"اصلی نام سید شرف الدین عبدالرحمان اور لقب بلال تھا۔ زبانوں پر چڑھتے چڑھتے بلال کا بلبل ہو گیا۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"بلال شاہ تھے بلبل شاہ نہ تھے۔ یہ شاہی خطاب بزرگوں کے نام کے ساتھ صدیوں کے بعد جوڑا گیا ہے۔ سلف صالحین میں اسکا پتہ نہیں۔ اس لئے سید بلال تھے بلال شاہ نہ تھے۔"[2]

خزینۃ الاصفیا' میں لکھا ہے کہ حضرت بلبل شاہؒ کا اصلی نام شرف الدین تھا۔ اور اسلام کشمیر میں انکی بدولت پھیلا۔ وہ شاہ نعمت اللہ فارسیؒ کے مرید اور سہروردی سلسلے کے بزرگ تھے۔ ۱۳۲۴ء رنچن شاہ حاکم کشمیر کے عہد حکومت میں وہ کشمیر آئے اور راجہ اور اسکے بہت سے امراء کو مسلمان کیا[3]

ذولچو کا حملہ کشمیر کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس حملے کی وجہ سے کشمیر میں

---

[1] "واقعات کشمیر" از خواجہ محمد اعظم دیدہ مری

[2] 'نگارستان کشمیر' از قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاری

[3] 'خزینۃ الاصفیا' از مفتی غلام سرور لاہوری

ہندوؤں کی حکومت کا زوال شروع ہوجاتا ہے۔ منگولوں کی لوٹ مار کا سلسلہ وادی میں آٹھ مہینے تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں ملک میں بدامنی کا دور دورہ تھا۔ گھر گھر راج ہر جگہ موجود تھا۔ منگولوں کی واپسی کے بعد وادی کے لوگ پہاڑوں سے اپنے گھروں کو لوٹے جہاں وہ قتل و غارت اور غلامی سے بچنے کی غرض سے بھاگ گئے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے حملہ آوروں کی لائی ہوئی تباہی کو دیکھا اب چونکہ کشمیر میں کوئی باضابطہ حکومت نہیں رہ گئی تھی۔ اسلئے مقامی سرداروں نے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا۔ ان سرداروں میں رنچن جس کا پورا نام مہاچن ڈنگوسن اورگرب کا بیٹا تھا۔ جو سنہ ۱۲۹۰ء سے سنہ ۱۳۲۰ء تک لداخ کا حکمران تھا۔ چونکہ لداخیوں اور بلتیوں میں اکثر جنگ ہوا کرتی تھی۔ لیکن معاہدہ سنگولیا کیوجہ سے یہ جنگ کچھ دنوں کیلئے رک گئی تھی۔ اور بعد میں پھر اسکا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اور بلتیوں لداخیوں کو شکست دے کر اپنے آبا و اجداد کا انتقام لیا۔[1] اسی لڑائی میں رنچن کا باپ بھی مارا گیا تھا۔ رنچن نے لداخ کو چھوڑ کر کشمیر کا رخ کرلیا۔ اور درّہ زوجیلا پار کرکے کنگن میں قیام کیا۔ یہاں کے حاکم رام چندر کی مدد بھی کرتا رہا۔ وہ کشمیر کے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور عوام میں اپنی شخصیت کو ہر دلعزیز بنا رہا تھا۔ مگر وہ رام چندر کی اعلانیہ طور پر مخالفت نہ کرسکا۔ اس لئے اس نے لداخیوں کو اونی کپڑوں کے تاجر کے بھیس میں قصبہ لار میں بھیجا۔[2] وہ کچھ دن کاروبار میں مشغول رہے۔ اور انکے متعلق کسی کو بھی کوئی گمان تک نہ ہوا۔ ایک روز وہ تجارت کے بہانے سے قلعے کے اندر داخل ہوئے انہوں نے اپنے ہتھیار چھپا رکھے تھے رام چندر کے آدمیوں پر اچانک ہلہ بول دیا۔ اسی دوران میں پہلے طے شدہ پروگرام کیمطابق رنچن نے بھی قلعہ پر حملہ کردیا۔ رام چندر کی فوجیں شکست کھا گئیں اور وہ خود بھی مارا گیا۔ اسکا بیٹا راون چندر پور سے خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ گرفتار ہوا۔[3] اب کسی کو رنچن کی مخالفت

---

[1] "کشمیر انڈر سلطانز" از محب الحسن

[2] و [3] 'راج ترنگنی' اردو ترجمہ اچھر چند لاہور

کرنیکی ہمت اور جراءت نہ تھی۔ اس لئے وہ بغیر کسی مخالفت کے ۱۳۲۰ء کے آخر میں تخت نشین ہوا۔[1]

ریچن نے کشمیری عوام کے دل جیتنے کیلئے ہر طرح کی کوشش کی اور وہ اس مقصد میں کامیاب ہوا۔ اور راون چندر سے بھی دوستی کی۔ اور اس کو اپنا سپہ سالار بنالیا۔ لار کا علاقہ اسکو بطور جاگیر عطا کیا۔ راون چندر کی ہمشیرہ کوٹارانی سے شادی کی۔ اس وقت کشمیر میں عوام کے اخلاق بگڑ چلے تھے۔ شراب خوری کا دور دورہ تھا۔ عورتوں کی عظمت دری عام تھی۔ اسکے علاوہ سماج میں اور بھی دوسری برائیاں موجود تھیں۔

قدرت نے ریچن کے دل و دماغ میں تحقیق اور تلاش کا جذبہ عطا کیا تھا۔ وہ تلاش، تجسس اور بیداری کیلئے سرگرداں تھا۔ وہ زیادہ تر عالموں اور فلسفیوں کی صحبت میں رہا کرتا تھا وہ پنڈتوں اور بدھ بھکشوؤں کو آپس میں مناظرے کرواتا تھا۔ مگر یہ مناظرے اسکی روحانی پیاس کو بجھانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بدھ مت جو اسکا پیدائشی مذہب تھا خارجی عناصر کی آمیزش کیوجہ سے اس کیلئے باعث اطمینان نہ بن سکا۔ ہندو دھرم ذات پات کی بندشوں اور برہمنوں کی خودستائی کیوجہ سے جو اسکے نگران تھے اس کو پسند نہیں آتا تھا۔ بہرحال تلاش حق میں ناکامی ہوئی۔ وہ بے چین ہوا۔ اسکی راتوں کی نیند اچاٹ ہوئی۔ اور وہ گڑگڑا کر خدا سے سچے راستے کی طرف رہنمائی کیلئے دعائیں مانگتا تھا۔ ؎

سر بہ پیش خدای پاک نہاد   در مناجات رو نجات نہاد
مظہر تست ھر مکان و مکین   کای خداوند آسمان و زمین
کن بدین حنیفم محفوظ   دارم از کار باطلان محفوظ[2]

---

[1] 'بہارستان شاہی'، شعبہ تحقیقات سرینگر

[2] 'دور اسلامی کا پہلا حصہ' از مفتی محمد سعادت   سنہ ۱۳۴۰ء

درد آمیز مناجات سے فارغ ہو کر ایک آواز سنی کہ اطمینان سے رہو تمہاری دعا خدا نے قبول کی ہے کل صبح سویرے دیکھو تمہارے مدعا کا وقت آگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر جہاں آجکل محلہ بُلبل لنگر آباد ہے۔ یہاں اسوقت شاہی محلات ایوان اور محل تھے۔ اور مغربی کنارے پر شاہی باغات تھے۔ اور یہ باغ بھی بڑے بارونق تھے۔ دوسرے روز رینچن نے نیند سے اٹھکر اپنے محل کی کھڑکی کھولدی ؎

زید شخصے چو سرو برلب جوی　　طلعتش صبح و آفتابش روی
خرقہ پوشیدہ ہمچو خوش حالاں　　خواندہ قرآن چو بُلبل نالاں

ایک درویش کو فقیرانہ لباس میں ملبوس پایا۔ جو دریائے جہلم کے کنارے صبح کی نماز ادا کر رہا تھا حیران ہوا۔ اور یہ طریقہ عبادت اسکو بہت پسند آیا۔ خوشنما اطوار اور پسندیدہ ادا و اسلوب عبادت نے رینچن شاہ کو از حد متاثر کیا۔ اور گذشتہ رات کی قرار داد یاد آئی۔ اور روشن ضمیر درویش کو بلایا گیا۔ فقیر سے نام و نسب کے علاوہ اسکے دین کی تعلیمات کی بھی پوچھ گچھ کی گئی اور فقیر نے ہر ایک سوال کا جواب آسان انداز میں دیا اور فرمایا ؎

ہست در رہِ حق زتقدیرم　　سہروردی[1] شہاب الدین پیرم

اور فقیر نے اسلام اور اسلام کی تعلیمات کے خاص خاص معجزات کا تذکرہ وضاحت کیساتھ کیا۔ اور حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم کارناموں کو بھی بیان کیا۔ رینچن شاہ سن کر فوراً مشرف بہ اسلام ہوا۔ اور اسلامی نام ملک صدر الدین رکھا گیا۔ اسکے بعد اہل خانہ اور امراء کبار سب ایک ایک کر کے برضائے و رغبت خود مسلمان ہوئے۔ اور پھر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ حضرت بُلبل شاہؒ

---

[1] سہروردی سلسلہ بہت پرانا مسلک ہے۔ اور ٹھوس تبلیغی کاموں میں تو شاید اسکا پلہ چشتیہ سلسلہ بھی بھاری ہی ہے۔ چشتیوں اور سہروردیوں میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں اور اس امر کا بھی رواج رہا ہے کہ ایک شخص دونوں سلسلوں سے فیضیاب رہا ہے۔" (آب کوثر، شیخ اکرام)

کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اور اسلام قبول کرتے جاتے تھے[1] جن لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا انکی تعداد دس ہزار بیان کی جاتی ہے[2] خواجہ محمّد اعظم دیدہ مری واقعات کشمیر میں فرماتے ہیں:۔

> "عامہ خلائق فوج فوج بر دست حق پرست آں قدوۃ الکرام مبلغ الاسلام بشرف اسلام مشرف گشت"۔

شیخ بابا داؤد مشکواتی اپنی کتاب اسرار الابرار میں فرماتے ہیں:۔

> "بعد ازاں روز بروز مردم ایں دیار بشرف اسلام مشرف شدند و در مدارج ایمان سرکے نمودند و بمراتب توحید متفرع گشتند کہ نشان ولی کامل است کہ صحبت او دل کافرا شورش اسلام شور اند و طالع را بخواہش صلاح غیر اند"!

سعد اللہ شاہ آبادی نے اپنی کتاب منظوم تاریخ باغ سلیمان میں کیا خوب بیان کیا ہے۔

[3] اکثر از خلق رو بدیں کردند — رفتہ بر شاہ آفریں کردند
پارہ کردند رشتہ زنّار — از زنخ سبحہ پردہ اند بیکار
زانکہ بنود بقبول اہل سلوک — مذہب ناس غیر دین ملوک

بادشاہ نے مسلمان ہونے کے بعد حضرت سیّد کے ایما پر ایک بڑی خانقاہ کی بنیاد رکھی۔ جو اب بھی خانقاہ بلبل شاہ کے نام سے عوام میں مشہور ہے۔ اور ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی۔ خواجہ محمّد اعظم دیدہ مری نے اس خانقاہ کے بارے میں کیا خوب فرمایا ہے:۔

"ایں اوّل خانقاہے است کہ در کشمیر بنا یافت"

خانقاہے کہ فیض او ست بجد — ہست در خطہ اوّلیں مسجد
ہست در دیدہ مر ہنو ز پناہ — خلق را خانقاہ بلبل شاہ
مرشد دیں درو چو گوشش کرد — دردم احوال خویش راخوش کرد

---

[1] کشمیر، از ڈاکٹر صوفی [2] آب کوثر، از شیخ اکرام ایم اے، ڈی لٹ

محلہ بلبل لنگر میں دریائے جہلم کے کنارے پر یہ خانقاہ واقع ہے۔ جسکے اس پاس رنچن شاہ ملک صدرالدین کے شاہی محلات بھی موجود تھے۔ اس خانقاہ کی تعمیر میں صرف دیوار کی لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے استعمال ہوئے تھے۔ خانقاہ کے قریب ہی فقراء اور محتاجوں کیلئے ایک بڑا لنگر خانہ قائم ہوا تھا جہاں غریب اور محتاج لوگوں کو دونوں وقت کا کھانا ملتا تھا۔ لنگر کے اخراجات پرگنہ ناگام کے جاگیر کی آمدنی سے پورے کئے جاتے تھے۔ یہ لنگر مغلوں کے دور حکومت تک جاری تھا۔ خانقاہ فیض پناہ میں اپنے خلفاء اور خدام کو لوگوں کی مذہبی تعلیمات کے بارے میں ہدایات فرماتے تھے۔ اسکے علاوہ خود مذہبی اور روحانی تعلیمات کا درس بھی فرماتے تھے۔ سنہ ۱۰۱۳ھ ہجری میں یہ خانقاہ نذر آتش ہوگئی۔ مگر بہت جلد اسکی تعمیر از سر نو کی گئی اور قدیم وضع کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ سنہ ۱۲۳۶ ہجری میں سکھوں کے عہد حکومت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے اہل کاروان نے اس خانقاہ کو سرکاری تحویل میں لیا۔ اور شالی اور دیگر اجناس کا سٹور بنایا۔ ۱۹۳۱ء میں اس خانقاہ کو عوام کے سپرد کر دیا گیا[1] مگر خانقاہ کی حالت اب بہت ہی خراب ہے۔ اور خانقاہ اب کھنڈرات کی صورت میں نمایاں ہے۔

اسکے علاوہ رینچن شاہ ملک صدرالدین نے حضرت سید بلبل شاہؒ کی فرمائش پر مسجد رینچن شاہ بنوائی تھی۔ جو عالیکدل کے قرب وجوار میں دریائے جہلم کے کنارے اب بھی موجود ہے اس مسجد کو مسجد رینچن شاہ کہتے ہیں۔ یہاں نماز پنج گانہ کے علاوہ جمعہ کی نماز بھی ادا کی جاتی تھی اسکے علاوہ جامع مسجد بھی بنوائی تھی جسکے احاطے پر آج بدھ گیر، ملچمر، اویسی صاحب، رنگہ ٹینگ کے محلہ جات واقع ہیں اور یہ مسجد بھی شاہمیریوں کی ابتدائی دور میں ہی نذر آتش ہوگئی تھی۔ بعد میں ایک چھوٹی مسجد بنوائی گئی تھی جو اب بھی موجود ہے جس کا کتبہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور میں ایک انگریز مسٹر کیور نے لیا اور لندن کے آثار قدیمہ میں رکھا۔ اس کتبہ پر شاردا

---

[1] گلانسی کمیشن کی سفارشات کی بنا پر خانقاہ بلبل شاہؒ کو واگذار کر دیا گیا تھا۔

زبان میں مسجد کی تعمیر کی تاریخ کندہ کرائی گئی تھی۔[1]

خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے واقعات کشمیر میں یہ قول نقل کیا ہے کہ حق تعالےٰ نے مجھے اتنی طاقت دی ہے کہ میں غذا اور سرو سامان کے بغیر خوشی سے زندگی بسر کروں اور اسی بدن کے ساتھ روح کے جدا ہوئے بغیر دار البقاء کو جاؤں اور اس جسم کو ابد الآباد تک محفوظ رکھوں لیکن چونکہ یہ سب امور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہیں۔ میں اسکا مرتکب نہیں ہوتا سنت کی پیروی میرے نزدیک ہزار سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ اصل عبارت ملاحظہ ہو:۔

> "کہ بے خوردن زندگانی بتوانم کرد۔ اما ترک سنت نبویؐ شود۔ وبدان عنصری تا ابد حفظ میتوانم کرد۔ و بواسطہ مرگ در آنجہان میتوانم شد ولیکن متابعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت شود کہ پیش من یکے سنت بدست آوردن از تقرب صد ہزار مرتبہ انبیاء اولیاءؒ بہتر است۔"

اسرار الابرار میں بابا داؤد مشکواتیؒ نے حضرت بلبل شاہؒ کی چند قیمتی باتیں بیان کی ہیں۔ انکا ایک ایک لفظ گوہر آبدار ہے۔ دنیا والوں اور دین داروں کیلئے آپ نے نہایت با اثر اور خوش ذائقہ کلمات تصوف کا لازوال خزینہ ہے۔

> "وگفت سالک را تا دل خاص و زبان سالم و بدرقہ پیر نباشد غولان این راہ اورا بیک منزل نگذارند کہ برسند۔ پس از حرام چنان باید گریختن کہ از مار در کوہسار و از شبہ چنان باید دور بودن کہ در مراد از نار و از حلال چنان باید تناول کردن کہ در مخمصہ از مردار کہ تا حاجت بضرورت نرسد نخورد۔ و زیادہ از قدر حاجت تناول نکند و این را بر خود لازم گیرد و نذر کند۔"

حضرت سید بلبل شاہؒ عالم اور فاضل ہونے کے علاوہ صوفی منش زاہد تھے۔ انہوں نے

---

[1] تاریخ کشمیر کے دور اسلامی کا پہلا حصہ از مفتی سعادت

اسلامی تعلیمات حاصل کرنے کیلئے بڑی جدوجہد سے کام لیا تھا۔ چنانچہ شیخ بابا داؤد مشکواتی فرماتے ہیں

"دراصناف علم و عملے عالم و عاملے بودند۔ و در فنون حقیقت و معرفت عارف و کاملے"

خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کی یہ عبارت بھی قابل غور ہے:۔

"عالم بودند باقسام علوم صوری و معنوی" ؎

آنکہ در راہ الٰہی روشن از بدر و ہلال   بُلبل باغ ولایت شاہباز لامثال
شد بکشمیر اول از دینش درخت دین نہال   شیخ و مرشد عارف حق حضرت باباھلال

سیر و سیاحت اور زاہدانہ زندگی نے آپکو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر رہا تھا دنیاوی وابستگیوں سے کنارہ کش ہو کر تجدید کا عالم آپ نے اختیار کر لیا۔ ؎

سری عقبلی عاشق مست و قلندر میر و یم

غرض ان خوبیوں اور خصوصیات کی بنا پر آپکے متعلق بہت کچھ بتایا گیا ہے ؎

بلبل بوستان وحدت بود   اسم رحمان شدہ از و مشہود
اسم رحمان کہ فیض عام از وست   نیک و بد را امید تام از وست
بود آں خاص بارگاہ اللہ   آنکہ مشہور شد بہ بلبل شاہؒ
مظہر فیض عام و لطف عموم   ظلمت کفر شد از و معدوم

دین عالم چو نو بہار از وست
متمکن دریں دیار از وست

دیرہا را از بیخ دین کندند   مسجد و خانقہ بنا کردند
از دم صبح تا بوقت دیگر   شد باسلام دہ ہزار نفر
در ہدایت رہ متین است ایں   کار رداں اہل دین است ایں
از کمالات شاہ آں فتاح   گشتہ کشمیر نزہت الارواح

کشمیر میں ان دنوں جہالت اور اوہام پرستی کا دور دورہ تھا۔ لوگ اوہام پرستی کے شکار ہو چکے تھے۔ رات کے وقت باہر جانا خطرے سے خالی نہ سمجھا جاتا تھا۔ چوروں اور ڈاکوں کی بھی کثرت تھی۔ جنوں بھوتوں کے متعلق مختلف قسم کی داستانیں بیان کی جاتی تھیں۔ اوہام پرستی کا یہ حال تھا کہ لوگ سمجھتے تھے کہ بھوت برتنوں سے پکایا ہوا کھانا لے جاتے ہیں۔ یہ بات حضرت سید بلبلؒ کی حضور میں عرض کی گئی۔ تو انہوں نے ایک خاص قسم کی محفل میں سورہ جن کی تلاوت کی۔ تو اسکے بعد لوگوں سے اس قسم کی شکائیتیں سننے میں نہ آئیں۔

کہتے ہیں کہ ایک سال جب کہ کشمیر میں شدید جاڑا تھا۔ اور کڑاکے کی سردی کیوجہ سے دریائے جہلم کے پانی کی سطح یخ بستہ اور منجمد ہو چکی تھی۔ لوگوں کو پانی نہ ملنے کیوجہ سے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ خود حضرت سید بلبل شاہؒ کو بھی پانی کی تلاش میں سرگرداں ہونا پڑا۔ پانی کی سطح اس قدر منجمد ہو چکی تھی کہ تلوار، تبر، اور پتھر مار مار کر بھی یخ توڑنے میں ناکامی ہوئی۔ حضرت سیدؒ نے آسمان کی جانب رخ کیا اور فرمایا کہ سورج کہاں ہے؟ تاکہ اپنی گرمی سے یخ بستہ پانی کو پگھلا دے۔ اسی وقت سورج نمودار ہوا اور یخ بستہ پانی پگھل گیا ؎

بسالے کہ بودہ زمستان سخت ز یخ گشتہ دریا چو سندان سخت
دم صبح آں بلبل باغ جان سوی مغرب از خانقاہ شد روان
نشد آب ممکن کہ بستہ بود چو مرمر بہم سخت پیوستہ بود
بسنگ و تبر زیں شکستن نشد کشادے دراں سنگ بستہ نشد
دلِ شاہ زیں حالت آمد بجوش دراں بحر افتاد شور و خروش
بجذبہ بفرمود کو آفتاب؟ کہ یخ را بگرمی کند زود آب!
چو ایں حرف جاری شدش بر زبان عیاں گشت خورشید از آسمان

ہندوستان کے ایک آزاد وضع قلندر نے سرزمین کشمیر میں وارد ہو کر قیام کیا اور جناب سید بلبل شاہؒ کے حضور میں حاضر ہوا۔ ملاقات کی محفل گرم ہوئی۔ قلندر نے بنگ اور

تمباکو نوشی کی مانگ کی۔ حضرت سید موصوف نے قلندر کی دلنوازی کا اور احترام بجا لاتے ہوئے دونوں چیزیں مہیا کر کے پیش کیں۔ قلندر نے حضرت سید کے کمرے میں ہی رات بسر کی اور رات بھر دعاء سیفی کا وظیفہ پڑھا۔ حضرت سید حیران ہوئے۔ اور سوال کرتے رہے کہ دعا پڑھنے کی اجازت کس بزرگ سے حاصل کی ہے؟ قلندر نے عرض کیا "میں پیر و مرشد کی اجازت سے پڑھتا ہوں"۔ حضرت سید مزید استفسار کیا کہ آپکے پیر مرشد کا نام کیا ہے؟ قلندر نے عرض کیا کہ میرا پیر د مرشد وہی ہے جو آپکا بھی پیر و مرشد ہے"۔ حضرت سیّد نے فرمایا کہ اگر آپ بنگ اور تمباکو نوشی نہ کرتے تو دُعاءِ سَیفی کی وظیفہ خوانی میں مزید فوائد حاصل ہوتے قلندر نے نہایت عاجزی کے لہجہ میں کہا کہ یہ تو عادت ہے۔ حضرت سیّد نے فرمایا "ہر کہ ترکِ عادت نکرد قلندر نیست" یہ جملہ اس قدر اصلاح آمیز اور باثر ثابت ہوا کہ قلندر نے دونوں چیزوں کا استعمال چھوڑ دیا۔

آخر وہ دن بھی آیا کہ جناب سید بلبل شاہ کو اہل دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہونا پڑا۔ ۱۳۲۶ء مطابق، ماہ رجب ۷۲۷ھ ہجری کے روز وفات پائی۔ محلہ بلبل لنکر صحن خانقاہ فیض پناہ میں مدفون ہوئے۔

سال تاریخ وصل بلبل شاہ　　بلبل قدس گفت ھاصل اللہ
پیر روشن ضمیر بلبل شاہ　　شیخ دین متقی کشمیری
ارتحالش چو از خرد جستم　　گفت نامی ولی کشمیری

حضرت سید بلبل شاہ کی وفات کے بعد رنچن شاہ ملک صدر الدین کی وفات ڈھائی سال بعد ہوئی۔ اور وہ حضرت سیّد مذکور کے مزار کے قریب ہی دفن ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں مورا دین مشن کے مشہور تبتی عالم اور ماہر آثار قدیمہ اے، ایچ فرینگ نے انکی قبر دریافت کی[1] ملک صدر الدین کی وفات کے بعد کشمیر میں پھر بد نظمی پیدا ہوئی۔ شاہ میر ملک صدر الدین

---

[1] جرنل آف دی پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی ج ۱۲ ایضاً کشمیر انڈر سلطانز۔ از محب الحسن

کے ایک درباری نے راج سنبھالا۔ اور شمس الدین کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اور چار سال تک حکومت کرنیکا موقع ملا لیکن سلطان شمس الدین نے اسلامی حکومت کی مستحکم بنیاد رکھ دی۔ اور کوئی ڈھائی سو سال تک یہ خاندان کشمیر پر حکومت کرتا رہا۔ کیمرج ہسٹری آف آف انڈیا میں شمس الدین کے بارے یوں لکھا ہے:۔

"نئے بادشاہ نے اپنے اختیارات سمجھ کر اور نیک نیتی سے استعمال کئے۔ کشمیر کے ہندو راجے بڑے ظالم تھے۔ انکی اعلانیہ پالیسی یہ تھی کہ رعیت کے پاس معمولی دال روٹی سے زیادہ کچھ نہ رہنے دیا جائے۔ نئے بادشاہ کی حکومت سول اصولوں پر قائم تھی۔ اس نے بے جا سرکاری لگان اور غیر منصفانہ ٹیکس ہٹا دیئے۔ ٹیکس وصول کرنیکے ظالمانہ طریقے موقوف کر دیئے اور سرکاری لگان پیداوار کے چھٹے حصے پر مقرر کیا۔"[1]

حضرت بلبل شاہؒ کے ساتھ بہت سے عالم، فاضل اور خدا دوست کشمیر گئے تھے جنکو ملک صدر الدین نے مختلف سرکاری عہدوں پر تعینات کیا تھا۔ ان میں سے شیخ الاسلام ملا احمدؒ علامہ کی ذات بابرکات کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ حضرت علامہ مذکور اپنے برگزیدہ خصائل کے اعتبار سے نہایت ہی فضیلت رکھتے تھے۔ آپ سید بلبل شاہؒ کے رفیقوں میں سے تھے۔ روحانی فیوضات، حقیقت شناسی کے برکات کا سرمایہ حاصل کر کے اپنے پیر و مرشد کے ہمراہ کشمیر گئے اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔ شیخ الاسلام[2] کے عہدہ جلیلہ پر فائز المرام ہوئے۔ اسکے علاوہ درس گاہوں اور مکاتیب کی نگرانی کا کام بھی آپکے سپرد کیا گیا تھا۔ خاندان شاہمیری کے بعض شاہزادوں سلطان شہاب الدین، قطب الدین وغیرہ نے آپکے سامنے زانوی ادب تہہ کیا تھا۔ کشمیر کا نظام عدلیہ بھی آپکے سپرد تھا۔ آپ نے چند کتابیں بھی لکھی تھیں۔ جو اب ناپید ہیں۔ ان میں دو کتابوں

---

[1] یہ عظیم الشان منصب کشمیر میں افغانوں کے دور حکومت تک قائم رہا (تاریخ کشمیر کا اسلامی دور)

[2] ادارہ کی رائے میں ملا احمد عہد بڈشاہی کا تذکرہ عہد بڈشاہی میں آیا ہے ممکن ہے یہ کوئی اور ملا احمد ہوں۔ م، ر

کو بڑی اہمیت تھی۔ ۱۱۔ **فتویٰ شہابیہ** اس کتاب میں فقہ حنفیہ کے ضروری مسائل نہایت تحقیق سے بیان کئے گئے تھے۔ دوسری کتاب **شہاب ثاقب** کے نام سے موسوم تھی۔ اس کتاب میں تصوف، سلوک اور روحانی معارف کے اہم مسائل درج تھے۔ یہ دونوں کتابیں سلطان شہاب الدین کے نام پر معنون تھیں۔ سلطان شہاب الدین[1] کے عہد حکومت میں آپ نے وفات پائی اور مزار سید بلبل شاہؒ میں مدفون ہوئے۔ ملا محمد علامہ آپ کے جانشین فرزند تھے۔ اور وہ بھی اسی مزار میں مدفون ہیں۔

میاں شاہی ہندوستانی ایک اور صاحب دل حضرت سید بلبل شاہؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تھے۔ اور حضرت سید کے سامنے زانوی ادب تہہ کیا۔ سلوک و تصوف کے مقامات کی شناخت حاصل کی۔ اور اپنے پیر و مرشد کی خدمت گذاری اپنی عمر عزیز کا خاص مشغلہ بنالیا تھا۔ اور فقیرانہ زندگی بسر کی۔ دنیاوی مال و منال اور جاہ و جلال سے دور رہے۔ دنیا سے کنارہ کش ہو کر تجرید و تفرید کے مقامات میں مافوق درجہ حاصل کیا۔ آپ بھی حضرت سید بلبل شاہؒ کے مزار مقدس میں آرام فرما ہیں۔

ملک صدر الدین ریچن شاہ کو مسلمان بنانے کے علاوہ حضرت سید بلبل شاہؒ کے سامنے شری راون چندر جی نے بھی اسلام قبول کیا تھا۔ اسرار الابرار میں لکھا ہے:-

"اولے کسیکہ بعد از ریچن شاہ بپیش شیخ الاسلام بشرف اسلام مشرف شد۔
راون چندر بود کہ یکے از وزرای ریچن شاہ وجد چاڈورہ است۔"

شری راون چندر کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ انکے متعلق بہارستان شاہی کے مصنف کا قول ہے:-

"کہ در آں زمان مدار المہام را رینہ مے گفتند"

---

[1] شاہمیری دور کا عظیم سلطان جس کے بارے میں حضرت علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں فرمایا ہے ؎

راون چندر کشمیری افواج کا سپہ سالار بھی تھا۔ آپکی اولادیں کشمیر کے عظیم اور بہادر فوجی جرنیل پیدا ہوئے تھے۔ جنہوں نے کشمیری افواج کا سکہ غیر ممالک میں بھی بٹھا دیا تھا۔ ملک موسیٰ رینہ، ملک محمد ناجی، ملک حیدر چاڈورہ ان میں زیادہ اہم ہیں۔ مرزا شاہ میر بھی حضرت سید مذکور کے ہاتھوں مسلمان ہو چکا تھا۔ چنانچہ اخوند ملا احمد بن عبد الصبور ہادی نے خوارق السالکین میں ان کے متعلق لکھا ہے:۔

”از تربیت یافتگان و مریدان ہادی سُبل حضرت سید بُلبل شاہ بود۔“

اور بعد میں شاہ میر ملک شمس الدین کے لقب سے کشمیر کے تخت پر بیٹھا آپکا مزار سُنبل[۱] میں واقع ہے۔

مفتی غلام سرور قریشی نے اپنی کتاب خزینۃ الاصفیا میں بی بی للہ عارفہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ للہ عارفہ اپنے والدین کے ساتھ ۹ سال کی عمر میں حضرت بلبل شاہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی اور حضرت سید مذکور نے آپکو اپنی بیٹی کہہ کر پکارا تھا۔ اور پیش گوئی کی تھی کہ للہ دیدی کامل عارفہ ہو گی فارسی عبارت ملاحظہ ہو:۔

”پدر و مادر وے ہمراہ سلطان رینچو شاہ بادشاہ کشمیر مزبور آمدہ اند۔ وبخدمت سید بلبل شاہؒ رسیدہ و مرید شدند و بی بی للہ دیدی بعمر ۹ سالگی ہمراہ پدر و مادر اکثر اوقات بخدمت سید بلبل شاہؒ حاضر میشد و آنحضرت اورا دختر خود می خواند و نظر عنایات بحال وے میکرد۔ و می فرمود کہ بی بی للہ دیدی از کاملات عارفات خواہد بود۔ انشا اللہ تعالیٰ۔“

بی بی للہ عارفہ کے متعلق جناب سید بلبل شاہؒ کی پیش گوئی اسوقت صحیح ثابت ہوئی۔ جبکہ جناب سید جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور جناب سید حسین سمنانی رحمۃ اللہ علیہ نے سرزمین کشمیر کو اپنے مبارک قدموں سے مزین فرمایا۔ اور بی بی للہ عارفہ کو پیر و مرشد کی طلب نے بے قرار اور بے چین

جنگلات میں گھومتی رہتی تھی۔ سلطان علاؤالدین کے عہد حکومت میں سید جلال الدین بخاریؒ کشمیر تشریف لائے اور چھ ماہ تک قیام کیا۔ للہ عارفہ بھی ادب و انکساری کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور جناب سید جلال الدین بخاریؒ کی تقریر سے اطمینان قلب حاصل ہوا۔ اور اسکے بعد للہ عارفہ صبر و سکون کی زندگی بسر کرتی رہی۔ بعد میں سید حسین سمنانیؒ نے بی بی للہ عارفہ کو اپنی آغوشِ تربیت میں لے لیا۔

کتابیات

١۔	دستور السالکین	از:۔ مولانا خاکیؒ
٢۔	نور نامہ	از:۔ ابوالفقراءؒ
٣۔	اسرار الابرار	از:۔ بابا داؤد مشکواتیؒ
٤۔	تذکرۃ العارفین	از:۔ بابا علی رینہ زینہ گیری
٥۔	واقعات کشمیر	از:۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری
٦۔	درجات السادات	از:۔ خواجہ محمد اسحاق ناوچو
٧۔	فتحات الکبرویہ	از:۔ از جناب شیخ عبدالوہاب نوریؒ
٨۔	باغ سلیمان	از:۔ میر سعداللہ خان شاہ آبادی
٩۔	تاریخ کشمیر کے دور اسلامی کا پہلا حصہ	از:۔ مفتی سعادت
١٠۔	پیر و مردم تہران ۔ شمارہ ١١٢، ١١٣	
١١۔	راج ترنگنی اردو ترجمہ	از:۔ اچھر چند ۔ لاہور
١٢۔	کشیر	از:۔ ڈاکٹر صوفی
١٣۔	آب کوثر	از شیخ اکرام ایم، اے، ڈی لٹ
١٤۔	ایران صغیر	از:۔ خواجہ عبدالحمید عرفانی
١٥۔	تاریخ حسن جلد سوئم ۔ اردو	

۱۶۔ تذکرہ علماء ہند	از:۔ رحمان علی
۱۷۔ خزینۃ الاصفیا	از:۔ مفتی غلام سرور لاہور
۱۸۔ کیمرج ہسٹری آف انڈیا۔	
۱۹۔ کشمیر انڈر سلطانز	از:۔ محب الحسن
۲۰۔ مسلم رول ان کشمیر	از:۔ از:۔ ڈاکٹر پارمو
۲۱۔ بہارستان شاہی	
۲۲۔ تحقیقات امیری	از:۔ خواجہ امیر الدین پکھلوال
۲۳۔ تحفہ محبوبی ۔ امرتسر سنہ ۱۹۱۶ء	
۲۴۔ خوارق السالکین	از:۔ اخوند ملا احمد بن عبد الصبور ہادی
۲۵۔ مختصر تاریخ کشمیر	از:۔ محمد امین پنڈت
۲۶۔ مکمل تاریخ کشمیر جلد دوم	از:۔ محمد الدین فوق سنہ ۱۹۱۰ء دفتر کشمیری میگزین لاہور
۲۷۔ تاریخ فرشتہ اردو جلد	چہارم اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۲۸۔ کشمیر از فورگوسن انگریزی	سنہ ۱۹۵۲ء
۲۹۔ جاوید نامہ	از:۔ ڈاکٹر اقبال مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۵۹ء

محمد اسد اللہ

حضرت بابا داؤد خاکیؒ

حضرت بابا داؤد خاکی ہماری وادیٔ گلپوش کے سربرآوردہ صلحاء، فضلاء، ادباء اور علماء میں سے ہیں آپ اسی وادی میں پیدا ہوئے یہیں کھیلے کودے، پلے بڑھے، پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔ یہیں اپنی تعلیمی اور تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں اور وصال کے بعد بھی اسی وادی کی خاک کے سپرد کئے گئے۔

خاندان

حضرت بابا داؤد خاکیؒ کشمیر کے ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو ماضی میں اپنی علمی فضیلت، خاندانی نجابت اور فہم و فراست کی بدولت کافی ممتاز رہا ہے۔ اس خاندان کو ’گنائی‘ کہتے ہیں۔ پروفیسر محمد طیب[1] صدیقی لکھتے ہیں کہ انکا سلسلۂ نسب حضرت عاصم ابن امیر المومنین و امام المسلمین حضرت فاروق عادل رضؓ سے جا ملتا ہے۔ اسی لئے انہیں عاصمی کہا جاتا ہے۔ مگر منشی محمد الدین فوق[2] اس سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ ”یہ خاندان در حقیقت چندر بنسی راجپوتوں کی مشہور شاخ کٹوچ سے نسبت رکھتا ہے جس شجر کی ایک شاخ رینہ بھی ہے اسی رینہ خاندان سے حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدومؒ“ کا شجرۂ نسب بھی جا ملتا ہے۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار پروفیسر عبدالمجید سائر نے رسالہ

---

[1] حیات طیبہ حضرت ابو حنیفۂ ثانی شیخ بابا داؤد خاکیؒ ص ۱۰، ۳۰ و حاشیہ ص ۲۸

[2] تاریخ اقوام کشمیر ج ۱، ۱۹۱۰ء ص ۳۵۷-۳۶۱۔

الاولیا میں کیا ہے۔ "تواریخ سے ثابت ہے کہ اس خاندان (گنائی خاندان) کا شجرہ نسب اوپر جاکر سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم قدس سرہٗ کے خاندان کٹوچ راجپوت سے جا ملتا ہے جو اس طرح حضرت خاکیؒ سے شروع ہوتا ہے حضرت مخدوم شیخ بابا داؤد خاکی فرزند رشید ملا حسن گنائی ابن بابا محمد گنائی ابن بابا حسن ابن رائے شیر علی عرف بابا قاسم ابن رائے شیر دل ابن بیرم چندر عرف رائے بہرام ابن دھرم چندر ابن سنگرام چندر۔ سنگرام چندر کے دو بیٹے رام چندر اور مذکورہ دھرم چندر تھے۔ رام چندر کا فرزند ارجمند راون رینہ تھا جو ولی کامل حضرت بلبل شاہؒ کے فیض روحانی سے بادشاہ وقت رینچن شاہ کے ساتھ دین اسلام کے جام عرفان سے سرشار ہوا تھا اس راون رینہ کے سلسلہ سے ہمارے مرشد اکبر سلطان العارفین محبوب العالم حضرت مخدوم شیخ حمزہ قدس اللہ سرہ کا تعلق ہے چونکہ موصوف راون رینہ نے اسلام کے جام عرفان سے اپنی پیاس بجھائی تو اس کے ساتھ ہی اس کے چچیرے بھائی بیرم چندر عرف رائے بہرام نے بھی اسلام قبول کیا۔ اس کے دو فرزند ارجمند تھے ایک کا نام رائے ماوری اور دوسرے کا نام رائے شیر دل سلطان شہاب الدین کا وزیر اعظم تھا۔ رائے ماوری کی شاخ سے علم و فضل کے تابندہ ستارے بابا عثمان گنائی بابا رجب گنائی بابا نونی گنائی اور ملا فیروز گنائی وغیرہ گذرے ہیں جبکہ رائے شیر دل کی شاخ سے بابا نتو گنائی نے اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت سلطان زین العابدین بڈشاہ کے شاہی دربار میں مصاحبت کا درجہ پایا ہے اسی بابا نتو گنائی کے پڑپوتے ہمارے مرشد حضرت شیخ بابا داؤد خاکی ہوئے ہیں[1]"

پروفیسر محمد طیب صدیقی لکھتے ہیں کہ پروفیسر عبدالمجید سائرؔ حضرت خاکیؒ کے پردادا کا نام محمدؒ گنائی تحریر کرتے ہیں اور نتو گنائی کا پڑپوتا بیان کرتے ہیں اور نتو گنائی کا پڑپوتا[2] پروفیسر محمد طیب صدیقی

---

[1] "رسالۃ الاولیا" از پروفیسر عبدالمجید سائرؔ ۱۳۸۵ھ بحوالہ حاشیہ حیات طیبہ ابوحنیفہ ثانی شیخ بابا داؤد خاکیؒ از۔ پروفیسر محمد طیب صدیقی ص ۳-۲ [2] حیات طیبہ ابوحنیفہ ثانی شیخ بابا داؤد خاکیؒ حاشیہ ص ۲۳

بھی درست ملتے ہیں۔ جبکہ نتو گنائی کا اصلی نام محمد طیب صدیقی میر محمد علی[1] لکھتے ہیں ممکن ہے میر محمد علی ہی کو محمد گنائی بھی کہا جاتا رہا ہو۔ یا پروفیسر عبدالمجید سائر کو نام لکھنے میں غلطی ہوئی ہو حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ حضرت بابا داؤد خاکیؒ خود اپنے جدِّ امجد کے بارے میں دستور السالکین میں رقم طراز ہیں:۔

> "جدِّ من نتو گنائی نام شخصے است، صاحب حیثیت آثار در زمان سلطان بڈشاہ از اہل دربار بود۔ و مولانا محمد عثمان ولی کہ مشہور بہ مخدوم میت است، عموزادہ وے اند۔ ہر دو ایشاں در مزار کلاں بڈشاہ مدفون اند و ایں ہم دال بر صلاح و معتبری ایشاں است ورنہ در آں مزار در آں زماں ہر کسی را جا نمی دادند"

اس اقتباس میں سے یہ جملہ کہ نتو گنائی اور مولانا محمد عثمان آپس میں چچازاد تھے واضح کرتا ہے کہ یہ وہی نتو اور عثمان ہیں جنکے دادا کا نام للے شیر علی عرف بابا قاسم تھا اور جس کا سلسلۂ نسب راون چند کے چچازاد بھائی رائے بہرام سے ہوتا ہوا چندر بنسی خاندان کی ہندوؤں مشہور شاخ کٹوچ سے جا ملتا ہے جسکی اس وقت تک بقول محمد الدین فوق کئی ذاتیں بن گئی ہیں۔ مثلاً ریزہ، گنائی، مخدومی، ملک، بابا، شال، ریشی، خاکی وغیرہ[2]۔ چندر بنسی خاندان کی اسی شاخ سے حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدومؒ کا تعلق ہونے کی وجہ سے پیر و مرشد کا ایک ہی خاندان ہے۔

جہاں تک حضرت بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ کے شجرۂ نسب کا تعلق ہے یہ کافی تحقیق و جستجو کے بعد محمد امین صاحب ابنِ مہجور کی وساطت سے میسر ہوا ہے۔ جو اس طرح ہے:۔

---

[1] حیات طیبہ ابو حنیفہ ثانی شیخ بابا داؤد خاکیؒ ۔ ص ۳۰

[2] تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم ص ۳۵۷

شجرۂ نسب حضرت بابا داؤد خاکیؒ

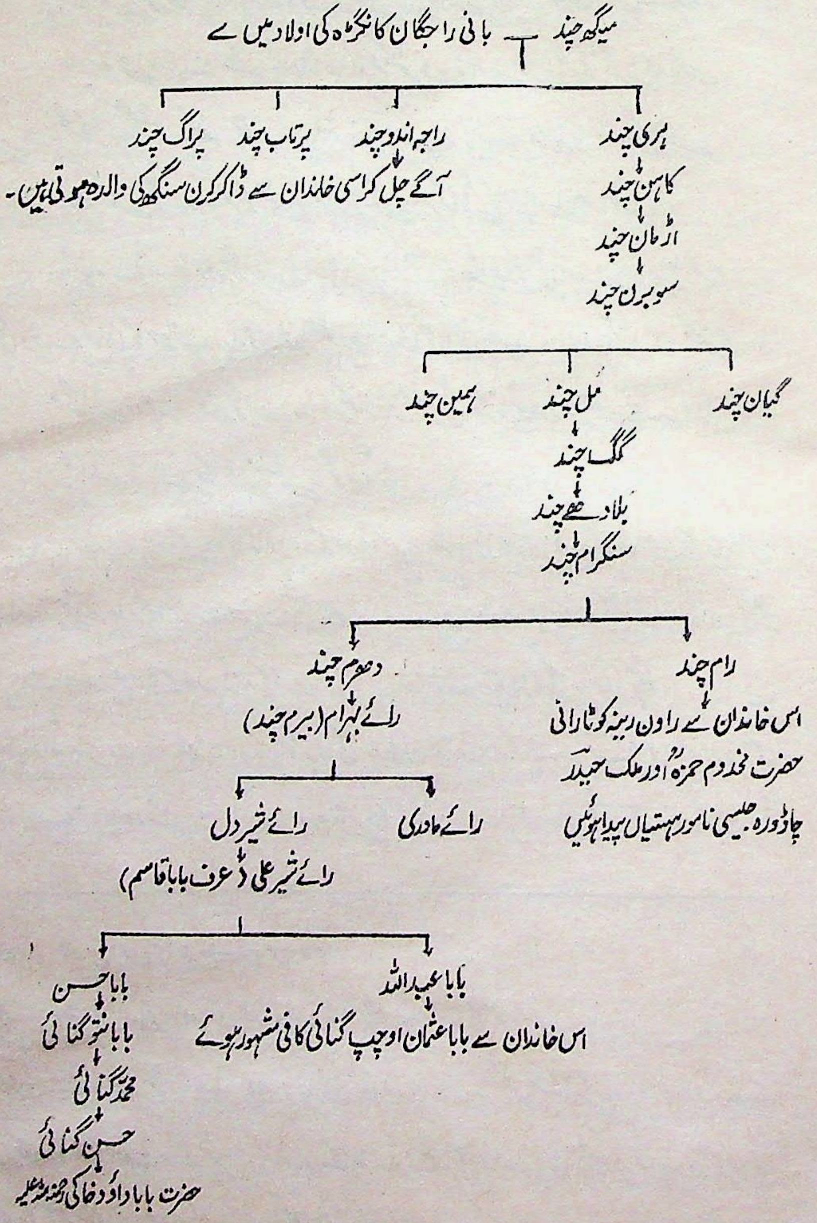

میگھ چند — بانی راجگان کانگڑہ کی اولاد میں سے

ہری چند
راجہ اندو چند
پرتاب چند
پراگ چند

راجہ اندو چند ← آگے چل کر اسی خاندان سے ڈاکٹر کرن سنگھ کی والدہ ہوتی ہیں۔

ہری چند
کاہن چند
اڑمان چند
سوبرن چند

گیان چند
مل چند
ہمین چند

مل چند
گگ چند
بلادھے چند
سنگرام چند

رام چند
دھرم چند

رام چند
اس خاندان سے راون رینہ کوٹارانی
حضرت مخدوم حمزہؒ اور ملک حیدر
چاڈورہ جیسی نامور ہستیاں پیدا ہوئیں

دھرم چند
رائے بہرام (بیرم چند)

رائے مادری
رائے شیر دل

رائے شیر دل
رائے شیر علی (عرف بابا قاسم)

بابا عبد اللہ
بابا حسن

بابا عبد اللہ
اس خاندان سے بابا عثمان اوچپ گنائی کافی مشہور ہوئے

بابا حسن
بابا نتو گنائی
محمد گنائی
حسن گنائی
حضرت بابا داؤد خاکی رحمۃ اللہ علیہ

گنائی کی وجہ تسمیہ :- بابا داؤد خاکیؒ کی ذات گنائی ہے۔ جہاں تک لفظ گنائی کا تعلق ہے یہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ جسکے معنی حساب و کتاب جاننے والا، منشی، کاتب، اہل قلم وغیرہ ہیں۔ منشی محمد الدین فوق لکھتے ہیں :-

"یہ خالص کشمیری لفظ ہے اور اسکے لغوی معنی ہیں منشی، کاتب، اور عالم۔ علاوہ اس کے سرکاری ملازم کا بھی اس سے مطلب لیا جاتا تھا قدیم کشمیری زبان میں قلم کو "گن"، اور اہل قلم کو "گنئی" کہتے تھے ..... کشمیر قدیم میں پہلے پہل صرف بادشاہ کی طرف سے کسی بڑے عالم کو علمی قابلیت کی بنا پر گنائی کا خطاب ملتا تھا[1]"

بڈشاہ نے اپنے دور حکومت میں بابا داؤد خاکیؒ کے جدامجد کو علمی فضیلت اور اہل قلم ہونے کی وجہ سے گنائی کا خطاب دیا۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری بھی اپنی تصنیف واقعات کشمیر میں لکھتے ہیں :-

"گنائی در عہد سابق نویسندہ را می گفتند از مفتی گرفتہ تا پٹواری ہمیں لقب بود، گنائی بزبان فارسی منشی را گویند[2]"

یہ خطاب پہلے پہل دو خاندانوں کے سربرآوردہ علماء اور فضلاء کو دیا گیا تھا جن کے خاندان میں آگے چل کر جامع الکمالات حضرت شیخ[3] یعقوب صرفیؒ اور حضرت بابا داؤد خاکیؒ پیدا ہوئے اور اپنی علمی قابلیت اور خداداد صلاحیتوں کی بدولت افق عالم پر درخشندہ ستاروں کی مانند چمکے۔

پیدائش :- حضرت بابا داؤد خاکیؒ سلطان محمد شاہ کے عہد ۹۲۸ھ میں ناؤ پورہ میں پیدا ہوئے "دیدہ رشادت" سے مادہ تاریخ نکلتی ہے۔ اسی سال آئیگ اور گنائی خاندان

---

[1] تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم ص ۳۶۱

[2] واقعات کشمیر بحوالہ حیاتِ طیبہ ابو حنیفہ ثانی شیخ بابا داؤد خاکیؒ ص ۱۳

[3] حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کا بابا داؤد خاکیؒ کی طرح سال پیدائش ۹۲۸ھ ہے وہ اپنے وقت کے سربرآوردہ علماء، فضلاء، اور شعراء میں شمار کیے جاتے تھے۔ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کو کبروی طریقہ کی تعلیم انہوں نے ہی دی۔ انہیں جامیؒ ثانی بھی کہا جاتا ہے۔

میں ایک برگزیدہ صاحب کمال حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ بھی پیدا ہوئے ہیں حضرت بابا داؤد خاکیؒ کے والد محمد حسن گنائی خوش نویس، عالم فاضل، جاگیر دار اور درباری تھے۔ والدہ ماجدہ بھی بڑی نیک، خاتون تھیں۔ اور چھوٹے بھائی زین الدین بھی کافی پڑھے لکھے اور درباری ندیموں میں سے تھے۔

تعلیم:۔ بابا داؤد خاکیؒ کے والد ماجد کا انتقال انکے ایام طفولیت میں ہی ہو گیا تھا مگر والدہ ماجدہ نے اسوقت کی اعلیٰ درسگاہ میں بابا داؤد خاکیؒ کی تعلیم کا انتظام کروا دیا کچھ عرصے کے بعد ماں کا سایہ بھی انکے سر سے اٹھ گیا۔ اب بابا داؤد خاکی والدین کی شفقت سے محروم تھے مگر انہوں نے عالی ہمتی سے کام لیا۔ اپنے خانگی امور کو احسن طریقے سے چلاتے رہے اور سلسلۂ تعلیم کو بھی جاری رکھا۔

ابتدائی تعلیم محلہ علاؤالدین پورہ کے مدرسہ میں حاصل کی جو سید اسماعیل ہمدانی کبروی کے اہتمام اور سرپرستی میں چل رہا تھا۔ اس مدرسے سے فارغ ہونے کے بعد محلہ خندہ بون نواکدل کی درسگاہ میں داخلہ لیا جسکی نگرانی ملا اخوند بصیر اعمی کرتے تھے۔ جو خود ایک بہت بڑے عالم اور ماہر اسلامیات تھے اس درسگاہ میں انہوں نے خوش نویسی، حدیث، تفسیر اور فقہ میں مہارت تامہ حاصل کی اس کے بعد محلہ قطب الدین پورہ میں مولانا رضی الدین کے دارالعلوم میں مزید اکتساب علم کے لئے داخل ہوئے۔ اس دارالعلوم سے حدیث، تفسیر، فقہ، عروض ادبیات، ریاضی، اور دیگر متداولہ علوم و فنون کی عربی اور فارسی زبان میں درجہ کمال کی دستگاہ پیدا کی۔

حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے علم حدیث کی سند شیخ یعقوب صرفیؒ سے حاصل کی جنہوں نے خود علامہ ابن حجر مکی سے باقاعدہ حدیث کی سند حاصل کی تھی۔ انکے علاوہ میر محمد افضل اور ملا شمس الدین جیسے علماء سے بھی آپ نے اپنی علمی تشنگی دور کی۔ علوم و فنون کے میدان میں وہ تمام معرکے سر کئے جو اسوقت شہرت، ناموری، اور ہر دلعزیزی کی خاطر ضروری سمجھے جاتے تھے۔

شادی:- حضرت بابا داؤد خاکیؒ کا عقد اُس وقت کے ایک بہت بڑے عالم و فاضل اور خدا دوست بزرگ سید میر میرک اندرابیؒ کی دختر نیک اختر بی بی مریم سے ہوا۔ جن سے دو بیٹے مولانا محمد صالح خاکیؒ، مولانا محمد سعید خاکیؒ اور ایک بیٹی طیبہ پیدا ہوئی۔ دونوں بیٹے اپنے والد حضرت بابا داؤد خاکیؒ کے تربیت یافتہ تھے۔

ان کے خاندان کے لوگ اس وقت وادی کشمیر اور اس سے باہر پونچھ وغیرہ میں آباد ہیں اور ان کے خاندان کا اندرابی سادات کے ساتھ اب بھی رشتہ قائم ہے۔

شاہی دربار سے تعلق:- حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، ریاضی، عروض، ادب، اور دیگر ضروری علوم کی عربی و فارسی میں تعلیم حاصل کی، اور باقاعدہ اسناد لیکر علم و ادب کے افق پر ایک درخشندہ ستارے کی مانند چمکے اور اپنے وقت کے سربرآوردہ علماء میں شمار کئے جانے لگے۔ اس وقت کشمیر کا حاکم علی شاہ چک تھا۔ جب اس نے حضرت بابا داؤد خاکی کی شہرت سُنی تو انہیں شاہزادہ یوسف[1] کا نہ صرف اتالیق مقرر کیا بلکہ نظامت تعلیم کے علاوہ "قاضی القضاۃ اور مفتی اعظم" کے جلیل القدر عہدوں پر بھی فائز کیا۔ انکی سالانہ تنخواہ ایک سو خروار شالی اور روزینہ دو اشرفیاں مقرر کیں[2]"، اس طرح سے بابا داؤد خاکی خوشحال اور فارغ البال زندگی بسر کرنے لگے اور عوام انہیں ملّا دولت کے نام سے پکارنے لگے۔ جب کبھی سیر و سیاحت یا دربار کیطرف تشریف لے جاتے تو کافی اہتمام ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ

---

[1] پروفیسر عبدالقادر سروری "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" ص ۸۲ پر لکھتے ہیں کہ "تعلیم سے فراغت پانے کے بعد شہزادہ نازک شاہ کی اتالیقی کی خدمت انکے سپرد ہوئی"، معلوم نہیں یہ نازک شاہ کون تھا اگر یہ شاہزادہ وہ ہے جسنے حکومت کی ہے اور جو ۹۳۵ھ میں کشمیر کا پہلی بار بادشاہ بنا جب بابا داؤد خاکی کی عمر سات سال تھی تو انکی اتالیقی بعید از امکان ہے

[2] "دوماہی شیرازہ" مطبوعہ کلچرل اکاڈمی (مضمون بابا داؤد خاکیؒ ایک تعارف از:- طیب صدیقی) مارچ ۱۹۶۸ ص ۷۲ - حسن لکھتا ہے کہ حضرت خاکی ۱۰۰ [illegible] روپے ماہوار پر پڑھاتے تھے ملاحظہ ہو تاریخ حسن جلد سوم ص ۱۷۵

"آپ کے پیچھے نقیب چوبدار اور حاشیہ بردار" دور باشس " کے نعرے لگاتے تھے۔ اور کبھی کشتی میں سوار ہوتے تھے تو بیس پچیس ملاح چپوؤں میں چھوٹی گھنٹیاں لگا کر ناؤ کو کھیتے تھے اور ان چپوؤں سے عجیب چھنکار نکلتی تھی اور لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ ملّا دولت دربار کی طرف بسواری کشتی جاتے ہیں۔[1]

غرض بابا داؤد خاکیؒ کی علی شاہ کے دربار میں کافی عزت تھی! ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ اور ملکی اور سلطنت کے دیگر انتظامات میں بھی کافی دخل تھا۔

حضرت سلطان العارفین کے دربار سے وابستگی

تربیت روحانی اور تزکیۂ نفس

حضرت بابا داؤد خاکی علی شاہ چک کے دربار سے منسلک ہونے کے بعد عیش و عشرت سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ علی شاہ چک چونکہ علماء و فضلاء کا قدر دان تھا اسلئے بابا داؤد خاکیؒ کی بھی اس نے کافی قدر کی عیش و عشرت کی زندگی اور حکومت میں جلیل القدر عہدوں پر فائز ہونے کی وجہ سے حضرت خاکی ملّا دولت کہلانے لگے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ بابا داؤد خاکیؒ کشتی میں سوار ہو کر شاہی جاہ و جلال اور پر شکوہ تمکنت کے ساتھ اپنے گھر کلاشپورہ کے متصل نالہ مار سے جا رہے تھے۔ جب وہ مخدوم منڈو[2] کے قریب پہنچے تو سلطان العارفین حضرت مخدوم حمزہؒ نے شور و غل سنا تو اپنے خادموں سے دریافت فرمایا کہ معاملہ کیا ہے؟ خادموں نے عرض کیا ملّا دولت کشتی میں سوار ہو کر دربار جا رہے ہیں۔ اس پر سلطان العارفینؒ

---

[1] "دو ماہی شیرازہ" مطبوعہ کلچرل اکادمی (مضمون بابا داؤد خاکیؒ ایک تعارف۔ از طیب صدیقی) مارچ ۱۹۷۸ء ص ۲)

[2] مخدوم منڈ۔ موجودہ کلاشپورہ کا محلہ ہے اسکا نام شیخ حمزہ مخدومؒ کے نام پر پڑا ہے۔ منڈو کشمیری میں "دیوان خانہ" بیٹھک یا نشست گاہ کو کہتے ہیں۔ لہذا "مخدوم منڈو" کے معنی حضرت مخدومؒ کی نشست گاہ ہے یہاں حضرت حمزہ مخدومؒ

نے اظہار افسوس کیا اور اپنے ایک خاص خادم کو ارشاد فرمایا کہ ملّا دولت کے پاس جاکر میری طرف سے سلام ودعا پہونچا کر کہدینا کہ ایک سائل کو دینی ومذہبی امور کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ التجا ہے کہ خانقاہ تک تشریف لائیں۔ کششِ غیبی سے ملّا دولت حضرت سلطان العارفین کی خدمت میں حاضر ہوا حضرت سلطان نے علیک سلیک کے بعد پوچھا۔

خداوند کریم نے انسان کو اتنا خوبصورت بناکر فضیلتوں کا مجموعہ بنایا اس بازیگر کو اپنا اتنا خیال ہے تو رات دن میں یہ کتنے سانس لیتا ہے؟ ملّا دولت نے عرض کیا رات دن انسان اتنے سانس لیتا ہے جتنی کہ پیغمبروںؑ کی تعداد ہے۔ حضرت سلطانؒ نے مکرّر استفسار فرمایا کہ اس شخص کا کیا حکم ہے جو ایک سانس غفلت شعاری اور یاد حق سے بے توجہی میں گذارے۔ ملّا دولت نے عرض کیا گویا اس نے ایک نبیؑ کو قتل کیا۔ حضرت سلطان نے فرمایا جو آپکو یہ علم ہے تو اس قدر غفلت شعاری اور دنیا طلبی اور جاہ جلال کیا معنی رکھتا ہے۔ ملّا دولت اس تنبیہہ سے حد درجہ متاثر ہوئے اور دربار داری اور جاہ وثروت کا خیال ان کے دل سے نکل گیا۔ گھر واپس چلے گئے دوسرے دن علی الصباح فقیرانہ لباس میں حضرت سلطان العارفین کی خدمت میں حاضر ہوگئے اور پھر بارگاہ سلطانی کی خدمت گذاری سے افتخار حاصل کیا۔ اس طرح سے بابا داؤد خاکیؒ نے دنیاداری جاہ وحشمت اور عزت واحترام اور عیش وآرام کو خیرباد کہکر حد درجہ سادگی اپنائی اور پاؤں میں گھاس کی بنی ہوئی جوتی پہننا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھا۔ اور اسقدر انکساری اختیار کی ازراہ انکساری ملّا دولت سے خاکی بن گئے اور یہی خاکی تخلص بھی اختیار کیا۔

جب حضرت بابا داؤد خاکیؒ سلطان العارفین کے دربار سے وابستہ ہوگئے تو انہوں نے انکی تربیت کیطرف توجہ دی۔ چنانچہ انہیں کچھ ایسے کام سونپ دئے گئے جو بظاہر ان کی شایان شان نہ تھے مگر ان کاموں سے حضرت خاکی کی تربیت مقصود تھی۔ اس ضمن میں چند واقعات تحریر کرنے پر ہی اکتفا

کیا جاتا ہے۔

حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے جب سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدومؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تو انہوں نے بابا داؤد خاکیؒ کو کلوخ تیار کرنے پر مامور کر دیا۔ جسے وہ احسن طریقے سے انجام دیتے رہے۔ مگر ایک مرتبہ ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ دنیاوی شان و شوکت ترک کر کے کیسی فقیری اختیار کر لی۔ اس خیال کا دل میں پیدا ہونا تھا کہ حضرت سلطان نے کلوخ لانے کو کہا۔ بابا داؤد خاکی جس مٹی کے ڈھیلے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں وہ سونا ہے حتیٰ کہ انہیں ہر سو سونا ہی سونا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس طرح سے انہیں کافی دیر ہو گئی۔ سلطان العارفین نے کلوخ لانے کیلئے پھر پکارا اس پر بابا داؤد خاکی نے عرض کیا حضرت یہاں مٹی نہیں بلکہ صرف سونا ہے سلطان العارفینؒ نے کہا اسی کا ایک ڈھیلا لاؤ بابا داؤد خاکی نے کہا کہ سونے کا کلوخ جائز نہیں۔ اس پر حضرت سلطان نے کہا کہ جو سونا کلوخ کا کام کبھی نہ دے اسی کا خیال تمہارے دل میں پیدا ہوا۔ اس واقعہ سے وہ سخت نادم ہوئے اور پھر کبھی ایسے خیال نے دل میں سر نہ اٹھایا۔

ایک مرتبہ حضرت سلطان العارفین کی سواری کہیں جا رہی تھی حضرت خاکی کو کمر باندھ کر جودڑ[لہ] کے آگے آگے چلنے کا حکم تھا جب سواری حضرت خاکی کے محلہ سے گذر رہی تھی تو حضرت خاکیؒ نے اپنے واقف کاروں سے مارے شرم کے دامن کمر سے نیچے کر دیا۔ حضرت سلطان العارفین اس حرکت کو بھانپ گئے۔" دوسرے دن حضرت شیخؒ نے شہر میں سوار ہو کر چکر لگانے کا ارادہ کیا بابا داؤد خاکیؒ کو حکم ہوا کہ وہ گائے کا چمڑہ پہن کر چمڑے کی ٹوپی سر پر رکھ کر گھاس کی جوتی پاؤں میں لگا کر ساتھ چلنے کو تیار ہو جائے۔ حضرت سوار ہوئے خاکی آگے آگے دوڑتے تھے۔ شہر کے لوگوں نے بابا داؤد خاکیؒ کی یہ حالت دیکھ کر اندازہ لگایا کہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ بہت افسوس کرنے لگے۔ جب گھر پہنچے حضرت نے فرمایا یہ محنت کل کی حرکت کی سزا ہے۔ دو برس اسی

[لہ] حضرت سلطان العارفین کی سواری کے گھوڑے کا نام

طرز پر گذرے ننگ و ناموس اور غرور خاک میں مل کر خاک ہوئے اور بابا داؤد "خاکی" ہوئے[1]

اسی دوران بابا داؤد خاکی نے جب حضرت سلطان العارفین کے دست حق پرست پر بیعت کی تو انھوں نے بابا داؤد خاکی کو چند تبرکات بھی عطا فرمائے جن میں چمڑے کی ٹوپی، اونی خرقہ، کلاہ، عصا، عبا اور مصلی قابلِ ذکر ہیں۔ ان تبرکات کا ذکر حضرت خاکیؒ قصیدہ وِرد المریدین میں فخریہ انداز میں کرتے ہیں۔

جب حضرت خاکی کے دل سے دنیا کی شان و شوکت کا خیال جاتا رہا تو مزید تربیت اور تزکیۂ نفس کی خاطر حضرتِ سلطان نے انہیں چلہ کشی کیلئے شنگہ پال جانے کا حکم دیا ساتھ ہی انہیں اس خلوت نشینی میں کسی سے بات بھی نہیں کرنا تھی اور جو کی روٹی اور جنگلی سبزیاں کھانا تھیں اس دوران حضرت بابا داؤد خاکی کو اگرچہ بھوت پریت نے ستایا بھی مگر حضرت سلطان کی توجہ سے سب پریشانیاں دور ہو گئیں۔ کہتے ہیں اس دوران شنگہ پال کی مسجد کے دروازے پر رات کو ایک اشہر پہرہ دیا کرتا تھا[2]۔

چلہ کشی[3] کے آخری ایام میں حضرت خاکیؒ کو ایک مسئلہ کی تحقیق کے سلسلے میں تفسیر مدارک کی ضرورت پیش آئی چونکہ کسی سے بات نہ کرنے کا حکم تھا اسلئے خادم کے ہاتھ ایک پرچہ لکھکر شہر روانہ کیا۔ جب حضرت سلطان کو معلوم ہوا تو حضرت خاکی کو پیغام بھجوایا کہ "تم تو ملا ہو تمہارے ہاتھ سے درویشی نہیں آئے گی اور علاؤالدین پورہ میں بچوں کو سبق پڑھاؤ" جب بابا داؤد خاکیؒ کو یہ پیغام ملا تو بہت نادم ہوئے چنانچہ معافی کی خاطر حضرت سلطانؒ کے پاس آئے انھوں نے بابا داؤد خاکی کی سخت سرزنش کی پھر ایک دن شیوراتری کے تہوار پر حضرت سلطانؒ نے بابا داؤد خاکیؒ کو

---

[1] تذکرۂ اولیائے کشمیر از حسن (اردو ترجمہ) ص ۱۷۵

[2] تذکرۂ اولیائے کشمیر از حسن (اردو ترجمہ) ص ۱۷۶

[3] چلہ کشی کا یہ عرصہ ساڑھے چار سال کا تھا۔

[4] تذکرہ اولیاء کشمیر از حسن (اردو ترجمہ) ص ۱۷۶

کو تہوار کا اہتمام کرنے کا حکم دیا چنانچہ انہوں نے ہندو رسوم کے مطابق وہ تمام چیزیں لائیں جو اس روز پکائی جاتی ہیں۔ اور حضرت سلطانؒ کی خدمت میں پیش کیں تو حضرت سلطان مسکرائے اور فرمایا کہ غیر شرعی کام کیلئے یہ چیزیں کیوں خریدیں؟ حضرت خاکی نے جواب دیا کہ مرشد کے حکم کی تعمیل لازمی ہے۔ اس پر حضرت سلطان نے کہا کہ یہ کام اگر میرے حکم کی تعمیل میں انجام دیا تو خلوت نشینی کے دوران کسی بات نہ کرنیکا حکم بھی تو میرا ہی تھا۔ لہذا شنگہ پال میں دوبارہ خلوت نشین ہو جاؤ[لہ] اور اس پر حضرت بابا داؤد خاکی نے پھر چلہ کشی اختیار کی اور مرشد کے حکم کے مطابق اس ساری مدت میں انتہائی استغراق میں عبادت کی چلہ نشینی کی مدت کے بعد حضرت سلطان نے انہیں ملتان اور اوچہ مقامات کی زیارت کیلئے روانہ کیا اسطرح سے انہوں نے حضرت مخدوم بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ اور مخدوم سید جلال الدین بخاریؒ کی زیارتوں کے علاوہ دیگر بزرگوں کے مزارات کی زیارت بھی کی اور ان مقامات پر قیام کے دوران کئی بزرگوں کی صحبتوں سے فیض بھی پایا۔

خلافت حضرت بابا داؤد خاکیؒ ملتان اوچہ اور ہندوستان وغیرہ کے متبرک مقامات کی زیارت کرنے اور وہاں کے اولیائے عظام سے فیض پانے کے بعد جب واپس کشمیر لوٹے تو حضرت سلطان العارفینؒ نے انہیں سنہ ۹۷۰ھ میں خلافت عطا کی۔ خلافت کا یہ سلسلہ اپنے مرشد کی حیات میں ۱۴ برس اور انکے وصال کے بعد دس برس تک جاری رہا اس طرح سے انکی خلافت کا عرصہ ۲۴ سال کا ہے۔

رشد وہدایت اور سلسلۂ خلفاء بابا داؤد خاکیؒ نے اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کی خاطر کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ انہوں نے اپنی علمی استعداد کے مطابق اسلامی تعلیمات سے متعلق کئی کتابیں تصنیف کی ہیں اس کے علاوہ روحانی مراتب کے اعتبار سے بھی وہ اپنے

[لہ] اسرار الابرار ۱۰۱۔ بابا داؤد مشکواتیؒ

وقت کے مانے ہوئے بزرگ تھے۔ انہوں نے ایک جیدِ عالم روحانی پیشوا کی حیثیت سے اشاعت اسلام کی خاطر اپنے خلفاء کی ایک کثیر تعداد علوم ظاہری و باطنی دونوں سے آراستہ کی۔ انہیں میں سے اکثر علماء، فضلاء، مشائخ کرام اور اولیائے عظام ہوئے۔ یہ قطبیت کے علمبردار آسمانِ رشد و ہدایت پر آفتاب تاباں کی حیثیت رکھتے ہیں انکی تعداد اور اشاعت اسلام کی خاطر انکی مساعی جمیلہ کا بیان طوالت کا باعث ہوگا چنانچہ ان کے مقتدر چند خلفاء کے اسمائے گرامی درج کرنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

حضرت میر نازک قادریؒ[1]، ابو الفقرا ر بابا نصیب الدین غازی، خواجہ مسعود پانپوری، حاجی داد بلخی، شیخ غازی الدین، امیر یعقوب، شیخ حسن ریںہ، بابا دولت ریشی، شیخ واقف تھستانی میاں خداداد، مولانا علاؤالدین، خواجہ عنایت اللہ کشمیری، مولانا ابو طالب سیالکوٹی، شیخ شاہ آملی حاجی اثر بابا، صوفی خادم، اخوند ملّا محمد ظفر، خواجہ شاہ بزرگ نجاری، شیخ محمد پارشاہ، شیخ یوسف گنائی، شیخ محمود، شیخ یعقوب، خواجہ بایزید، خواجہ داؤد گنائی، خواجہ محمد امین، خواجہ عطار، خواجہ مسعود، نوروز ریشی، شیخ حیدر، ملّا جواہر ناتھ، میاں بابا ذاکر، بابا عبدالرحمان، حافظ عبداللہ قاری، بابا حاجی بہرام، خواجہ زاہد لاری، بابا اسمٰعیل، بابا پیر یوسف، مولانا محمد کامراجی، بابا حسن، شیخ محمد کھویہامی، شیخ محمد چوٹی مولہ، بابا یوسف اڑونی، شیخ ذنر عمادی، شیخ ولایتی، خواجہ ارزن زینہ بابا سیاہ پوش، شیخ حسن کھویہامی، شیخ محمد صادق، شیخ محمد پکھلی، خواجہ الحداد، خواجہ ابراہیم، خواجہ احمد متقی، شیخ حسن مجذوب، بابا محمد صالح، اور ملک شمس کپواری رحمۃ اللہ علیہم اجمعین وغیرہ وغیرہ۔

کرامات:۔ حضرت بابا داؤد خاکیؒ جہاں علوم ظاہری سے مالا مال تھے وہاں علوم باطنی اور

---

[1] حضرت میر نازک قادریؒ پہلے بابا داؤد خاکیؒ کے مرید تھے مگر بعد میں محمد اسماعیل شامی نے انہیں ان سے مانگ کر اپنا مرید بنا لیا اور سلسلہ قادریہ کو کشمیر میں سب سے پہلے انہوں نے ہی عروج کیا۔ انکی زیارت کادی کدل میں واقع ہے کشمیر میں نازکی خاندان ان ہی کے اولاد و احفاد ہیں۔

روحانی سے بھی آراستہ و پیراستہ تھے۔ آپ نے اپنے مرشد کی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر روحانیت میں کافی بلند مقام حاصل کیا۔ اس مادی دنیا میں ممکن نہیں کہ کوئی ان باتوں پر یقین کرے مگر اس سے انکار کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی مشاہدہ میں آیا ہے کہ بڑے مادہ پرستوں نے بھی اپنی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے یہ درحقیقت سائنسی علوم کی دسترس سے باہر ہے مگر اس کے باوجود وہ بھی اس بات کے حامی ہیں کہ کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے۔

بہر کیف حضرت بابا داؤد خاکی ابھی اپنے مرشد کے فرمان کے مطابق زیر تربیت تھے۔ کہ ایک رات نماز تہجد کے غسل کی خاطر دریا پر جا رہے تھے کہ ایک نورانی بزرگ سے ملاقات ہوئی "دیکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام ہیں سلام کے بعد آپس میں پیار و محبت کی باتیں ہوئیں حضرت بابا نے سوالات پوچھے تسلی بخش جوابات حاصل کئے چشموں کی کیفیت دریافت کی۔ اور حضرت خضرؑ نے انکی حقیقت بیان کی اور فرمایا آج سے جہاں جاؤ گے چشموں کے مؤکل تمہارے استقبال کو آئیں گے اور مرید بنیں گے۔ جہاں کہیں خطرناک چشمہ ہوگا میں تمہاری مدد کرونگا۔"[1]

اس کے بعد ایک دن کا واقعہ ہے کہ حضرت بابا داؤد خاکی حضرت سلطان العارفینؒ کے اس کمرے کے باہر تھے جس میں حضرت سلطانؒ تنہائی میں عبادت کرتے تھے۔ اتنے میں حضرت خاکی نے اندر سے کافی لوگوں کی گفتگو سنی تو حیران ہو گئے کہ یہ لوگ اندر کہاں سے گئے جبکہ وہ خود دروازے پر تھے اور اندر جانے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ اس بات کے یقین کے لئے کہ آیا اندر کون ہے حضرت خاکیؒ نے دروازے کا ایک پٹ کھول کر جھانکا تو کیا دیکھتے ہیں کہ اندر حضرت سلطان العارفینؒ کے ارد گرد عجیب لوگوں کی ایک جماعت گفتگو میں مصروف ہے۔ اس پر اگرچہ حضرت خاکی کو سلطان العارفین نے تنبیہ کی مگر ساتھ ہی اندر آنے کو بھی کہا اور یہ خوشخبری بھی سنائی کہ یہ چشموں کے مؤکل ہیں یہ کبھی کبھار مجھ سے تربیت

---

[1] تذکرہ اولیائے کشمیر (از حسن اردو ترجمہ) ص ۱۲۶

حاصل کرنے آتے ہیں۔ آج کے بعد انکی تربیت تمہارے سپرد کی جاتی ہے۔

اس کے بعد بابا داؤد خاکیؒ اندرہامہ میں کچھ مدت کیلئے خلوت نشین ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ انکو غیبی کائنات کا کشف حاصل ہو گیا۔[1] اپنے مریدوں کے ساتھ وہ چشمہ کوثر ناگ (دیوہ سر) چشمہ ویسک ناگ چشمہ کاجی ناگ[2] شالیوت ناگ اور اسی طرح دوسرے چشموں پر گئے اور وہاں کے موکلوں نے حضرت خاکی سے جہاں تربیت پائی وہاں انکے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔ اس سلسلے میں حضرت خضر علیہ السلام، سلطان العارفینؒ اور بابا ہردے ریشیؒ کا تعاون بھی شامل حال رہا

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سوپور کا ایک مرید حضرت خاکی کے پاس آیا اور فریاد کی کہ وہ نہایت قلاش ہو گیا ہے۔ اس پر انہوں نے اسے اپنے ساتھ لیا اور نجاست کے ایک ڈھیر پر اپنا عصا مارا اور وہ سارا ڈھیر سونے میں تبدیل ہو گیا۔ پھر علاؤالدین نامی اس شخص سے کہا کہ جتنا سونا چاہیے لے جاؤ۔ اس نے حتی المقدور سونا لیا اور ساری عمر فارغ البالی سے گذاری۔

ایک مرتبہ کامراج (موجودہ اسلام آباد کا ضلع) کے گاؤں میں کسی مرید کے گھر میں تھے شام کو اسے کہا کہ اپنے تمام مویشیوں کو صحن میں لا کر باندھ دو۔ مرید نے حسب الارشاد ایسا ہی کیا رات کو گاؤں پر شیروں نے حملہ کیا اور بہت سے لوگوں کے مویشیوں کو ہلاک کر دیا اور اس مرید کے مویشی سلامت رہے۔

ایک مرتبہ حضرت سلطان العارفینؒ کے پاس کچھ بیمار آئے اور شفایابی کیلئے دعا چاہی

---

[1] تذکرہ اولیائے کشمیر از حسن (اردو ترجمہ) : ص ۱۷۷

[2] حسین علی اپنی کتاب تذکرۃ الابرار میں لکھتا ہے کہ کاجی ناگ کے موکلوں نے حضرت بابا داؤد خاکیؒ کو ایک چھوٹا سا پیالہ اور ایک سربستہ مٹی کی ہنڈیا نذر کے طور پر پیش کی۔ ان میں روپے تھے جن کے ایک طرف عورت کی تصویر تھی اور دوسری طرف "راجہ ہرشہ دیو" لکھا تھا۔ وہ روپے حسین علی کے بقول اس کے پاس کافی عرصہ تک موجود تھے۔ بحوالہ تذکرہ اولیائے کشمیر از: حسن ص ۱۷۸

انہوں نے ان بیماروں کو بابا داؤد خاکی کے پاس بھیجدیا بابا داؤد خاکیؒ نے مرشد کے ارشاد کیمطابق بیماروں کی شفایابی کے لئے دعا کی اور وہ سب کے سب چنگے بھلے گھروں کو لوٹے۔

اس طرح کے بے شمار واقعات اور ان سے متعلق کرامات ہیں جو بابا داؤد خاکی کی روحانی اور علمی بصیرت کا نتیجہ ہیں۔

وصال حضرت بابا داؤد خاکیؒ کے بارے میں حسنؔ لکھتا ہے کہ یعقوب شاہ چک کے خلاف جو وفد دہلی گیا اس میں بابا داؤد خاکیؒ بھی شامل تھے[1] اکبر بادشاہ کو کشمیر پر فوج کشی کرنیکی ترغیب دی اور ایک عہد نامہ پر دستخط کئے جب اکبر بادشاہ کی فوج کشمیر کی تسخیر کیلئے روانہ ہوئی۔ حضرت بابا مرشدوں اور پیروں کی ملاقات کیلئے ملتان تشریف لے گئے وہاں کی زیارتوں اور متبرک مقاموں کو دیکھنے کے بعد کشمیر واپس لوٹے راستے میں طبیعت ناساز ہو گئی اور کشمیر پہنچتے ہی ۳ ماہ صفر سنہ ۹۹۴ھ کو اس دنیا سے کوچ کیا۔ تاریخ "خیر مقدم" ہے اور "روی جنت

"بزید شیخ اعظم"

پروفیسر محمد طیب صدیقی اپنی کتاب ذکرالعارفین[2] کے علاوہ اپنے ایک مقالہ[3] میں اسی قسم

---

[1] تذکرہ اولیائے کشمیر از حسن (اردو ترجمہ) ص ۱۷۸-۱۷۹

[2] 'ذکرالعارفین' میں پروفیسر محمد طیب صدیقی صفحہ ۹۶ پر لکھتے ہیں کہ "یہ وفد حضرت سلطان شیخ حمزہ مخدومؒ نے خود تیار کیا تھا۔" یہ لکھنا نہ صرف غلط بیانی ہے بلکہ یہ بات تاریخ سے ناواقفیت کی غماز ہے۔ حضرت سلطان العارفینؒ بلاشبہ شیعوں کے طرز عمل کے زبردست مخالف تھے مگر انہوں نے اس قسم کا کوئی وفد تیار کیا ہو تاریخ سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ان کا وصال ۲۴ ماہ صفر سنہ ۹۸۴ھ میں ہوا اور وفد سنہ ۹۹۲ھ کے وسط میں دہلی گیا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس وفد کو خود تیار کرتے۔

[3] 'شیرازہ اردو' مطبوعہ کلچرل اکاڈمی مارچ سنہ ۱۹۶۵ء مقالہ (بابا داؤد خاکیؒ ایک تعارف) ص ۷۷

کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں غالباً انہوں نے تاریخ حسن سے ہی استفادہ کیا ہے۔ لیکن ایک اور کتابچہ شیخ بابا داؤد خاکیؒ میں پروفیسر موصوف لکھتے ہیں کہ بابا داؤد خاکیؒ اسوقت سفر ملتان پر تھے جب مغلوں نے کشمیر کو اپنی سلطنت کا ایک صوبہ بنایا اور جب انہوں نے یہ خبر سنی تو انتہائی مسرور ہوئے سفر سے واپسی پر اسلام آباد میں قیام فرمایا اور وہیں ۳ صفر سنہ ۹۹۴ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا مگر انہوں نے شیرازہ مطبوعہ کلچرل اکادمی مارچ سنہ ۱۹۶۸ء صفحہ ۷۷ پر ۳ صفر کے بجائے ۱۴ صفر سنہ ۹۹۴ھ لکھا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے صفر سنہ ۹۹۴ھ میں وفات پائی ہے اگرچہ پروفیسر محمد طیب صدیقی نے دو جگہوں پر دو تاریخیں لکھی ہیں مگر ہر دو جگہ صفر سنہ ۹۹۴ھ لکھا ہے۔ رہا سوال وفد کے ساتھ دہلی جانا اور کشمیر کا مغلیہ سلطنت میں شامل ہونے پر حضرت بابا داؤد خاکی کا خوش ہونا یا اسکے بعد وفات پانا یہ ایک بہت بڑی غلط بیانی ہے۔ جسکا ذکر اس مقالے میں آگے آئے گا۔ البتہ یہ بات مسلّمہ ہے کہ بابا داؤد خاکیؒ جب ملتان کے سفر کے بعد کشمیر لوٹتے ہوئے اسلام آباد پہنچے تو طبیعت انتہائی ناساز ہوئی اور وہاں پر ہی ۱۴ صفر سنہ ۹۹۴ھ کو معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ وصال سے قبل اپنے احباب و خلفاء کو اپنے پاس بلاکر یہ وصیت کی کہ انہیں ان کے مرشد حضرت سلطان العارفینؒ کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ لیکن اسلام آباد کے معتقدوں نے ان کی نعش کو سرینگر لے جانے نہیں دیا اور مجبوراً ان کو بابا ہردی ریشی کے مزار میں دفن کیا گیا۔ پھر کچھ عرصہ گذرنے کے بعد یوسف خان رضوی ناظم کشمیر کے عہد میں بابا داؤد خاکیؒ کے خلفاء نے انکی مدد سے حضرت خاکی کی نعش کو اسلام آباد سے لاکر حضرت سلطان العارفینؒ کے پہلو میں سپرد خاک کیا۔

حضرت سلطان العارفین کی یہ زیارت جہاں بابا داؤد خاکیؒ ابدی استراحت فرما رہے ہیں

کوہ ماراں کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ روضہ کے ارد گرد کی عمارت نواب عنایت اللہ خان نے ۱۱۲۵ھ میں تعمیر کی۔ سکھوں کے دور حکومت میں شیخ غلام محی الدین ناظم کشمیر نے اس تعمیر کی تجدید کی۔ اس کے بعد کئی اہل خیر حضرات نے وقتاً فوقتاً اس زیارت گاہ کی تعمیر و مرمت کی اور اسے سنوارا سجایا اور آجکل مرزا کمال الدین شیدا کی سرپرستی میں اسکے انتظامات کی خاطر ایک کمیٹی مصروف عمل ہے جس کی بدولت نئی تعمیرات بھی وجود میں آرہی ہیں۔ یہ زیارت قدرتی مناظر اور محل وقوع کے اعتبار سے ایسی جگہ پر ہے جسکے بارے میں یہ شعر ہر حال میں صادق آتا ہے۔

ہر سحر خورشید می سائد جبین
بر در محبوب رب العالمین

ایک غلط فہمی کا ازالہ حضرت بابا داؤد خاکیؒ کے بارے میں کئی مؤرخوں اور تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ یعقوب شاہ چک کے خلاف کشمیر کا جو وفد شیخ یعقوب صرفیؒ کی سرکردگی میں اکبر بادشاہ کے پاس دہلی روانہ ہوا اس میں حضرت خاکیؒ بھی شامل تھے۔ یہ درحقیقت غلط بیانی ہے اور مؤرخین نے سہل انگاری سے کام لیا ہے ورنہ بابا داؤد خاکیؒ اگرچہ سیاسی شعور رکھتے تھے۔ اور جن حالات کے پیش نظر یہاں کا وفد دہلی روانہ ہوا گمان غالب ہے کہ حضرت خاکی بھی اگر زندہ ہوتے تو ضرور دہلی جاتے مگر حالات نے اسوقت اتنی شدت اختیار نہ کی تھی کیونکہ قاضی موسیٰ کی شہادت کا واقعہ بابا داؤد خاکیؒ کی وفات کے بعد کا ہے۔ اور حضرت بابا داؤد خاکی نے یعقوب شاہ چک کی حکومت کے ایام دیکھے ہی نہیں ہیں۔ حالات اور واقعات تاریخ کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے ہیں اصل واقعات یوں ہیں کہ جب حضرت بابا داؤد خاکی ملتان سے واپس لوٹے اور اسلام آباد میں انتقال کیا تو یہ ۳ یا ۴ صفر سنہ ۹۹۴ھ تھا[1]۔ جبکہ ابھی یعقوب شاہ چک برسر اقتدار نہیں

---

[1] مؤرخ حسن ۳ صفر سنہ ۹۹۴ھ لکھتے ہیں ملاحظہ ہو تاریخ حسن اردو ترجمہ ص ۱۷۹ اور محمد طیب صدیقی لکھتے ہیں کہ

آیا تھا اور جب اس کے دور میں قاضی موسیٰؒ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اور پھر کشمیر کے عمائدین کا جو وفد دہلی روانہ ہوا ان کا اکبر بادشاہ کے ساتھ معاہدہ ہونے کے بعد اکبر بادشاہ ۲۸ جون ۱۵۸۶ء کو اپنی فوجیں کشمیر کی طرف روانہ کرتا ہے جو ماہ اکتوبر ۱۵۸۶ء میں فاتح کی حیثیت سے سرینگر میں داخل ہوئیں۔ بابا داؤد خاکی کے سلسلے میں اس تاریخی تسامح کا مؤرخ حسن سب سے زیادہ شکار ہوا ہے اور پھر بعد کے مورخین نے بھی اسی سے اقتباسات نقل کئے ہیں۔ تاریخ کے روزنوں سے خود جھانکنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

حضرت بابا داؤد خاکیؒ جب رحلت فرماتے ہیں تو یہ صفر ۹۹۴ھ جنوری ۱۵۸۶ء تھا جبکہ یوسف شاہ چک کو راجہ بھگوان داس فروری ۱۵۸۶ء میں اکبر بادشاہ کے پاس باعزت سمجھوتہ کرنے کی خاطر لے جاتا ہے گویا جب حضرت خاکیؒ نے وفات پائی ہے تب کشمیر کا حکمران یوسف شاہ چک تھا۔ یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ بابا داؤد خاکیؒ علی شاہ چک اور یوسف شاہ چک کا ذکر قصیدہ لامیہ میں کن الفاظ میں کرتا ہے۔

والیٔ دوراں علی شاہ دوستدار صالحاں
پور او شہزادہ یوسف باجاہ و جلال
ہر دو ایشاں صحبت ایں پیرؒ را دریافتند
ہر دو کردندے دعاء خیر خود از وی سوال
او دعا گفتے و ایشاں را مبارک آمدے
ہم دریں اشفاق ایشاں کرد ازینجا ارتحال
یا رب ایشاں را ز فضل خویشتن انعام کن
صحبت ایمان و تن توفیق علم اصلاح بال
لشکر شاں باد با فتح و ظفر چوں سید ہند

الغرض یوسف شاہ چک کے اوصاف کا ذکر قصیدہ غسلیہ میں کیس عطاہا ان الفاظ میں موجود ہے

حاصلش گشتہ بہ فضل حق بہ تقسیم ازل
سیرت و صورت مزین با نکوئی و جمال
طالب علم و شریعت ہست و خواندہ کتب
از مسائل عالمان را می کند اکثر سوال
بر لغت ہا واقف است و در ہنرہا ذوفنون
حسن خطے نیز دارد این شہ فرخندہ فال
اہل حرفت و سخندان با شناسائی شعر
طبع موزون نیز دارد این شہ نیکو خصال
ورزش نیکو پد از پد گفتن موزون نمود
با زبان ہند میگوید ثنائے ذوالجلال
علم موسیقی رسانیدہ بحد انتہار
ہر مقامے نیک داند چون حسینی و غزال
ہست شاہے نرم و خوش شیرین زبان و بردبار
باز در فہم و فطانت بے نظیر و لامثال

(گذشتہ صفحے کا حاشیہ)

۱؎ قاضی موسیٰ قاضی میر علیؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ قاضی میر علی بڈشاہ کے زمانے میں بخارا سے کشمیر تشریف لائے اور اپنی علمی فضیلت خداداد قابلیت کی بدولت بڈشاہ نے انہیں قاضی کا عہدہ دیا۔ قاضی موسیٰ کو یعقوب شاہ چک نے حکم دیا کہ وہ اذان میں علی ولی اللہ پڑھنے کا فتویٰ صادر کریں مگر قاضی موسیٰ نے اسے شریعت کے خلاف سمجھتے ہوئے فتویٰ صادر کرنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا انہیں شہید کیا گیا۔

اس طرح سے بابا داؤد خاکیؒ جہاں یوسف شاہ چک کی نیک سیرت، صورت طالب العلم و شرعیت اہل لغت، صاحب ہنر و فن خوش نویس اور شاعر ہونے کے اوصاف گنتے ہیں وہاں اسکی فہم و فراست، بردباری اور شیرین زبانی کے علاوہ کشمیری علم موسیقی کو عروج تک پہنچانے والا بھی اسے ہی گردانتے ہیں اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ یوسف شاہ چک کے اوصاف کے کتنے معترف تھے اب اگر یہ فرض کرلیا جائے (جو کہ صرف مفروضہ ہوسکتا ہے حقیقت نہیں) کہ وہ بادشاہ وقت کے خلاف وفد کے ساتھ دہلی گئے تو پھر ۳ صفر ۹۹۴ھ کو انکی وفات کیسے ممکن ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بابا داؤد خاکی یعقوب شاہ چک کے برسر اقتدار آنے سے قبل ہی انتقال کرچکے تھے۔ لہذا یہ کہنا کہ وفد کے ساتھ دہلی گئے لغو بیانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

تصانیف

بابا داؤد خاکیؒ جہاں ایک صوفی منش، خدا دوست اور عارف باللہ تھے وہاں علم و ادب کے ایک بحرِ بے پایاں بھی تھے انہوں نے علم و عمل، فضل و کمال اور حقیقت و معرفت کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن ہوکر وہ گوہرِ بے بہا سمیٹ لئے جو بہت کم لوگوں کے نصیب میں آتے ہیں۔ انہوں نے دنیاوی جاہ و جلال ترک کرکے فقر کی زندگی اختیار کی اور علوم و فنون ذاتی تجربات اور روحانی اقدار کو عام کرنے کی خاطر قلم کا سہارا لیا۔ انکا خمیر کشمیر ایسی شعر و ادب کی سرزمین سے اٹھا تھا اور اپنے خاندان سے نسل در نسل منتقل ہونے والے علمی و ادبی ذوق کو وراثت میں پایا تھا۔ چنانچہ نظم و نثر دونوں میں اپنے اشہبِ قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبویؐ، شریعت اور تصوف کے دقیق اسرار و رموز کو شعری پیکر میں ڈھال کر عوام تک پہنچایا۔ اور جہاں ان میں کہیں پیچیدگی پیدا ہوئی وہاں ان کی تشریح و تفسیر لکھ ڈالی۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے عبدالقادر سروری رقمطراز ہیں۔

"بابا داؤد خاکیؒ جتنے بڑے عالم تھے۔ اُتنے ہی بلند پایہ شاعر بھی تھے لیکن انکی شاعرانہ صلاحیتیں علم، مذہب اور متصوفانہ خیالات کے لئے وقف ہوگئی تھیں۔ انہوں نے خاکی تخلص اظہار انکسار کیلئے اختیار کیا تھا۔ انکے قصائد معرکۃ الآرا ہیں۔ یہ قصیدے لامیہ، جلالیہ، غسلیہ، کے

عنوانوں سے موسوم ہیں ...... بابا داؤد خاکیؒ کے قصائد عالمانہ ہیں، قصاید کے علاوہ انہوں نے غزل بھی کہی ہے لیکن انکی غزل تصوف اور عرفان کے ادق رموز و نکات سے پر ہے خاکیؔ کی غزل کے دو اشعار ہیں :۔

گہ بہ مسجد م روم گاہ بہ بتخانہ شوم — معنی بے چارہ ترا می طلبم از ہر سو
نتوانم کہ شمارم کرم و نعمت تو — گر زبانم شود اندر تن من از ہر سو[1]

بابا داؤد خاکیؔ نے حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم کشمیریؒ مخدوم جہانیان حضرت سید جلال الدین بخاریؒ اور بابا ہردی ریشیؒ کے ذاتی حالات و کوائف، روحانی مراتب اور مقامات سلوک کا ان قصاید میں ذکر کیا ہے۔ "جو آپ کے تبحر علم، بلندی فکر قران و حدیث کی رموز شناسی اور خداترسی و عشق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ دیتی اور غمازی کرتی ہے"[2]۔ جہاں ان بزرگوں کے بارے میں گنجینہ معلومات ہیں وہاں فنی نقطۂ نگاہ سے بھی اعلیٰ اقدار کے حامل ہیں۔ ان قصاید اور انکی دوسری تصانیف کا مذہبی، روحانی، فنی اور ادبی، زاویوں سے تجزیہ ایک کتابی صورت اختیار کرے گا جن کا متحمل یہ مقالہ نہیں ہے لہذا ان کی چند اہم تصانیف کا مختصر سا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱ :- **وِردُالمُریدین** یہ قصیدہ بابا داؤد خاکیؔ نے سلطان العارفین محبوب العالم شیخ حمزہ مخدوم قدس سرہٗ کی مدح میں فارسی زبان میں لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے حضرت شیخ ممدوح کے نجی حالات، مراتب، حال و قال، تصوف، مدارج تصوف، سلوک، مقامات سلوک اور انکے قواعد و ضوابط کی نہایت دلکش و دل نشین انداز میں پوری وضاحت کی ہے۔ یہ بالفاظ دیگر حضرت محبوب العالمؒ کی منظوم سوانح ہے۔

---

[1] کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ از۔ عبدالقادر سروری ص ۸۲-۸۳

اس قصیدے کا پہلا شعر یہ ہے۔ ؎

شکر اللہ حال من ہر لحظہ نیکوتر شد است
شیخ شیخاں شیخ حمزہ تا مرا رہبر شد است

اور اس شعر پر ختم ہوتا ہے۔ ؎

بعد این وردِ مبارک فاتحہ ختمی کنید
ای عزیزان بہر این ناظم کہ بس مضطر شد است

اس قصیدے کے بارے میں محمد طیب صدیقی لکھتے ہیں کہ حضرت سلطان کی خدمت میں ابتدائی چند اشعار پیش کئے تو وہ بہت محظوظ ہوئے اور تحسین و آفرین فرمائی۔

"دریں زمان در واقعہ دیدم کہ در باغی ترتیب بعضی درختان نشاندہ میکردی و نگاہ اصل ایشان را ہم میکردی و گاہے آب میدادی شاید ہمیں قصیدہ باشد بہ اتمامش آور شاید ترقی بخش مریدان و مستحکم کردن عقیدۂ ایشان خواہد بود۔"

یہ اشارہ پاتے ہی مولانا نے قصیدہ مذکور کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا خود فرماتے ہیں۔

در واقعہ این فقیر را جمعی از مشائخ این سلسلۂ مبارک در دائرہ خود نشاندہ دعا و آفرین کردند، مرا کاتب، قاری و سامع را دعا و آفرین فراوان کردند خصوصاً ازیں در شعر بسیار محظوظ شدند ؎

این گواہی کہ بہر مخبر رسیدای جن و انس   کین فقیر از جاں مریداں نکو مخبر شد است
شکر للہ حال من ہر لحظہ نیکوتر شد است   شیخ شیخاں شیخ حمزہ تا مرا رہبر شد است
کاتب و قاری و سامع ہم بشارت یافتند   آن کہ رحمت بر سر این ہر سہ مستمطر شد است

بابا داؤد خاکی کے اس شعر کے مطابق اس قصیدے کے چار سو چالیس سے چند ابیات زاید ہیں یعنی ساڑھے چار سو کے قریب ہیں ؎

چہار صد با چہل و چند ابیات گوہر بار او   بہر مریدوئی بمعنی سبحۂ گوہر شد است

مگر دستیاب نسخہ جات میں تین سو چونسٹھ ۳۶۴ اشعار ملتے ہیں[1]۔ معلوم نہیں بقیہ اشعار کسی ناقل نے ارادتاً نقل نہیں کئے ہیں یا کسی کینہ پرور نے اصل نسخہ سے یہ اشعار حذف کر دئے اور باقی اشعار رہنے دئے ۔

اس قصیدے کے ان اشعار

وصف شیخاں است اندر ضمن وصف شیخنا
"شیخنا" تاریخ "اور شیخاں" ہم دگر شد است
فیض ناک است از برائے سامعان و قاریان
"فیض ناک" گر کنم تاریخ او ہم مرشد است

سے "شیخنا"، "شیخان" اور "فیض ناک" سال تصنیف نکلتا ہے ۔

۹۶۱ھ   ۹۶۱ھ   ۹۶۱ھ

اس قصیدے کو ۱۹۱۰ء میں بقول محمد طیب صدیقی محمد حسین عارف نے اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے[2] اور خود محمد طیب صدیقی نے ذکر العارفین کے نام سے منظوم ترجمہ مع سوانح محبوب العالم شائع کیا ہے اس کے علاوہ ۱۸۹۵ء میں عبدالقادر درویش نے اس قصیدے پر مخمس تضمین لکھی اور شائع کی ہے۔ غلام رسول کا نگار کشتواڑی نے بھی اسکا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے ۔

چند برس پہلے سیف الدین قاری نے 'متاع نور' کے عنوان سے بابا داؤد خاکی کے اس قصیدے اور اس کی شرح کے اقتباسات پر مبنی جموں و کشمیر کلچرل اکاڈمی کی مالی معاونت سے ایک کتاب شائع کی ہے۔

---

[1] سیف الدین قاری اپنی کتاب 'متاع نور' میں انکی تعداد ۳۶۲ تحریر کرتے ہیں ملاحظہ ہو متاع نور حاشیہ ص ۱۵

[2] دو ماہی شیرازہ اردو مطبوعہ کلچرل اکاڈمی مارچ ۱۹۶۸ء ص ۸۱

(۲)
دستور السالکین یہ کتاب قصیدۂ ورد المریدین کی شرح ہے[۱]۔ کیونکہ قصیدۂ مذکور میں بابا داؤد خاکی نے جن مشکل اور پیچیدہ رموز و نکات کا ذکر کیا ہے انکی تشریح کی خاطر علامہ خاکی کو نثر میں ایک مضبوط شرح لکھنا پڑی۔ یوں تو یہ ایک شرح ہے مگر اس کتاب میں قرآن، اسکی تعلیمات کا لب لباب، روحانی ارتقا، احادیث، بزرگان دین کی زندگی ان کے تجربات، تصوف، سلوک اور دیگر اس قبیل کے مضامین پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ بقول سیف الدین قاری "حضرت علامہ خاکی نے جہاں ورد المریدین کے قصیدہ میں اپنے معانی الضمیر کو نظم کی لڑی میں پرو کر آب دار و تابناک موتیوں کی نظر افروز مالا کی صورت میں ناظرین کے سامنے پیش فرمایا ہے وہاں قرآن پاک و احادیث مبارکہ، سیر و تاریخ اور علمائے حق و بزرگان دین کی تصانیف کی روشنی میں ان اشعار کی خود ہی تشریح فرما کر سلوک و تصوف اور شریعت و طریقت کے اسرار و حکم اور نکات و غوامض کو بے نقاب کیا ہے"[۲]۔

اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے جن اسلامی کتب کا حوالہ دیا ہے ان کی تعداد دو سو سے بھی زائد ہے جو انکے گہرے علمی مطالعے کا بین ثبوت ہے۔

(۳)
رسالۂ ضروریہ اس رسالہ میں بابا داؤد خاکی نے اسلام، ارکان اسلام، خدا، اسکی توحید، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رسالت پر ایمان، اور دیگر دینی مسائل کی پیچیدگیوں کو آسان اور عام فہم فارسی نظم کی لڑی میں پرو دیا ہے۔

(۴)
مجموعتہ الفوائد بابا داؤد خاکیؒ نے جس طرح ورد المریدین کے اشعار کی تشریح دستور السالکین کے عنوان سے کی اسی طرح رسالہ ضروریہ کی تشریح بھی محبوب العالمؒ کے ارشاد کے مطابق مجموعتہ الفواید کے نام سے لکھی تا کہ عوام کو دینی مسایل سمجھنے میں آسانی ہو۔

---

[۱] اس کتاب کو میسرز غلام محمد نور محمد تاجران کتب نے ۱۲۵۶ھ میں شائع کیا تھا۔

[۲] تعارفی نوٹ از سیف الدین قاری ص ۴

(۵) قصیدۂ لامیہ جب حضرت بابا داؤد خاکیؒ دنیاوی جاہ و حشمت ترک کر کے حضرت محبوب العالمؒ کے دست حق پرست پر بیعت کرتے ہیں تو اپنے مرشد کے احکامات کے مطابق تربیت کے مختلف مراحل سے گذرتے ہیں بعد ازاں ان کے ہی حکم کے مطابق سلسلۂ ریشیان کے آخری ریشی بابا ہردی ریشیؒ لہ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو ان کی نفس کشی یا مجاہدہ نفس اور ریشی مسلک کے طور و طریقے دیکھ کر ان پر ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بابا داؤد خاکیؒ ان تمام حالات و کیفیات کا قصیدہ لامیہ میں ذکر کرتے ہیں۔ اس قصیدے میں شیخ العالم شیخ نور الدین نورانیؒ، میر میرک اندرابیؒ اور بابا ہردی ریشیؒ کے حالات درج ہیں انکے تزکیہ نفس طریقۂ عبادت، خورد و نوش کے علاوہ مدارجِ سلوک کا تذکرہ بھی ملتا ہے اس قصیدہ میں سلطان علی شاہ چک اور شہزادہ یوسف شاہ چک کی علم دوستی، جہاں بانی اور علمائے دین کے ساتھ دوستی کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ بابا داؤد خاکیؒ کے اپنے ہی ایک شعر کے مطابق اس قصیدے کا نام ریشی نامہ ہے۔

چوں دریں نسخہ صفات ریشیاں مذکور شد
پس بہ ریشی نامہ نامش خوش بود اے نیک فال

اس قصیدے کا سال تصنیف اس شعر کے مطابق

النبیؐ تحریر این نسخہ کو خوب و نادر است
ذکرِ خیر زاہدان اولیٰ بود تاریخ سال

"ذکرِ زاہدان" ۹۸۸ھ ہے۔

(۶) شرح قصیدۂ لامیہ اپنی دیگر تصانیف کی طرح بابا داؤد خاکیؒ نے قصیدۂ لامیہ کی شرح بھی لکھی اور عوام تک عام فہم و آسان زبان میں اپنے جذبات پہنچائے۔

لہ بابا ہردی ریشیؒ ریشی سلسلے کے آخری ریشی ہیں جو حضرت محبوب العالمؒ کے خلفاء میں شامل ہو کر ریشی طریقہ کو ترک کرتے ہیں۔ بابا ہردی ریشی کی زیارت اسلام آباد میں ریشی مالو صاحب کے نام سے مشہور ہے۔

(۷)
قصیدۂ غسلیہ اس قصیدہ میں حضرت خاکیؒ نے طہارت جسمانی، روحانی اور نفسانی کے اوصاف حمیدہ قرآن و احادیث کے پس منظر میں بیان کئے ہیں۔ کیونکہ جسمانی پاکیزگی اللہ کے نزدیک ایک پسندیدہ فعل ہے اور عبادت کا جزو لاینفک ہے۔ علاوہ ازیں سلطان یوسف شاہ چک کے تہذیبی اوصاف کا ذکر بھی ملتا ہے۔

(۸)
کمال نامۂ اخوان بابا داؤد خاکیؔ نے علوم ظاہری و باطنی کی خاطر دور دراز ملکوں کے سفر کئے اور اس دوران جن جن لوگوں سے فیضیاب ہوئے انکا ذکر انہوں نے کمال نامہ اخوان میں کیا غرضیکہ یہ ایک تذکرہ ہے کشمیر، ملتان، پنجاب اور اس کے گرد و نواح کے صوفیاء، صلحاء، علماء اور فضلاء کا جنکا فیوض و برکات کے سرچشموں سے بابا داؤد خاکیؔ نے اپنی علمی تشنگی دور کی۔

(۹)
قصیدۂ جلالیہ یہ قصیدہ مخدوم جہانیاں سیّد جلال الدین بخاریؒ کی شان میں لکھا ہے (سیّد جلال الدین بخاریؒ جنہوں نے سلطان العارفینؒ شیخ حمزہ مخدومؒ کی تربیت کی)۔ اس قصیدہ میں بابا داؤد خاکیؔؒ نے سیّد جلال الدین بخاریؒ کا مرتبہ، انکی سیاحت اور دیگر اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ اس قصیدہ کے ایک سو پچھتر (۱۷۵) اشعار ہیں۔ اسے انہوں نے سنہ ۹[illegible]ھ میں تصنیف کیا ہے۔

(۱۰)
شرح قصیدۂ جلالیہ قصیدۂ جلالیہ کی اس شرح میں شرح کے علاوہ بابا داؤد خاکیؔؒ نے سیّد جلال الدین بخاریؒ کے نجی و خاندانی حالات، نسب نامہ، انکی تالیفات و تصنیفات، سلسلۂ سلوک اور تبلیغ دین کی خاطر ان کی مساعی جمیلہ کا بھرپور انداز میں ذکر فرمایا ہے۔

(۱۱)
قربِ نوافل یہ ایک رسالہ ہے جس میں بابا داؤد خاکیؒ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ میں نوافل عبادات کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس امر پر زور دیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے بغیر دنیا و عقبیٰ کی سرخروئی بعید از امکان ہے۔ یہ رسالہ بھی منظوم ہے۔

علاوہ ازیں حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور انمیں بھی توحید و رسالت کے نکات پیش کئے ہیں۔ انہیں تاریخ گوئی کا ملکہ حاصل تھا۔ حضرت سیّد جلال الدین بخاریؒ کی کشمیر میں آمد، انکی وفات، سلطان العارفین کی مساجد و [illegible] کی تعمیر

اور نعت سلطان العارفین کے وصال وغیرہ کی تاریخیں کہی ہیں۔

بابا داؤد خاکیؒ چونکہ عربی اور فارسی کے اپنے وقت اور نابغہ تھے ان دونوں زبانوں کی تاریخ، ادبیات اور دیگر اصناف پر گہری نظر تھی اس لیے اپنی تصانیف بالخصوص منظومات کی انہیں شرحیں لکھنا پڑی ہیں۔

بابا داؤد خاکیؒ کی شاعری لاجواب ہے۔ انہوں نے مذہب، حالاتِ حاضرہ، تصوّف، الٰہیات، دینیات، اور اس سے متعلق پیچیدہ گتھیوں کو شعری پیکروں میں اسطرح پیش کیا ہے کہ قاری عش عش کرنے لگتا ہے۔

بابا داؤد خاکیؒ کا شاعرانہ رتبہ متعین کرتے وقت ناقدوں کو چاہیئے کہ وہ انکی دیگر تصانیف کے علاوہ قصیدۂ 'وِرد المریدین' اور 'قصیدہ لامیہ' کا مطالعہ خصوصیت کے ساتھ ملحوظ نظر رکھیں۔ اس میں شک نہیں کہ انکی شاعرانہ صلاحیتیں اور دیگر فکری سوتے تبلیغ اسلام اور اسلامی سربلندی کیلئے وقف تھے مگر انکے ہاں شعری پیکر تراشیاں، محاورات و امثال کا برمحل استعمال فنی چابکدستی اور دیگر رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ تمام اعلیٰ و ارفع شاعرانہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ قرآن، تفسیر، حدیث عروض، ادبیات، فقہ، دینیات فلسفہ، منطق، سلوک، روحانیت کے علوم پر مہارت تامہ کیوجہ سے ہی انہیں ابو حنیفۂ ثانی کا لقب ملا۔ دنیاوی شہرت، عزت، عیش و عشرت، شان و شوکت اور جاہ و ثروت کی بدولت ملا دولت کہلائے مگر اس مادی زندگی کی جلوہ سامانیاں شاہی غرور اور تمکنت تج کر جب راہ حقیقت پر گامزن ہو کر روحانیت اور سلوک کی منازل طے کرنے پر کمربستہ ہوئے تو "خاکی" ہو گئے۔ اور معرفت کے وہ جام لنڈھائے جنکی کیفیت آگیں سرمستی میں انکے خیالات اور احساسات شعری جامہ پہن کر متعدد تصانیف کی صورت میں وجود میں آئیں جو انکی شہرت عام اور بقائے دوام کی ضامن ہیں۔

؎ ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

* * *

سلاطین

ڈاکٹر ٹی۔ ایچ گنجو

راب نسل

کشمیر میں ماقبل تاریخی دور سے ہی نارڈک (Nordic) ناگ نسل کا وجود رہا ہے رِگ ویدک آریوں کے یہاں آنے سے پہلے ناگ نسل کا پھیلاؤ سارے ہی ہمالیہ کے دامنوں اور وادیوں میں چار ہزار سال قبل مبسبع ہو چکا تھا۔ اس نسل کا رشتہ حقیقت میں ہندیورپی اور ہند ایرانی لوگوں سے ہے۔ جو ہندیورپی لوگ مغرب کی جانب جانے سے پہلے ان نارڈک ناگوں کا پھیلاؤ مغربی ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں ہو چکا تھا۔ اور صوبہ سندھ انکی ابتدائی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد ایک مضبوط اور تہذیب یافتہ نسل کے لوگوں نے ان نارڈک ناگ نسل کے لوگوں کو سندھ کی دھرتی چھوڑنے پر مجبور کیا اور مجبوری کی بنا پر انہیں ہمالیہ کے شمالی پہاڑی دروں دامنوں اور وادیوں میں رہائش کی خاطر سہارا لینا پڑا۔ ان نارڈک نسل کے لوگوں کا پھیلاؤ گڑھوال گھماؤں، نیپال کشمیر اور تا حد تبت ہوا۔ کشمیر کے پورب میں انکا پھیلاؤ لداخ اور زانسکار تک ہوا اور کشمیر کے اتر پچھم میں گلگت تک رہا۔

سنسکرت زبان میں "ناگ" لفظ کا مطلب لسانیات کے پس منظر میں بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ لہٰذا سنسکرت میں ناگ کا مطلب ہاتھی، سانپ، دھات اور پہاڑ ہے۔ ناگ لفظ کا مصدر (Basic Rout) /نگ/ اسا ہے اور Etomology کے مطابق اسکی وست (NAGE Bhava) ناگا یعنی جو پہاڑ پر رہتا ہے یا جسکا رشتہ پہاڑ سے ہے۔ سنسکرت زبان میں درد، ناگ اور پربت میں معنی کے اعتبار سے آپسی رشتے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

کشمیری زبان میں ناگ چشمہ کو بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ ناگ (چشمہ) کا بُدبداتا پانی بھی پہاڑی گلیشروں سے ہی آتا ہے۔ اور برف کے گلیشر بھی قدرتی طور پر پہاڑوں پر ہی ہوتے ہیں حقیقت میں ان نارڈک

ناگ نسل کے لوگوں کو ناگ نام سے پکارنے کا سہرا ان رگویدک آریوں کے سر ہے جو وادی سندھ کی تہذیب کے زوال کے بعد ہمالیہ کی گھاٹیوں میں پھیلنے شروع ہوئے تھے اور انکا آمنا سامنا ان پہاڑوں میں بسنے والے نارڈک نسل کے لوگوں سے ہوا تھا۔ رگویدک آریوں میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی وہ کسی فرد، چیز یا جگہ کا نام اسکی فطرت، رجحان اور ہیئت کے مطابق رکھتے تھے چنانچہ نارڈک نسل کے لوگوں نے باقاعدہ ڈھنگ سے پہاڑوں پر رہنے کیوجہ سے رگویدک آریوں سے ناگ نام پایا یہ رویہ رگویدک آریوں نے نہ صرف ناگوں کے بارے میں اپنایا ہے۔ بلکہ اسکی حقیقت کی شہادت ہمیں اور بھی ملتی ہے۔ اسی رجحان کے مطابق ان رگویدک آریوں نے بندر شکل و صورت کی مانند آدھی واسی بھارتی نسل کو دیکھ کر انکا نام "وانر" رکھا۔ جس سے انکا مطلب یہ تھا کہ کیا یہ بھی انسان ہیں؟ یا کیا انھیں بھی انسان کی نسل سے جوڑا جا سکتا ہے؟ اسی رجحان اور لسانی پہلو کے پیش نظر انہوں نے ایک اور آدھی واسی نسل کو دیکھکر انکو انکے ناک نقشہ کے مطابق "کِنّر" نام رکھا۔ جس سے انکا اشارہ یہ تھا کہ کیا یہ بھی انسانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں؟ اس وجہ سے اگر ان رگویدک آریوں نے اپنی زبان کے ترقی یافتہ لہجے کے پیش نظر ان نارڈک ناگوں کو ناگ لفظ سے پکارا ہو تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ناگ نسل اور ناگ پوجا حقیقت میں دو الگ پہلو ہیں۔ انہیں آپس میں جوڑ کر ایک ہی تسلیم کرنا تاریخی غلطی ہے۔

اگر ہم ناگ پوجا کے قدیم آثار کی جستجو کریں تو ممکن ہے کہ ہمیں دنیا کی قدیم تہذیبوں میں ناگ پوجا کے نقوش ملیں گے۔ ناگ پوجا کا ہتی تہذیب[1]، قدیم موسائی یہودی تہذیب[2]، مصری تہذیب[3] ایزن تہذیب[4] اور سندھی تہذیب[5] میں ملتا ہے۔

---

1) Sayce. A.H: The Hittites - 2

2) Burgh Dc. W.G. The legacy of Ancient world 130

3) Breasted. J.H. Devlopment of Religion and Thought in Egypt 159

4) Bury. J.B. History of Greece

5) Marshall, Sir John, Mohenjo Daro and Indus Civilzation-214

رگ وید میں اگرچہ ہمیں ناگ لفظ نہیں ملتا ہے لیکن اس کے مترادف اہی[۱] لفظ ملتا ہے۔ جسکے معنی بھی ناگ ہی ہے۔ ان اہی[۲] لوگوں کی تہذیب اور انکا تمدن رگویدک آریوں سے بلاشبہ بہت ترقی یافتہ تھا۔ یہی وجہ ہے ان اہی کی مادی ترقی سے رگویدک آریہ بڑے غمگین دکھائی دیتے ہیں۔ اس تہذیب نے " ورتراسُر "[۳] "شمبراسُر" وغیرہ بڑی نامور ہستیوں کو پیدا کیا ہے۔ کیدار کھنڈ[۴] کی تواریخی شہادت سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ناگ نسل کشیپ یا کشیپ گوت (clan) کی اولاد ہونے کیوجہ سے رگویدک یندر کے سوتیلے بھائی ہیں[۵] کیدار کھنڈ میں ناگاؤں کی سلطنت اور انکی سرحدوں کا پورا تواریخی تعارف ملتا ہے۔ ٹیہری[۶] اور گڑھوال کے شمال میں اور ناگپور کے علاقہ تک ناگوں کا پھیلاؤ رہا ہے۔ اور انکا یہ اثر لگ بھگ ہمالیہ کی ساری پہاڑی گھاٹیوں میں رہا ہے۔ جو کشمیر سے تبت تک ناگوں کی تہذیب اور انکے تمدن کا ماحول پھیلاتا ہے۔ معنی خیز کی بات یہ ہے کہ اس نارڈک ناگ نسل نے گڑھوال[۷] اور کشمیر میں "رُدرِ" فرقے کے ساتھ ایک ملا جلا تمدنی اور ثقافتی، تاریخی سمجھوتہ کیا تھا۔ جسکے ردعمل میں سارے ہمالیہ میں " رُدرِ " فرقے کا تاریخی طور پر بول بالا ہو رہا تھا۔

---

[۱] رگوید۔ ۲، ۳۳، ۷، ۴، ۳، ۱۷

[۲] رگوید۔ ۸، ۸۵، ۱۳، ۱۵

[۳] رگوید۔ ۱۱، ۳۲، ۱، ۲، ۳، ۵

[۴] کیدار کھنڈ۔ ۳۸، ۳۲، ۳۳۔

[۵] کیدار کھنڈ۔ ۸۰، ۴، ۲۴، ۲۱، ۴۱، ۸۴۷۔

[۶] کیدار کھنڈ۔ ۸، ۴، ۶۔

[۷] نیل مت پران:۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳

مہابھارت[1] کے پہلے باب میں ناگاؤں کے نسلی کنبے (Racial Stock) کیبارے میں ایک اہم تاریخی دستاویز دستیاب ہوئی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رگ ویدک آریاؤں کے آنے سے بہت پہلے ان نارڈگ ناگاؤں کا ایک گروہ وادی سندھ میں آکر آباد ہو چکا تھا اور پھر آہستہ آہستہ سارے ہمالیہ میں چھا گیا۔ نارڈک ناگاؤں اور رگویدک آریاؤں کے درمیان زبان کا کوئی فرق نہیں تھا۔ لیکن مہابھارت[2] اور پرانوں[3] میں انکے آپسی ٹکراؤ کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ موقعہ ملتے ہی دونوں ایک دوسرے پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ مگر مہابھارت میں انکا ٹکراؤ کچھ زیادہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ اسکے باوجود قابل تعجب امر یہ ہے کہ ان دونوں فرقوں کے درمیان رشتے بھی ہو رہے تھے۔ پانڈوؤں کی ماں کنتی کے باپ کے نانا ناگ[4] راج تھے۔ پانڈوؤں کے بھائی ارجن نے ناگاؤں کی لڑکی الوپی[5] سے شادی کی تھی، مہابھارت کا یہ دور ان دونوں فرقوں کیلئے میل جول اور ٹکراؤ کی بدولت کشمکش کا باعث رہا ہے اور نارڈک ناگا لوگ گنگا جمنا اور پنجاب کے میدانی علاقوں کی جانب اپنے قدم بڑھا چکے تھے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نارڈک ناگا ان میدانی علاقوں میں اپنی سیاسی عظمت اور حاکمانہ برتری حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسکے پیش نظر اگر نارڈک ناگاؤں اور ویدک آریاؤں کا آپسی یہ ٹکراؤ اور تیز ہوا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ پانڈوؤں کے بھائی ارجن کا اندر پرست (موجودہ دہلی) میں ایک بستی بساتے وقت تکھشک ناگ سے بڑا ٹکراؤ ہوا تھا۔ بستی بسانے میں تکھشک نے بڑی اڑچن ڈالی اور بدلے میں ارجن نے بھی کھانڈو جنگل کے آگ کے

---

[1] مہابھارت I ۲۸، ۵۳ ادھیائے [2] مہابھارت I ۵۲/۲۹ ادھیائے

[3] پدم پران

[4] مہابھارت I

[5] مہابھارت تیرتھ یاترا باب

حادثے میں تکھشک کے بیٹے آشوسین اور اسکی اہلیہ کو اپنے زہریلے تیروں سے چھلنی کر دیا تکھشک نے بھی اسکے بدلے میں مہابھارت کی جنگ کے بعد موقعہ ملتے ہی پانڈوؤں کے پوتے پریکھشت کو ایک عجیب و غریب جنگی مورچہ میں مار ڈالا۔ پریکھشت کے مرنے کے بعد اسکے بیٹے راجہ جن میجے نے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے "سرپ ستر" جنگی مورچہ بنا کر نارڈک ناگاؤں کی تباہی و بربادی کیلئے گوریلا فوج تیار کرنی شروع کر دی۔ جن میجے بے شک ایک بہادر راجہ تھا۔ لیکن سیاسی داؤ پیچ میں وہ نارڈک ناگاؤں کے مقابلہ میں طفل مکتب تھا۔ ناگاؤں کا ایک سلجھا ہوا رہنما واسکی ناگ تھا۔ اس نے اپنی بہن جسرت کارو کی شادی ایک خود آگاہ آریائی فرقے کے رشی کیساتھ کر کے ویدک فرقے میں اپنا اثر و رسوخ قائم کیا۔ اور جن میجے کی جنگ میں نارڈک ناگا بری طرح سے ہار گئے تھے بالآخر صلح کے وقت واسکی ناگ کے بھانجے رشی آستیک نے نارڈک ناگاؤں کو آریاؤں کے ظلم و تشدد سے بچا کر دونوں میں دوستی کا رشتہ استوار کیا۔ اس سے یہ حقیقت اور بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ ناگ سیاسی داؤ پیچ کے بڑے ماہر تھے چنانچہ رشی آستیک کے بیچ بچاؤ کی بدولت نارڈک ناگ اور ویدک آریہ ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئے۔ اور دونوں میں ایکدوسرے کیساتھ گھل مل کر رہنے کی ایک نئی تاریخی فضا پیدا ہوئی۔ حالانکہ آگے چل کر تواریخی پس منظر سب ناگاؤں کا ارتقاء "ناگ داکھٹک" (لگ بھگ ۱۹۰ - ۳۴۴ء) اور کشمیر کے کارکوٹک ناگ (ساتویں آٹھویں صدی عیسوی) کی صورت میں ابھرا لیکن تہذیب و تمدن کے لحاظ سے یہ ویدک آریوں میں پوری طرح سے گھل مل چکے تھے۔

کشمیر ان نارڈک ناگاؤں کا ایک خاص مرکز رہا ہے جیساکہ پہلے اسکا ذکر ہو چکا ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب سے بہت پہلے ناگاؤں کا مسکن ہندوستان کا پچھمی علاقہ رہ چکا تھا۔ لیکن وادی سندھ کے معماروں نے انکو آگے کی طرف دھکیل دیا جسکی وجہ سے نارڈک ناگا کشمیر ۱؎

۱؎ نیل مت پوران

گڑھوال[۱] گھاؤں نیپال، بنگال، آسام اور تبت تک پھیلے۔ انکی یہ تحریک[۲] رگ ویدک آریہ، منگولائڈ، آسٹرک اور دیگر نسلوں سے بہت پہلے وجود میں آئی ہے۔ اس ناگ نسل نے شمالی ہمالیہ، مشرقی ہمالیہ اور پوربی ہمالیہ میں اپنی ایک مضبوط سلطنت چھوٹے چھوٹے راجواڑوں میں قائم کی تھی۔ بقول نیل مت پران کشمیر میں ان نارڈوک نے ناگاؤں کا آنا راجہ اننت ناگ[۳] کی رہنمائی میں ہوا جو پہلی بار اپنے قبیلے کے ساتھ کشمیر میں آکر بسے تھے۔ اننت ناگ کے بعد کشمیر میں ناگاؤں کا دوسرا رہنما راجہ نیل ہوا ہے۔ جس کا تذکرہ مہابھارت کے ابتدائی باب میں ملتا ہے

نیلہ نیلو تتھا ناگھو

(یعنی نیل اور انیل یہ دو ناگ (مہابھارت I ۳۱)

اس تقابلی مطالعے کے بعد نیل مت پُران کی تواریخی شہادت درست ثابت ہوتی ہے کہ راجہ اننت ناگ کے بعد کشمیر کا راجہ راجہ نیل ناگ تھا۔ نیل مت پُران میں راجہ اننت ناگ کے بارے میں تاریخی اشارہ اس طرح ملتا ہے:-

> "اس کشمیر میں راجہ نیل ناگ سے بہت پہلے راجہ اننت ناگ نے ہل اٹھا کر رہنے کے قابل جگہ بنائی اور جہاں پر اب راجہ نیل کی حکومت ہے[۴]"

نیل مت پُران اور مہابھارت[۵] کے واقعات آپس میں بہت حد تک ملتے جلتے ہیں اسکے علاوہ راجہ اننت ناگ کی تاریخی حیثیت گڑھوال[۶] کی تاریخ سے صحیح ثابت ہوتی ہے کیونکہ وہاں بھی راجہ

---

[۱] ایٹکنسن ہمالیہ ڈسٹرکٹس - ۷۰۲ [۲] موٹینیر ہمالیہ سفرنامہ

[۳] (و) نیل مت پُران ۳۴۰ (ب) گیتا ۱۰/۲۱ (ناگوں میں، میں اننت ناگ ہوں)

[۴] نیل مت پُران ۳۴ - ۳۴۳

[۵] مہابھارت ۱ - ۳۱، ۴ - ۱۶

[۶] والٹن گڑھوال گزیٹیرس ۱۱۱ - ۱۸۷

انت کی یادگار کے طور پر ایک چشمہ موجود ہے ہویلر اپنی کتاب تاریخِ ہند میں اس حقیقت کو درست قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ گڑھوال میں ناگاؤں کے قدیم تاریخی کھنڈرات ابھی تک موجود ہیں۔

ناگاؤں کا کشمیر میں داخلہ گڑھوال سے ہماچل پردیش سے ہو کر بھدرواہ اور کشتواڑ میں پہلے ہوا۔ چنانچہ جغرافیائی لحاظ سے بھدرواہ کشمیر کے دکن میں واقع ہے بھدرواہ میں واسکی ناگ اور دیگر ناگوں کے تواریخی آثار ملتے ہیں لہذا وہیں سے ناگوں کا کشمیر میں داخلہ ہوا ہے۔ راجہ نیل کی راجدھانی بھی بانہال کے شمال میں پہاڑی دامن ویری ناگ میں واقع تھی۔ کشمیر کے مورخ کلہن[۱] نے راجہ نیل کو نیل (منی درشی) کہہ کر عزت افزائی کی ہے۔ لگتا ہے کہ کلہن تک آتے آتے راجہ نیل اپنے کامیاب طرزِ عمل اور اپنی بھائی چارے کی وجہ سے ایک رشی کی طرح پوجا جاتا تھا۔

نیل مت پُران میں راجہ نیل کا تذکرہ ایک کامیاب حکمران[۴]، باشعور سیاستدان[۳]، عوامی[۲] خیر خواہ اور خیرسگالی[۵] کے ماہر کے روپ میں ملتا ہے نیل مت پُران کے مطابق راجہ نیل سے پہلے نارڈگ ناگ رگویدک آریوں کا کشمیر میں آنا بند کر چکے تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے بعد ناگوں نے کشپ[۶] رشی کے مشورے کے مطابق اپنی رائے بدل دی اور رگویدک آریوں کو گرمیوں کے چھ مہینے کے لئے کشمیر میں اجازت ملی تھی۔ لہذا وہ جاڑے میں میدانوں کیطرف لوٹ جاتے تھے راجہ نیل کے عہدِ حکومت تک لگ بھگ ان رگویدک آریوں کا آنا جانا اسی طرح جاری رہا۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ان نارڈک ناگوں اور رگویدک آریوں کی زبان کا ورثہ مشترک ہونے

---

[۱] راج ترنگنی ۱ - ۱۴

[۲] نیل مت پُران ۷۲، ۱۰۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۲۰۹، ۲۲۰

[۳] نیل مت پُران ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۹، ۳۸۳ - [۴] نیل مت پُران ۱۰۰۰، ۱۰۰۱

[۵] نیل مت پُران ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۹۴، ۹۹۹، ۱۰۰۸، ۱۰۲۴

[۶] نیل مت پُران ۲۱۷ - ۲۱۸

کیوجہ سے آپسی رشتہ بہت گہرا محسوس ہوتا تھا۔ اس وجہ سے یہ لوگ پشاچوں کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ بقول راجہ نیل[1] پشاچ خونخوار ہوتے ہیں اور بے رحمانہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں۔ رگ ویدک آریہ چیت[2] مہینے کی پورنماشی کے بعد کشمیر آتے تھے اور اسوج[3] مہینے کی پورن ماشی کے بعد فصل وغیرہ کاٹ کر ذخیرہ کر کے کچھ ساتھ لیکر میدانی علاقوں کا رخ کرتے تھے۔ یہ سلسلہ پرانے معاہدہ[4] کے مطابق تھا جو ان ناردک ناگوں اور رگویدک آریوں کے درمیان قدیم زمانے میں ہوا تھا۔

ایک مرتبہ اسوج[5] کی پورنماشی کو سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد ایک کشپ گوتر[6] کا (Clan of Kashpa) کے برہمن چندر دیو، چاہتے ہوئے بھی کچھ وجوہات کی بنا پر کشمیر سے باہر نہیں جاسکا۔ جاڑے کے شروع ہونے کے بعد چندر دیو برہمن پشاچوں کے درمیان بری طرح پھنس گیا۔ پشاچوں[7] نے تو اسکو پرندے کے مانند اچھال اچھال کر کبھی یہاں اور کبھی وہاں پھینکا لیکن اپنے قومی[8] رہنما نکمبھ کے حکم کی تعمیل میں اسے مارا نہیں۔ ایک تو برفباری کا موسم تھا اس پر سردی بے حد بڑھ چکی تھی۔ برف کیوجہ سے سارے درے بند ہو چکے تھے۔ اس لئے چندر دیو کا بھاگنا بھی ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی ہمت کر کے وہ کسی نہ کسی طرح[9] کشمیر کے راجہ نیل کے پاس امداد کیلئے پہنچا۔

رگویدک برہمن چندر دیو نے راجہ نیل[10] کو پہاڑ کے دامن میں ایک خوبصورت پلنگ پر بڑی شان و شوکت کے ساتھ بیٹھا ہوا پایا اور پشاچوں[11] کا رہنما نکمبھ اسکی خدمت میں مصروف تھا۔

---

[1] نیل مت پوران - ۲۲ - [2] نیل مت پوران - ۳۷۸ [3] نیل مت پوران ۳۲۵

[4] " - ۲۱۷ - ۲۱۸ - [5] نیل مت پوران - ۲۳۵

[6] " - ۲۳۶ [7] نیل مت پوران ۲۳۷ [8] نیل مت پوران ۲۳۹

[9] " ۲۴۰ [10] " ۲۴۳ [11] نیل مت پوران ۲۴۴

بڑے[1] طاقتور ناگ اور خوبصورت ناگ کماریاں اسکے دائیں بائیں تھیں۔ کچھ راجہ[2] نیل کی تعریفوں کے گیت گاتے تھے اور کچھ ایک پنکھے جھولتے تھے۔ راجہ[3] نیل کی جسمانی ساخت چندر دیو برہمن کو یوں محسوس ہوئی۔ راجہ نیل[4] کے بال نیلے اور آنکھیں نیلی[5] تھیں۔ اسکے بال آگ کی لپٹوں کی مانند سنہرے[6] تھے اس کے سر پر سونے کا تاج[7] تھا اور کانوں میں چمچماتے[8] کنڈل تھے۔ اسکے بدن کا رنگ چھوٹتی کوندھ[9] کی مانند گورا تھا اور چاندنی رنگ کے چھینی ریشم سے اسکا جسم ڈھکا ہوا تھا۔ راجہ نیل کا چندروا[10] سونے کی تاروں اور سات سو[11] سروپ مکھی ہیروں سے سجا ہوا تھا۔ چندروے کی چاروں طرف مختلف رنگوں[12] کے پتے جڑے ہوئے تھے۔

چندر دیو برہمن نے اس شان و شوکت اور سجے سنورے آدمی[13] کو دیکھ کر ہی اندازہ لگایا کہ یہی راجہ نیل ہونا چاہئے اس نے دھرتی کو چھو[14] کر اس کا آداب بجالایا اور نیل کی مدح سرائی کی قصیدے[15] کے بیان میں اور خوبیوں کے علاوہ چندر دیو نے ابتداء میں راجہ نیل کی یہ کہہ کر عزت افزائی کی کہ تم کشیپ[16] رشی کے بیٹے ہو اور شمالی[17] ہندوستان کے سبھی راجے تمہارے دوست ہیں۔ رگویدک[18] چندر دیو کی تعریفوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ راجہ نیل[19] ایک فیاض اور نیک دل راجہ ہے۔ اسکی ٹھاٹ باٹھ اور شان[20] و شوکت ایک خوشحال راجہ کی مانند ہے۔

---

[1] نیل مت پُران ۳۴۳ [2] نیل مت پُران ۳۴۴ [3] نیل مت پُران ۳۴۵
[4] 〃 ۳۴۵ [5] 〃 ۳۵۸ [6] 〃 ۳۵۵
[7] 〃 ۳۴۵ [8] 〃 ۳۴۶ [9] 〃 ۳۴۶
[10] 〃 ۳۴۸ [11] 〃 ۳۴۷ [12] 〃 ۳۴۸
[13] 〃 ۳۴۹ [14] 〃 ۳۵۰ [15] 〃 ۳۵۱
[16] 〃 ۳۶۴ [17] ۳۶۸ [18] 〃 ۳۷۰
[19] 〃 ۳۷۰ [20] 〃 ۳۴۵ ـ ۳۴۸

آریہ تہذیب وتمدن کے پروردہ چندر دیو کو راجہ نیل کی شان وشوکت اور خوشحالی دیوتاؤں کے راجہ یندر[1] کے ہم پلہ معلوم ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ چندر دیو کی قصیدہ خوانی میں کوئی بناوٹ[2] نہیں ہے اور چندر دیو راجہ نیل کی توجہ ایک خاص مقصد کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہے۔ گویا چندر دیو برہمن راجہ نیل کو ایک ایسے زرخیز اور پرفضا ماحول[3] کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ جہاں ناگ دگویلک، آریہ اور نارڈک ناک ایک ساتھ مل جل[4] کر رہ سکیں۔

راجہ نیل کشمیر کا ایک طاقتور[5] راجہ ہے۔ پشاچوں[6] کی سیاست اور عنان حکومت اسکے ہاتھ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پشاچوں کا دہنا نکمبھ[7] راجہ نیل کے دربار میں بحیثیت خدمتگار کام انجام دیتا ہے۔ حکمران ہونے کے باوجود بھی راجہ نیل[8] کو ویدک آریوں کے ساتھ اپنے رشتے سدھارنے کی بڑی دلچسپی ہے۔ ان حقائق کا تواریخی حوالہ نیل مت پران میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ راجہ نیل چندر دیو کے قصیدے کو غور سے سن کر خوش آمدید کہتا ہے۔ اور برہمن سے کہتا ہے کہ ” اے برہمن[9] تمہارا آنا ،، خاص کر میرے پاس آئے ہو۔ تم میرے مہمان ہو۔ اس وجہ سے اے برہمنوں میں یندر کے مانند میں آپکی پوجا کروں گا اور میں تمہیں اپنے گھر آنے کی دعوت[10] دیتا ہوں اور خواہش کرتا ہوں کہ تم وہاں سکھ چین سے رہو، اور جو کچھ اچھا سمجھتے ہو وہ بے تکلف ہو کر مجھ سے مانگو۔ ،،

یہاں پر کئی ایک الجھے ہوئے تاریخی سوالات ابھرتے ہیں جنہیں حل کئے بغیر حالات کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے تعجب تو یہ ہے کہ نیل مت پران ایک نیم تاریخی کتاب خود ہی ان سارے سوالات کا حل پیش کرتی ہے۔ مگر بدنصیبی سے آجتک ان اسرار نہانی کے اشاروں کو صحیح پس

---

[1] نیل مت پوران ۳۵۲-۳۵۸
[2] نیل مت پوران ۳۵۷-۳۵۸
[3] نیل مت پوران ۲۵۱-۲۵۴
[4] ,, ۳۷۰-۳۷۴
[5] ,, ۳۶۷-۳۶۸
[6] ,, ۲۱۰-۲۱۸
[7] ,, ۳۷۰
[8] ,, ۳۷۱
[9] ,, ۳۷۱-۳۷۴
[10] ,, ۳۳۵

منظر میں پیش کرنیکی کسی نے زحمت گوارہ نہیں کی ہے۔ ورنہ یہ پوشیدہ راز افشا ہو گئے ہوتے سوال یہ ہے کہ رگویدک برہمن چندر دیو سے پہلے بھی آریہ لوگ اسوج[1] مہینے کی پورنماشی کے بعد میدانی علاقوں کی طرف چلے جاتے تھے اور بیساکھ[2] کے مہینے میں کشمیر واپس لوٹ آتے تھے اسطرح سے آنے جانے[3] کا سلسلہ ہزاروں برس تک رہا ہو۔ مگر آنا اور جانا رگویدک آریوں کیلئے وہ مصیبت کا باعث رہا ہو گا۔ ظاہر رہا کہ وہ باقاعدہ ڈھنگ سے کشمیر میں رہنے کی کافی خواہش رکھتے ہوں۔ مگر باضابطہ [illegible] سے رہنے کیلئے ان کے سامنے کئی مشکلات حائل تھیں۔ انہیں یہ پتہ نہیں تھا [illegible]ردیوں میں کشمیر میں کتنی برف باری ہوتی ہے۔ بقول نیل مت پران ناگاؤں[4] نے ان گھمکڑ آریوں کے دماغ میں وہشت کے طور اس بات کا احساس دلایا تھا کہ کشمیر میں بھیانک برفباری ہوتی ہے۔ دوسرا سب سے بڑا پیچیدہ معاملہ پشاچوں کا تھا کیونکہ آریہ لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ جاڑے میں پشاچوں کا رہن سہن کیسا ہوتا ہے۔ جبکہ پشاچوں سے وہ پہلے ہی خوفزدہ تھے تیسرا سوال اور بھی ضروری تھا کہ ویدک آریوں کو اس بات کا کوئی علم نہیں تھا کہ ان کے مستقل رہنے کے بعد نارڈک ناگا لوگ انکے ساتھ کیسا برتاؤ کریں گے۔ ان سب باتوں کا مطالعہ کرنا ویدک آریوں کیلئے ایک اہم سوال تھا لہٰذا ان سب باتوں کی جانکاری کیلئے جان بوجھ کر ویدک آریوں نے چندر دیو برہمن کو تحقیقات کرنے کیلئے تعینات کیا تھا۔ اس حقیقت کا انکشاف خود نیل مت پران کرتا ہے۔

न निर्जगाम निर्वेदात् वोवित्तो अर्थन भाविना" (336)

نہ نرجگامہ نرودات چوتو ارتھینہ بھاونا

اس کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ چندر دیو برہمن سردی کے آنے کے بعد جانے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی من مار کر جا نہیں پایا۔ کیونکہ مستقبل کا کام اسے پورا کرنا تھا۔ نیل مت پران کے اس ایک حوالے

---

[1] نیل مت پوران ۳۲۵ [2] نیل مت پوران ۳۴۸ [3] نیل مت پوران ۲۲۵ [4] نیل مت پوران ۳۴۹

سے یہ پوشیدہ راز تاریخی کڑیوں کو جوڑتا ہے کہ چندر دیو برہمن کو اکیلے چھوڑنا ایک حادثہ نہیں تھا بلکہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا کہ ویدک آریوں کے چلے جانے کے بعد وادی کشمیر میں لوگوں کا طرز زندگی کیسا ہے۔ اس لئے ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ چندر دیو برہمن کوئی معمولی سا برہمن نہ ہو کر ایک پڑھا لکھا سیاسی سوجھ بوجھ کا ماہر اکیلے کشمیر میں رہ کر یہاں کے حالات سے مقابلہ کرنے والا ایک بہادر آدمی ضرور رہا ہوگا۔ ویدک آریہ ان باتوں سے پوری طرح واقف رہے ہوں گے کہ آخر میں انکے نمائندے چندر برہمن کو راجہ نیل کے پاس جاکر سہارا لینا پڑے گا۔ اور ان حالات میں سیاسی طور پر سلجھے ہوئے راجہ نیل[1] سے کوئی قطعی سمجھوتہ کرنے کی خاطر باشعور نمائیدرے کا ہونا لازمی ہے ان سب باتوں کے پیش نظر ہی آریوں نے چندر برہمن کو اکیلے چھوڑا۔ اگرچہ ویدک آریوں کا یہ نظریہ رہا ہوگا کہ چندر دیو کے اکیلا بچھڑ جانے کو راجہ نیل صرف ایک حادثہ سمجھے گا اور اگر چندر دیو اور راجہ نیل کا کوئی کامیاب سمجھوتہ نہیں بھی ہوتا ہے تو بھی براہ راست اس بات چیت کے ٹوٹ جانے سے ویدک آریوں کا کچھ نہیں بگڑتا۔ لہذا چندر دیو کو کشمیر میں اکیلے چھوڑنا ویدک آریوں کی ایک سیاسی چال تھی۔ اس کے علاوہ ویدک آریوں نے بہت ہی سوچ سمجھ کر اور مستقبل میں پیش آنیوالی ہر مشکلات کا تجزیہ کرنے کے بعد کشپ گوت[2] ہی کے ایک فرد چندر دیو کا انتخاب کیا کیونکہ راجہ نیل خود کشپ رشی[3] کا بیٹا تھا۔ اور چندر دیو کشپ گوت سے تعلق رکھتا تھا۔ اسلئے راجہ نیل اور چندر دیو آپس میں گوت بھائی[4] (Clan Brother) تھے۔ ان حقائق کا بغور تجزیہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی کہ ویدک آریوں کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ سردیوں میں چندر دیو کو کوئی بھی نقصان[5] نہیں پہنچا سکے گا۔ تعجب تو اس بات کا ہے کہ راجہ نیل یہ جان کر کہ

---

[1] نیل مت پُران ۱ ۳۶۱ [2] نیل مت پُران ۱۲ ۳ ۲۳

[3] [illegible] ۴۶ [illegible] [4] [illegible] [illegible]

[5] 〃 [illegible]

یہ کشپ گوت کا برہمن ہے بڑے تپاک کے ساتھ اس رشتے کی خاطر چندر برہمن کو اپنے گھر بلاتا ہے "میرے گھر کو اپنا گھر سمجھکر سکھ کے ساتھ رہو آرام سے رہو"[1] اور چندر برہمن[2] بھی بڑے دعوے سے راجہ نیل سے کہتا ہے "اے طاقتور نیل[3] ویدک آریوں کو بہار میں کشمیر آنے اور جاڑے[4] میں کشمیر سے چلے جانے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ لوگ اپنے گھروں اور قصبوں اور بہت سے سامان کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ لہذا اس خانہ بدوش زندگی سے تنگ آئے ہوئے ان لوگوں[5] کو مستقل رہنے کا حق ملنا چاہیئے" راجہ نیل نے چھوٹتے[6] ہی چندر برہمن کو اس بات کا یقین دلایا کہ ان ویدک آریوں کو مقامی باشندگی کا حق دیا جاتا ہے۔ لیکن انھیں میرے حکم[7] کی تعمیل کرنا ہوگی۔ اس کے بعد راجہ نیل[8] نے اپنے گوت بھائی (Clan Brother) چندر برہمن کو اپنے گھر لیا اور وہاں سکھ چین سے بٹھا کر ہر طرح کی آسائش بہم پہنچائی اس طرح وہ پورے چھ مہینے میں کشمیر کے سارے سماجی[9] اور مذہبی رسومات اور رواجوں سے آشنا ہوا۔

سردی کے ختم ہو جانے کے بعد چیت مہینے کی پورنماشی پر ویدک آریوں کا رہنما[10] ورد ھلے اپنے لوگ، ہاتھی اور گھوڑوں کے سمیت کشمیر کی سرحد میں قدیم معاہدہ کے مطابق داخل ہوا۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ویدک آریوں کے رہنما نے چندر دیو کو اپنا نمائندہ بنا کر کشمیر میں رکھا تھا۔ اگرچہ ظاہری طور پر اس بات کا اعلان نہیں کیا تھا مگر برہمن چندر دیو نے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کی بدولت راجہ نیل کو قابلیت اور دوستانہ رویہ سے اتنا متاثر کیا تھا کہ خود راجہ نیل نے چندر برہمن کو اپنا قاصد بنا کر اور بہت سا نذرانہ دے کر

---

[1] نیلمت پران ۳/۱ [2] نیلمت پران ۳/۲ [3،4] نیلمت پران ۳/۳

[5] " ۳/۴ [6] " ۳/۵ [7] " ۳/۵

[8] " ۳/۶ [9] " ۳/۷ [10] ۲۳۵

ویدک آریوں کے رہنما درودھے کے پاس نئے معاہدے کی شرائط لے کر بھیجا۔ اس ترکیب کے دو پہلو سامنے آتے ہیں یا تو چندر برہمن نے گوشت[1] کھائی ہونے کی وجہ سے راجہ نیل کو اتنا متاثر کیا تھا کہ راجہ نیل جیسے سیاستدان راجہ کو اس بات کا ذرا بھی خدشہ نہیں رہا کہ چندر دیو اصل میں ویدک آریوں کا ایک پوشیدہ[2] نمائندہ ہے اس وجہ سے اسے ہی اپنا قاصد[3] بنا کر درودھے کے پاس بھیجا اور وہ بھی بہت سا نذرانہ لے کر یا راجہ نیل سب کچھ جاننے کے بعد بھی کشمیر کے دکن سے آنے والے ویدک آریوں کے ساتھ ایک مستقل معاہدہ کرا کے اس بات کو قطعی شکل دینا چاہتا تھا کہ رہائش[4] کیلئے لوگوں کو جگہ اور سہولیات دی جا سکتی ہے۔ لیکن سیاسی[5] لحاظ سے حکومت کی باگ ڈور راجہ نیل کے ہاتھ میں ہی رہے گی۔ راجہ نیل کی ایک مشکل کشمیر کا مغربی علاقہ تھا جہاں سے آریہ ورتی راجہ وشو گشتو[6] آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ممکن ہے راجہ نیل جغرافیائی نزاکت کو سمجھ کر اپنے دل میں یہ فیصلہ کر بیٹھا ہو کہ ایک ساتھ دو مورچوں پر لڑنا آسان نہیں ہے۔ دوسری قابل تحریر بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ راجہ نیل پرانے معاہدے[7] کے مطابق کشمیر کے دکن سے آنے والے ویدک آریوں کو مستقل باشندگی کی اجازت دی ہو تو کوئی تعجب نہیں ہے۔

چندر دیو برہمن راجہ نیل کا نمائندہ بن کر ویدک آریوں کے رہنما کے پاس چلا گیا۔ چندر دیو نے راجہ نیل[8] اور اپنے درمیان ہوئی ساری باتیں سمجھا کر اُسے یہی مشورہ دیا کہ لینے دینے کے اصول کے مطابق ہی کشمیر میں[9] مستقل رہائش کی اجازت مل سکتی ہے۔

---

[1] نیل مت پران ۳۳۶
[2] نیل مت پران ۳۳۶
[3] نیل مت پران ۳۷۹
[4] " ۳۷۵
[5] " ۳۸۱
[6] " ۱۰۰۹، ۱۰۱۹
[7] " ۲۰۶، ۲۱۸، ۲۱۹
[8] " ۳۷۹
[9] " ۳۷۹

اس کے بعد ویدک آریوں کے رہنما رُدر دو[۱] نے سب کے ساتھ مشورہ کرکے نیل کی بات کو منظور کیا۔ اس معاہدے[۲] کے بعد نارڈک ناگاؤں اور رگویدک آریوں کا ایک نیا تمدنی سنگم وجود میں آیا۔ میدانی علاقوں میں رہنے والے رگویدک[۳] آریوں کے قافلے بلا روک ٹوک کشمیر آکر بسنے لگے۔ انہوں نے بستیاں، پُر اور گاؤں آباد کئے تیرتھ اور مندر بنائے۔ اس طرح سے فن تعمیر میں نمایاں تبدیلیاں لاکر مکانات تعمیر کئے گئے۔ راجہ نیل کے ساتھ مشترکہ رہائش کے معاہدے کی رو سے کشمیر میں[۴] برف باری بھی کم ہوئی۔ مذہبی سمجھوتوں کی دفعات کے مطابق آپسی لین دین کا طریقہ بھی اپنایا گیا۔ ان نارڈک ناگاؤں کے تہوار اور مذہبی میلوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو بہت پہلے اُدروں[۵] اور ناگاؤں[۶] کے درمیان آپسی معاہدوں کی رو سے طے ہوئے تھے لیکن اب ان ردروں کے یہ تہوار ناگ تمدن میں اس قدر شیر و شکر ہوگئے تھے کہ ناگ انہیں اپنا قومی تہوار سمجھتے تھے۔ جب کہ انکا اصلی رشتہ رُدروں کے ساتھ تھا[۷]۔

ان تہواروں اور عرسوں کی فہرست میں پشاچوں کے تہواروں کو اوّلیت کا مقام حاصل ہے۔ ممکن ہے کہ ناگوں نے قدیم تواریخ میں پشاچوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کیا ہو نیل مت پران[۸] میں اس حقیقت کا تاریخی حوالہ ملتا ہے کہ رگویدک آریوں اور پشاچوں کے

---

[۱] نیل مت پران ۳۸۰ [۲] نیل مت پران ۳۸۱

[۳] 〃 ۳۸۳ [۴] 〃 ۳۸۳

[۵] کیدار کھنڈ ۶۳-۶۵

[۶] مہابھارت، ون پرو ۸۴-۳۳

[۷] وراہ پران ۳، ۴

[۸] نیل مت پران ۲۱۰ - ۲۲۰

درمیان ناگوں نے پشاچوں کو ہی اعلیٰ درجہ دیا تھا۔ جس پر کشپ[۱] رشی ناراض بھی ہوئے تھے۔ مذہب کے رشتے میں ناگ اور پشاچ دونوں ہی رودر[۲] فرقے کے پیروکار تھے لہذا راجہ نیل کی یہ سیاسی چال تھی کہ پشاچوں اور رگویدک[۳] آریوں کے درمیان خانہ جنگی نہ چھڑ جائے جو ملک میں آمریت کا باعث ہوگی۔ اس اندیشے کو دور کرنے کی خاطر راجہ نیل نے پشاچوں کے تہواروں کو منانے کیلئے اولین اقدامات کئے اور چندر برہمن کو تلقین کی کہ پشاچوں کو پرشکوہ[۴] دعوت پر بلانا چاہیے جہاں انکے رہنما نکمبھ[۵] کو کھچڑی کھلا کر عزت افزائی کی جائے۔ نیل مت پران[۶] کے مطابق پشاچ رودر کے بڑے ہی بھگت ہیں۔ ظاہر ہے کہ پشاچوں کے ساتھ راجہ نیل کی ہمدردی کا اظہار ایک قدرتی عمل ہے کیونکہ دونوں ٹولیوں[۷] کے قبیلے کا خدا ایک ہی تھا۔

دوسرا اہم ترین تہوار نارڈک ناگوں کا ہے۔ جو خود ہی راجہ نیل چندر برہمن کو سمجھا کر کہتا ہے کہ ناگوں کی عزت[۸] افزائی کیلئے باقاعدہ دعوت کا انتظام ہونا چاہئے۔ تعجب یہ ہے کہ ناگوں کا یہ تہوار اب بھی کشمیری ہندو مناتے ہیں۔ اس تہوار کا کشمیری نام "گاڑ بتہ" ہے۔ کشمیری زبان میں گاڑ مچھلی کو بھی کہتے ہیں اور اتفاق سے اس دن مچھلی بھی پکائی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ گاڑ لفظ تمدنی سنگم کا ایک پر وقار لفظ رہا ہے اصل میں یہ (گاڑھ بتہ) ESSENTIAL EFFECTIONATE FAEST لفظ ہونا چاہیے جسکے معنی

---

[۱] نیل مت پوران ۲۳۰

[۲] کیدار کھنڈ ۶۳-۶۵

[۳] نیل مت پوران ۲۵۳، ۳۸۸، ۴۱۰ [۴] نیل مت پوران ۳۸۸، ۵۷۷

[۵] 〃 ۳۹۴ [۶] 〃 ۵۷۵

[۷] ردر یہ ملہ تنتر

[۸] نیل مت پوران ۲۷۸، ۶۵۵، ۸۰۷، ۸۷۰

آ بیسی ایل محبت کی ضیافت ہیں۔ کشمیری زبان[1] میں گاڑ مچھلی کیلئے آتا ہے۔ ویدک زبان میں گڑ یا گرڈ پیلے رنگ کی مچھلی کو کہتے ہیں۔ ہندوستانی زبان میں اس مچھلی کو "گرڑ وائی" کہتے ہیں لہذا گرڑ (مچھلی) اور گاڑہ (آبیسی ایل و محبت) دونوں لفظوں میں صوتیات (~~hom~~ophone) کے لحاظ سے اتنے نزدیک آئے ہیں کہ ان کا رشتہ کرنا مشکل ہے۔ بہرحال گاڑبتہ ناگوں اور ویدک آریوں کے درمیان میل و محبت کا ایک اہم "تہوار" ہے۔ چنانچہ رگویدک آریہ مصالحوں سے باخبر ہونے کی وجہ سے ناگوں کو مصالحوں میں پکی ہوئی مچھلی کھلانے کے علاوہ ان کی فطرت کے پیش نظر کچی دھلی ہوئی مچھلی بھی ساتھ رکھتے تھے۔ یہ تہوار اب بھی باقاعدہ طور پر منایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ایک ایسے تہوار ہیں جن کا رشتہ رُدر اور تنتر فرقے کے ساتھ ہے۔ ان میں شیوراتری جس کا کشمیری نام ہیرٹ[2] ہے بہت ہی اہم تہوار ہے۔ اسکے علاوہ مگھر کی پورنماشی کا تہوار[3]، اساڑھ کی سپتمی[4] کا تہوار، پہلی برفباری[5] کا تہوار، ولستا (کشمیری میں وِیتھ ترووا) کا تہوار[6]، جل کیربیڑا کا تہوار[7]، کتک مہینے میں فصل کاٹنے اور زعفران چننے کا تہوار[8] ماگھ کی پورنماشی کا تہوار[9] (کاوپونم کشمیری)، اسوج کے مہینے میں پشاچوں کے سردار کا کشمیر لوٹ آنے کا تہوار[10] یہاں کے لوگوں کے اہم تہواروں میں سے ہیں۔ ان تہواروں میں ایکادشہ ردر[11] جسکو کشمیری زبان میں کاہ نووِہی کہتے ہیں شامل ہے۔ سنسکرت زبان میں کا ایکادشہ (گیارہ)

1:- V.S.ATIS DICTIONORY VOL. I P. 643

WILLIAM'S DICTIONORY P. 542

۲؎ نیل مت پوران ۵۲۳، ۵۲۴ ۳؎ نیل مت پوران ۷۷۴، ۴۷۷

۴؎ " ۴۶۸ ۵؎ نیل مت پوران ۴۷۰ ۶؎ نیل مت پوران ۴۸۴

۷؎ " ۷۹۱، ۷۹۸ ۸؎ نیل مت پوران ۷۴۱

۹؎ " ۱۱۴ ۱۰؎ " ۵۱۶ ۱۱؎ نیل مت پوران ۲۸۸-۶۰

کا کشمیری میں |کاہ| اپ بھرنش روپ ہے۔ ناگوں کا یہ سلسلہ اب بھی کشمیر میں رائج ہے۔ کافرستان[1] یا نورستان کے باشندوں کا سب سے بڑا دیوتا |امرہ| ہے جو ویدک زبان میں یمراج کہلاتا ہے اُس سے دوسرے درجہ کا دیوتا |گھوش| ہے جو گیارہ رُدروں میں سے ایک رُدر ہے۔

قابل ذکر امر یہ ہے کہ ناگوں کے جتنے بھی مروج تہوار، میلے، عرس اور مذہبی رسم و رواج رہے ہیں اور جنہیں راجہ نیل نے چندر برہمن کو اپنانے کا مشورہ دیا ان سب میں رقص[2] و سرود کا عنصر سب سے زیادہ ہے۔ ان کے مطالعے سے سماج کا ایک اہم جز ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے کہ ناگ قوم کشمیر میں بڑی خوشحال تھی۔ کھانے پینے اور آرام و آسائش کے بہتر مواقع میسر رہے ہونگے۔ سرکار کی طرف سے تفریح اور عیش نشاط کی نہ صرف آزادی تھی بلکہ ان کا اہتمام کرنے کیلئے حوصلہ افزائی بھی کی جاتی تھی۔ موجودہ کشمیری کلچر اور قدیم ناگوں کے کلچر کا موازنہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ ناگوں کی تہذیب اور انکے تمدن کی موجودہ تہذیب و تمدن پر گہری چھاپ ہے۔ موجودہ کشمیری سماج میں گانا بجانا خواہ خوشی ہو یا غمی ایک سنگیت کے لہجے میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔

رگویدک برہمن چندر دیو کے آنے کے وقت تک کشمیر میں ناگاؤں کے لگ بھگ چھ سو سات ذاتیں موجود تھیں۔ کشمیر میں ذات کو |کرام| (Surname) اور سنسکرت میں |کُلہ نام| کہتے ہیں۔ ناگوں کی یہ ذاتیں (SUR NAME) یا کرام اب بھی کشمیر میں موجود ہیں۔

---

[1] کافرستان، صفحہ ۷۲۷ - ۱۶۷ (۱۸۹۶)

[2] نیل مت پران ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۵۸، ۵۸۱، ۶۶۳-۶۶۵، ۶۸۹، ۶۹۲، ۷۲۵، ۷۴۰، ۷۶۹، ۷۹۵، ۸۲۰، ۸۲۳، ۸۴۶، ۸۴۸، ۸۹۲

کچھب[1] < کچھو، شسہ پال[2] < ہپہ، لبیدر[3] < لدر، پیشت[4] < پشن، کپالی[5] < کلہ، وڑرتھ[6] < برپڈ، شگر[7] < شوگی، دلیشردن[8] < ویشن، تیتر[9] < توتی، کوپیتر[10] کوتر، ڈُرجے[11] < دور، پرہ[12] < پرے، وانٹک[13] < وانٹ، شکھر[14] < کھر، واس[15] واسہ، لانگلی[16] < لنگی، بل[17] < بلہ، ملو[18] < ملہ، مٹہ[19] < مٹھ، سوشیمہ[20] < سُمہ، کالیبر[21] کالی، ڈانگر[22] < ڈانگر، کاکھ[23] < کاک، کےبگو[24] < کوبی، کرویر[25] < کر، ژرسند[26] زآری، کروال[27] < بالہ، گوتک[28] < گلہ، اکھول[29] < ووکھلی، ویر[30] < بیر، چیکو[31] ژوکی، چمبہ[32] < ژمہ، شالیہ[33] < شالی، گنڈل[34] < گاڑی، جورا[35] < زر، کاچیر[36] کاژر، کھوجک[37] < کھوجی، رم کھر[38] < رمبال، نگرودھ[39] < نگرہ، بودہ[40] < بودھی، چورکا[41] ژور، کلپہ[42] < گلی، کوکلہ[43] < ککلی، کوٹ پال[44] < کوٹھ، بنتھو[45] < برتھ، دتا[46] < دکھ،

---

[1] نیل مت پُران ۹۱۸
[2]، [3] نیل مت پُران ۹۲۱
[4] نیل مت پُران ۹۲۳، ۹۲۵
[5] 〃 ۹۲۵
[6] 〃 ۹۲۷
[7] 〃 ۹۲۸
[8]، [9] 〃 ۹۲۹
[10]، [11] 〃 ۹۳۰
[12] 〃 ۹۳۱
[13] 〃 ۹۳۴
[14] 〃 ۹۲۹
[15] 〃 ۹۳۱
[16]، [17] 〃 ۹۳۹
[18] 〃 ۹۴۱
[19]، [20] 〃 ۹۴۱
[21] 〃 ۹۴۲
[22] 〃 ۹۴۸
[23] 〃 ۹۴۹
[24]، [25] 〃 ۹۴۹
[26]، [27] 〃 ۹۴۹
[28] 〃 ۹۸۰
[29] 〃 ۹۵۰
[30] 〃 ۹۵۲
[31]، [32] 〃 ۹۵۵
[33] 〃 ۹۵۷
[34] 〃 ۹۶۱
[35] 〃 ۹۶۹
[36] 〃 ۹۷۰
[37] 〃 ۹۶۹
[38] 〃 ۹۷۰
[39] 〃 ۹۲۳
[40]، [41] 〃 ۹۷۴
[42]، [43] 〃 ۹۷۸
[44] 〃 ۹۷۷
[45] 〃 ۹۷۸
[46] ۹۸۰

یہ ذاتیں یا کرام لسانی اپ بھرنش کے اعتبار سے اپنے ماخذ سے غیر متشکل ہو گئی ہیں۔ لیکن یہ قدیم تواریخی کڑیوں کو موجودہ دور کے ساتھ جوڑنے کیلئے کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان سماجی پہلوؤں کو زیر نظر رکھتے ہوئے یہ مقالہ تحقیق کے اعتبار سے اپنی نوعیت کا پہلا اور انفرادیت کا حامل ہے۔

اس مقالے میں ناگوں کے کُلہ نام کشمیری کرام (surname) کا لسانی تجزیہ کرنا ممکن ہے مگر کچھ ذاتوں (surname) کا حوالہ پیش کر کے مورخوں کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ ان ماقبل آریہ یا نارڈک ناگوں سے متعلق کشمیر میں بہت سا تاریخی مواد ابھی محفوظ ہے[1] Mr CARLLEYLE کا یہ کہنا کتنا اہم ہے کہ "ناگ نسل کے لوگ کتنے سُلجھے، پُروقار اور قدیم آریہ قوم کے لوگ ہیں جنکا ماقبل آریہ قوموں کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔"

حقیقت میں اوستک آریوں (ایرانی) اور رگویدک آریوں (ہندی) کی تحریک سے بہت پہلے نارڈک ناگوں کے ایک طاقتور گروہ کا پھیلاؤ اور اسکی پیش قدمی مشرقی ہند کی جانب ضرور رہی ہے اس بارے میں دو نظریوں کا ہونا ناممکن ہے۔ ڈاکٹر بی۔ ایس گوہا[2] (Dr B.S. guha) اپنی کتاب RACIAL AFFINITIES OF THE PEOPLE OF INDIA میں نارڈک قوم کے رنگ روپ کے بارے میں رقمطراز ہیں:-

"The Original Nordic Type is Supposed to have beentall. fair skined. yellow or golden haired, an blue eyed"

---

[1] CARLLEYLE: Archalological Survey of India vol VI P. 45 (1871-73)

[2] B.S. Guha census of India 1931 vol I.

نیل مت پران کے مطابق رگویدک برہمن چندر دیو جب راجہ نیل کے پاس پہنچتا ہے تو وہ راجہ نیل کی شکل وصورت دیکھکر راجہ نیل سے ان الفاظ میں مخاطب ہوتا ہے۔ (انیلہ نیترے[1]) نیلی آنکھوں والے (نیلوتھ پل دوتی[2]) نیل کنول کے مانند آنکھوں والے (سوریہ ایوا امبر ستھا[3]) تمہارے جسم کی چمک آسمان میں جگمگاتے سورج کی طرح ہے) (ارچہ ریوہ[4]) تمہارے بال جلتی ہوئی آگ کی لپٹوں کی مانند نیلے پیلے اور سنہرے ہیں) ڈاکٹر بی، ایس گوہا (کی) تحقیق اور چندر برہمن کے مندرجہ بالا الفاظ میں کتنی مطابقت ہے۔ مہابھارت میں نارڈک ناگوں اور رگویدک آریوں کا ریشی آستیک کی وجہ سے تمدنی ملاپ کے بعد ناگوں نے ملی جلی اس تہذیب کو کتنا زرخیز بنا دیا۔ سنسکرت کی چھندوں کو صحیح ترتیب دینے والا ایک ناگ ہی تھا جو کشمیر کی خوبصورت وادی مدھومتی کے کنارے پر رہتا تھا مدھومتی ندی کی الفت میں اس نے ایک چھند کا نام مدھومتی[5] ہی رکھا۔ اس عالم ناگ کا نام پنگل تھا۔ کیونکہ اس کے بال بھورے تھے اور اسکی چھندوں کی اس کتاب کا نام پنگل سوتر ہے۔ دوسرا ناگ پتنجلی تھا جس نے بھارتی یوگ شاستر پر ایک عالمانہ کتاب لکھی اور پانینی کی گرامر پر ایک تبصرہ لکھا۔ جسکا نام مہا بھاشیہ ہے۔ الغرض نارڈک ناگ اور رگویدک آریہ نسلی تمدن اور لسانی تمدن کے لحاظ سے ایک ہی قوم ہے۔ البتہ آبائی وطن سے الگ ہونے میں صرف 'زمان' کا فرق ہے۔

راجہ نیل[6] کا اپنا کنبہ کثیر بھی تھا اور فارغ البال بھی، سیاست اور حکومت کے لحاظ

---

[1] نیل مت پوران ۳۵۸

[2] نیل مت پوران ۳۵۱

[3] 〃 ۳۵۵

[4] 〃 ۳۵۵

[5] پنگل سوتر (نانا گا مدھومتی

[6] راجہ نیل ۴۸۳

سے راجہ نیل ایک کامیاب اور مستحکم حکمران تھا۔ راجہ نیل نے اپنی سلطنت کو چار حصّوں میں منقسم کیا تھا۔ اور مرکزی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔ راجہ نیل کے عہد میں کشمیر کے پورب کا "دِکپال" (PROVINCIAL GORERNOR) بندھوسار[۱] نام کا ناگ تھا اور شمال میں اُتر مانس[۲] ناگ دکپال تھا۔ اور کشمیر کے جنوب میں شری ماڈھک[۳] ناگ سردار دِکپال تھا۔ کشمیر کے مغرب میں دکپال کے عہدے پر کوئی بھی نہیں تھا۔ لہٰذا راجہ نیل نے حکومت کی بھاگ ڈور سنبھالنے کیلئے شٹر نگل نام کے ناگ کو وہاں کا استھان تی District Officer) تعینات کیا تھا۔ لیکن شٹر نگل ناگ نے اپنے عہدے کا ناجائز[۴] استعمال کیا اور کشمیر کے اس مشرقی صوبے کے لوگوں کی عورتوں اور لڑکیوں[۵] کے ساتھ غیر اخلاقی حرکتوں کا ارتکاب کرتا تھا اس وجہ سے لوگوں کے محبوب راجہ نیل نے اپنی محفوظ مرکزی طاقت کے حق سے شٹر نگل کو برطرف[۶] کر دیا اور راجہ نے اسے کشمیر کی سرحد سے باہر چلے جانے کا فرمان جاری کیا۔ اسوقت ایک تو کشمیر کے مشرقی صوبے میں[۷] دِکپال کا عہدہ خالی[۸] تھا اُس پر شٹر نگل کی غیر اخلاقی[۹] حرکات کی بدولت لوگوں میں کافی غصہ اور بے چینی تھی لہٰذا اس کا اثر مرکزی حکومت پر بھی پڑ چکا تھا۔ ان سب واقعات کو حقائق کی کسوٹی پر پرکھ کر ہی راجہ نیل نے شٹر نگل کو برطرف کیا۔ عہدہ سے برطرف ہونے کے بعد شٹر نگل کو راجہ نیل نے جان بخشی تو کر دی لیکن اسے ایسی جگہ پر رہنے کیلئے مجبور کیا جو زرخیز نہ تھی[۱۰]۔ راجہ نیل کے ان محفوظ حاکمانہ حقوق سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ راجہ نیل کے پاس کتنی سیاسی طاقت محفوظ[۱۱] تھی۔ جبکہ

---

[۱] نیل مت پوران ۹۸۴ [۲]، [۳] نیل مت پوران ۹۸۵ [۴] نیل مت پوران ۱۰۰۲
[۵] 〃 ۱۰۰۰ [۶] 〃 ۱۰۰۰ [۷] 〃 ۹۸۶
[۸] 〃 ۹۸۴، ۹۸۵ [۹] 〃 ۱۰۰۲ [۱۰] ۱۰۰۲
[۱۱] 〃 ۹۰۴

شتر نگل کو اپنے کنبہ کے ساتھ مشرق کی طرف سرحد پار کر کے بھاگنا تھا۔ ان حالات میں صوبائی بغاوت کا بے حد خطرہ تھا۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ راجہ نیل کی مرکزی سیاسی طاقت[1] بہت مضبوط تھی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ راجہ نیل کے دورِ حکومت میں جاسوسی کا کافی اچھا انتظام تھا۔ جس کی بدولت اسے شتر نگل کی ساری حرکات کی رپورٹ ملتی تھی۔ اسکے علاوہ راجہ نیل کے پاس فوجی طاقت[2] اتنی مضبوط تھی کہ صوبائی بغاوت کا اندیشہ ہی ٹل گیا۔

راجہ نیل کی حکومت کا ایک باضابطہ لائحہ عمل اور نصب العین تھا۔ کیونکہ نیل مت پران میں /نیلہ بھاشتم/[3]، /نیلہ واکیم/[4] اور /نیلہ چینم/[5] کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ راجہ نیل کا کہا ہوا یا راجہ نیل کا فرمان، رگویدک آریہ چندر برہمن سے معاہدہ کرتے وقت وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جو فرد میرے فرمان کی تعمیل کرتا ہے اُسے /دھنڈشیہ دھارنہ/[6] یعنی اس فرد کو میرے نزدیک سخت سزا نہیں بھگتنی پڑتی ہے۔ اس راجہ ڈنڈھ لفظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ راجہ نیل کے فرمان کو لاگو کرنے کیلئے ایک باقاعدہ مسلح فوج رہی ہو گی۔

راجہ نیل کیلئے کشمیر کی مغربی سرحد کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا اور نہ ہی ایسا قابلِ اعتماد کوئی ناگ سردار ملا جو مغرب کی باگ ڈور سنبھال کر آگے کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے ویدک کھتریوں[7] کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روک سکتا۔ اس لئے کشمیر کا مغربی علاقہ حکومت کے نظام سے بہت ڈھیلا تھا۔ راجہ نیل کی خوش قسمتی سے ان ہی دنوں مہاپدم ناگ[8] نام کے ایک سردار کو لاچار ہو کر اپنے خاندان اور قبیلے کے ساتھ راجہ نیل کے سہارے میں آنا پڑا۔

---

[1] نیل مت پران ۹۰۰، ۹۰۴ [2] نیل مت پران ۹۰۲، ۹۰۴

[3] " ۱۸۱، ۹۰۳، ۹۰۴ [4] " ۹۰۵ [5] نیل مت پران ۹۰۸

[6] " ۹۰۶ [7] " ۱۰۰۴ [8] " ۹۹۵

بے چارہ مہاپدم اپنے سوتیلے بھائیوں کے لگاتار حملوں کی وجہ سے تنگ آچکا تھا اور اپنے قبیلے میں بدنام[۱] بھی ہو چکا تھا۔ اس لئے آخر میں اُس نے اپنے خاندان اور قبیلے کو ساتھ لیکر بھاگنا پڑا ناگ سردار مہاپدم کو یقین تھا کہ راجہ نیل ایک طاقتور حکمران[۲] ہونے کیوجہ سے اسے پناہ دے گا اور اسی اعتماد کی بنا پر وہ راجہ نیل کے پاس آیا۔

ناگ سردار مہاپدم کی ساری آپ بیتی[۳] سننے کے بعد باشعور سیاستدان راجہ نیل نے اس کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ایک ماہر سیاستدان[۴] کی حیثیت سے راجہ نیل نے ناگ سردار مہاپدم کو یہ کہکر ٹال دیا کہ کشمیر میں تِل دھرنے[۵] کیلئے بھی جگہ نہیں اور مہاپدم ناگ کا کنبہ اور خاندان اتنا بڑا[۶] ہے کہ اس کیلئے زمین مہیا کرنا ناممکن ہے۔ چالاک راجہ نیل اس حقیقت سے آشنا ہو چکا کہ ناگ سردار مہاپدم اپنی آبائی جگہ سے اکھڑ چکا[۷] ہے اب اس کا واپس لوٹنا ممکن بھی نہیں ہے خاص کر جب کہ مہاپدم ناگ اپنے کنبے اور قبیلے[۸] کے ساتھ یہاں آپہنچا ہے اگر اکیلا آیا ہوتا تو ظاہر ہے لوٹ جانا آسان تھا۔ مگر ان حالات میں جب کہ ناگ سردار اپنے دَل بَل کے ساتھ[۹] آیا ہے لوٹنا آسان نہیں ہے۔

راجہ نیل ایک کھلی ہوئی کتاب[۱۰] کی طرح کسی شخص کو پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس ڈھنگ سے مہاپدم ناگ کے نفسیاتی ردعمل کو بھانپ کر اس نے اندازہ لگایا کہ مہاپدم ناگ کو اس مجبوری کے عالم میں کہیں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا راجہ نیل نے بات چیت کا دوسرا دور شروع کیا۔ حقیقت میں بات چیت کا دوسرا دور کچھ نیا نہیں تھا۔ بلکہ کشمیر کے مغربی صوبے میں دِکپال کے عہدے کی خاطر اسے تعینات کرنیکا منصوبہ تھا۔ کیونکہ کشمیر کے

---

[۱] نیل مت پوران ۹۹۴

[۲] نیل مت پوران ۹۹۵

[۳] نیل مت پوران ۹۹۳ ۹۹۴

[۴] ,, ۹۹۹

[۵] [۶] ,, ۹۹۷

[۷] ,, ۹۹۵

[۸] [۹] ,, ۹۹۹

[۱۰] ,, ۳۶۱

غرب تمام آریہ درتی[1] راجہ وِشوگشو اپنی سرحدیں پھیلا رہا تھا۔ سب سے بڑا کھٹکا راجہ نیل کو یہ بھی تھا کہ کہیں برطرف کئے گئے ناگ سردار سُشرونگل ویدک راجہ وِشوگشو سے مل کر کشمیر پر حملہ نہ کرے۔ ان حالات کے پیش نظر راجہ نیل کو اپنی مرکزی افواج[2] کو ساتھ لیکر خود جنگ میں الجھنا پڑا۔ ان حقائق کا علحٰدہ علحٰدہ تجزیہ کرنے کے بعد راجہ نیل نے ناگ سردار مہاپدم کو پناہ دینے کی کسی حد تک حامی بھر لی[3]۔ اس دوسری چال سے نیل کا اصلی مقصد اور مدعا یہ تھا کہ مہاپدم ناگ ایک ویدک برہمن کی بھیس[4] میں آریہ درتی راجہ وِشوگشو کے پاس جاکر اپنے کنبے[5] کے لئے دھرتی کی بھیک مانگے۔ راجہ نیل اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ آریہ ورتی راجہ وِشوگشو[6] برہمن کے بھیس میں آئے ہوئے ناگ سردار مہاپدم کی "بھومی بھکشا" کو ٹھکرا نہیں سکتا۔ اور مہاپدم ناگ سردار ایک بناوٹی[7] برہمن کو اس بات کا احساس نہیں دلانا ہوگا کہ اسکا قبیلہ کتنا ہے۔ راجہ وِشوگشو بھومی دان (Land grant) لیتے کے بعد مہاپدم ناگ کو وِشوگشو سے ناگ سیاست[8] کے مطابق راجہ کو سمجھانا ہوگا کہ اسکا قبیلہ[9] ہزاروں کی تعداد میں ہے۔ اگر راجہ وِشوگشو اپنی اوقات کے مطابق ملک سے ہٹتا ہے تو ٹھیک ورنہ ناگ سردار مہاپدم کو اپنے قبیلے کی طاقت سے راجہ پر حملہ کرنا[10] ہوگا۔ راجہ نیل کی اس سکیم کے مطابق ناگ سردار مہاپدم کو دونوں حالات میں راجہ وِشوگشو کو اس بات کا لالچ دینا ہوگا کہ وہ (مہاپدم ناگ[11]) راجہ وشوگشو کو اس بات کی رعایت دیتا ہے کہ وہ اپنے کنبے[12] ہاتھی گھوڑے، خزانے وزیر اور رعایا کے سمیت مغرب کی جانب پیچھے کھسک جائے

---

[1] نیل مت پران ۱۰۰۴ [2] نیل مت پران ۱۰۱۰ [3] نیل مت پران ۹۹۷
[4] " ۱۰۱۱ [5] " ۱۰۱۳ [6] " ۱۱۴
[7] " ۱۰۰۹ [8] " ۱۰۱۵ [9] " ۱۰۱۷
[10] " ۱۰۱۰ [11] " ۱۰۱۶ [12] " ۱۰۱۸

راجہ نیل[1] نے اس ساری سیاسی چال کی باریکیوں سے مہاپدم ناگ کو آگاہ کرنے کے بعد منصوبہ کی تکمیل پر مامور کر دیا ناگ سردار مہاپدم[2] نے بھی راجہ وِشوگشو کے دربار میں اسی حکمت عملی سے کام لیا جس کے بارے میں راجہ نیل نے اسے سمجھایا تھا۔ راجہ نیل کے سیاسی داؤ پیچ اور چالاکیوں کے مطابق مہاپدم ناگ کو منصوبہ میں کامیابی حاصل ہوئی اور آریہ ورتی راجہ وشوگشو کو مغرب[3] سے پیچھے ہٹنا پڑا اور اس نے پیچھے ہٹ کر ایک نئی بستی وشوگشوپُر بسائی اور ناگ سردار مہاپدم مغربی کشمیر کا صوبائی گورنر (دِکپال) تعینات ہوا۔ اس طرح راجہ نیل نے کشمیر کے مغرب میں پیدا ہونے والے مشکل حالات کو آسان بنا کر اپنی سلطنت میں مزید استحکام پیدا کیا۔

راجہ نیل کے وقت میں کشمیر[4] کی طرز حکومت سیاسی حقوق کے اعتبار سے ترقی یافتہ اور مضبوط تھی۔ راجہ کو "راشٹر دھپتی" Absolute Head Of The State کہتے تھے راشٹر پتی[5] کے دو اعلیٰ آفیسر ہوا کرتے تھے۔ (۱) دکھشنیہ کھیتر دِہپتی Right Wing Chief Authority اور (۲) سَوَیہ کھیتر دِہپتی Left Wing Chief Authority Chief Athority کھیتر دہپتی کے نیچے (۳) دِکپال[6] Provincial GOVERNOR ہوتے تھے ان کی تعداد چار ہوتی تھی اور انکی تقسیم چار اطراف ہوا کرتی تھی۔ دِکپال[7] Provinaial Governor کے نیچے (۴) ستھان پال[8] District Authority کا عہدہ ہوتا تھا۔ انکی تعداد لگ بھگ سولہ ہوا کرتی تھی۔ ستھان پال کے نیچے (۵) کھیتر پتی Land Lord ہوتے

---

[1] نیل مت پوران ۱۰۰۷ [2] نیل مت پوران ۱۰۱۲ [3] نیل مت پوران ۱۰۱۹

[4] و [5] کاشمیرک کرم کانڈ۔ ص ۲۳

[6] نیل مت پوران - ۹۸۴، ۹۸۵

[7] " - ۱۰۰۲

تھے اسکا براہ راست نیل مت پران میں حوالہ نہیں ملتا ہے کیونکہ کھیتر پتی[1] Landlord سرکاری مشین کا اہم پرزہ ہونے کے باوجود بھی حکومت کی ژرف سے دی گئی عہدہ داری میں شامل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ (۶) کھیتر پال[2] (Revinue Collector) دِرکپال[3] (Provencial Governor) اور ستھان پال[4] District Authority کے بعد کھیتر پال[5] (Revinue Collector) کا عہدہ نہایت اہم سمجھا جاتا تھا کیونکہ حکومت کے بنیادی ڈھانچے کا سارا دارومدار آمدنی پر ہوتا تھا۔ کھیتر پال کے ماتحت (۷) کینگر[6] Subordinate Officials of Various Government Activities، ہوا کرتے تھے۔ انکی تعداد بہت زیادہ ہوا کرتی تھی کیونکہ سرکاری ڈھانچہ ان ہی کے کندھوں پر ہوا کرتا تھا۔ راجہ نیل کی حکومت کا استحکام اور اس کی جہانبانی اور سیاسی شعور کا اندازہ حکومت کے اس ڈھانچے سے لگایا جاسکتا ہے۔

---

[1] لوگاکشیہ ویدک سنگرہ ص ۹۴

[2] " ص ۹۴

[3] نیل مت پران ص ۹۸۴، ۹۸۵

[4] " ص ۱۰۰۲

[5] لوگاکشیہ ویدک سنگرہ ص ۹۴

[6] کاشمیرک کرم کانڈ ص ۲۳

راجہ نیل کی حکومت کا ڈھانچہ

"Administrative Set UP of The King Neel"

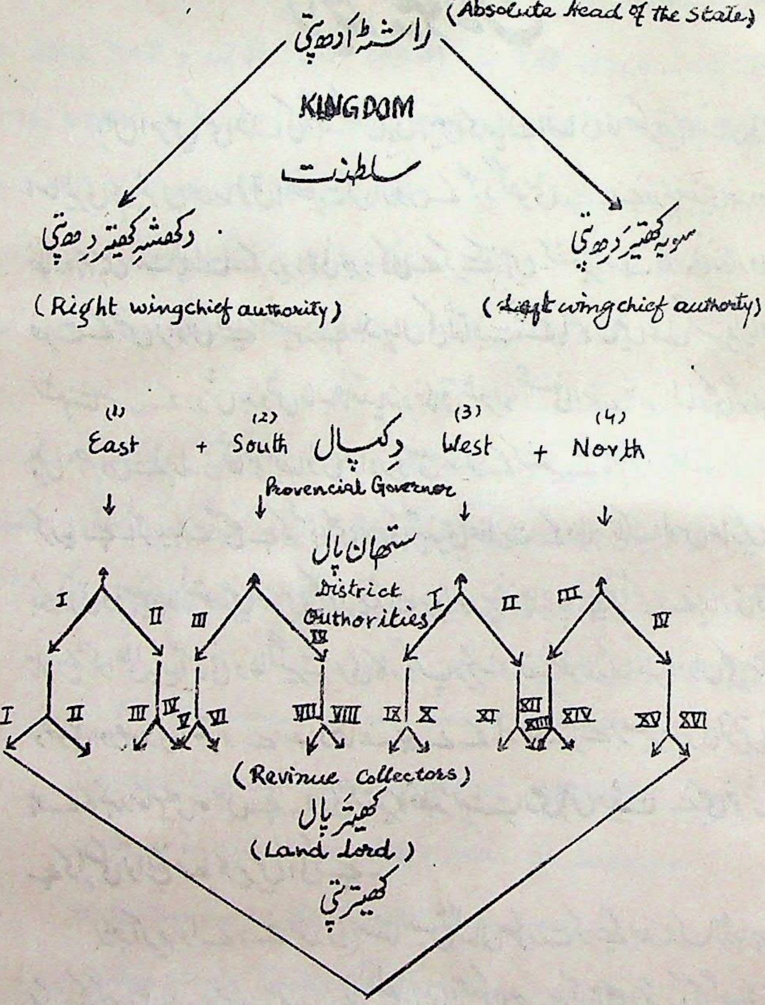
(Absolute Head of the State)
راشٹر ادھپتی
KINGDOM
سلطنت
دکھشِ کھیترِ دھپتی
(Right wingchief authority)
سویہ کھیترِ دھپتی
(Left wingchief authority)
(1) East
+
(2) South
دِکپال
(3) West
+
(4) North
Provencial Governor
ستھان پال
District
Outhorities
I
II
III
IV
I
II
III
IV
I
II
III
IV
V
VI
VII
VIII
IX
X
XI
XII
XIII
XIV
XV
XVI
(Revinue Collectors)
کھیتر پال
(Land lord)
کھیترپتی

Sub-ordinate officials of various activities of the Government. کپنکر

ہسول پونیر

راجہ میگواہن

اِس امر میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں کہ حیاتِ انسانی خاصکر قدیم انسان کی زندگی اساطیری کہانیوں اور ما فوق الفطرت کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ اپنے قدیم تہذیبی خدوخال کا نظارہ ہم نیل مت پوران کے دیومالائی جھروکوں سے کر سکتے ہیں۔ کشمیر نہ صرف قدرتی نظاروں اور فطرت کے حسن فراواں کیلئے مشہور ہے بلکہ یہاں کی ثقافت کے بانیوں میں عدل گستر راجاؤں اور شہنشاہوں کے دوش بدوش مابہ الامتیاز و خلاق شعراء، فلسفی، مورخ اور اطباء بھی گزرے ہیں، جنہوں نے ہماری ثقافتی فضاؤں کو اور وسیع تر کر کے کشمیر کے نام کو درخشندہ و تابندہ کر دیا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ کسی بھی قوم کی تہذیبی عظمت کے مظاہر فلک بوس عمارتیں نہیں بلکہ خلاق و ذہین دانشور ہیں تو ہمیں کلہن پنڈت پر بجا طور پر فخر ہونا چاہیئے کہ اُس نے ہماری قدیم تاریخ کو اعلیٰ پایہ آفاقی و عالمگیر شاعری کا روپ دیکر نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ جاوداں بھی بنا دیا۔ موضوعی اور صوری اعتبار سے متضاد متخالف ہونے کے باوصف اِسے برصغیر ہند کی اولیں تاریخ ہونے کا بلند مقام بھی حاصل ہے۔ وادیٔ کشمیر کا قطعہ بہشتِ ارضی اِس حیثیت سے بھی خوش بخت ہے کہ اِسکی تواریخ ضبطِ تحریر میں آئی ہے۔

راجہ آگریہ رائے (جے یندرا) سنتالیس ۴۷ سال حکومت کرنیکے بعد تارک الدنیا ہو کے بمہ زو کی گپھا میں اپنے چیلوں سمیت غار نشین ہوا، جسکی وجہ سے آج بھی بُمہ زُو کی گپھا کو غارِ آری رائے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ راجہ آگریہ رائے (جے یندرا) کی شرافت نفسی اور خلوت پسند و سکون جو یا اُفتادِ طبع کی وجہ سے رعایا کو کبھی آرام میسر نہ ہوا اور نا ہی امور سلطنت میں کوئی بہتری آئی۔ اس لئے وہ بالآخر ایک اداکار کی حیثیت سے حکومت و سلطنت کے

سٹیج پر مدتِ مدید کیلئے فخریہ رول ادا کرکے چل دیا۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ تخت و تاج چھوڑنے تک بھی تماشہ بینوں کی دلچسپی کا مرکز رہا۔"

"LIKE AN ACTOR WHILE I PLAYED MY PART PROUDLY FOR A LONG TIME, UPON THE STAGE OF THE REALM .... UNTO THE VERY DENOUEMENT THE SPECTATORS FORTUNATELY DID NOT LOOSE INTEREST"[1]

زندگی ایک سٹیج ہے اور ہم سب اسکے اداکار ہیں۔ کلہن کی جدو بیانی کی وجہ سے جملہ انسانی کوتاہیوں کے باوجود کشمیر کے راجے مہاراجے پست فطرت پیکروں کے روپ میں ہمارے سامنے نہیں آتے۔

کلہن میگھواہن کو گوانندا خاندان کے اولادوں میں شمار کرکے کہتا ہے کہ قندہار کے بادشاہ کی سرپرستی میں یدھشٹر کا پڑپوتا گویا تیار رہتا تھا تاکہ وہ اسی کی رہنمائی میں سلطنتِ کشمیر کو اپنے زیرِ نگین کر سکے۔ قندہار میں اپنے قیام کے دوران اسکے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جو کئی ناقابل تسخیر الوہی صفات کا مالک تھا۔

> For This time The great Son of Yudhisthira named Gopaditya was kept as a protage with a view to gain victory over the sovereign of kashmir by the king of Gandhara.
>
> This prince while residing there without securing imperial power in course of time had a son who had the infallible divine marks.[2]

---

[1] Kalhans Rajtarangni:- Tarang II :V: 156: Eng: Translation: R.S.Pandit

[2] Ibid.: V: 145-146

گوپادتیا کا یہی جوان بیٹا پراگ جیوتشا[۳۱] کی شہزادی امرت لیکھا کے سوئم ور کی رسم میں شرکت کرتا ہے، جہاں شہزادی امرت لیکھا اُسے شوہر کے طور چن لیتی ہے۔ اسکے سر سایۂ ابر کا ہونا اس کے نظرِ انتخاب کا مرکز بنتا ہے۔

"That youth at the behest of his father proceeded to the realm of the ruler of Pragjyotisa descended from the line of visnu during the Svayamvara of his maiden daughter. There with the parasol varuna to shade him in the presence of rajahs the Royal maiden Amritalekha hououred him with the garland of the chosen one"[۳۲]

.... انہی آسمانی صفات کی بناء پر راجہ آریہ راجہ کی رعایا میگھواہن کے ابر گوہر بار کی منتظر تھی۔ آخر کار وہ گھڑی آن پہنچی جب اس کے وزراء اسے کشمیر آ کے گدی سنبھالنے کی دعوت دیتے ہیں اور اسطرح وہ چوبیس ۲۴ قبل مسیح میں تخت نشین ہوتا ہے[۳۳]۔ مؤرخ حسن میگواہن کے بارے میں رقمطراز ہے کہ "می گویند کہ سایۂ ابر ہمیشہ بر سرِ او بود و بوقتِ بارش کالای او تر نمی شد۔ موجب آں اورا میگواہن می گفتند"، میگ بمعنی "ابر" واہن بمعنی "سواری"، یہ دونوں لفظ سنسکرت زبان کے ہیں، ژند اوستا اور پہلوی زبان میں بھی بادل یا ابر کے لئے میغ برتتے تھے۔ "بادل کی سواری" ہونے کے کارن وہ بارش کی صعوبتوں سے بچ جاتا تھا۔ یہی ہے وہ درویش صفت عدم تشدد کا پیکر جو چھتیس ۳۶ سال کشمیر پر حکومت کرتا ہے۔

---

[۳۱] وشنو پران کے مطابق پراگ جیوتشا آج کے آسام کی راجدھانی تھی۔

[۳۲] Kalhans Rajtarangni: Tarang II V: 147-148: Eng Translation R.S. Pandit.

[۳۳] مؤرخ حسن اسے سنِ جلوس ۳۴ مانتا ہے۔

دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر یہاں بھی حیوانی قربانیوں کے دوش بدوش انسانی قربانیوں کا رواج تھا۔ میگواہن نے پہلی بار چوپائیوں کو ذبح کرنا ممنوع قرار دیا بدھ مت کے عروج کے باوجود یہاں گاؤ کُشی جاری تھی۔ اس بات کا جگہ جگہ اعلان کیا گیا کہ گاؤ کُشی و دیگر چوپائیوں کو ذبح کرنا قانوناً جائز نہیں۔ قصائیوں اور گوشت کا کاروبار کرنے والے دوسرے لوگ بے کار ہوئے، میگواہن نے اُن پر جبر و ظلم روا نہیں رکھا، اس نے انہیں اپنے خزانے سے روپیہ پیسہ فراہم کیا تاکہ وہ روزگار کے دوسرے ذرائع تلاش کر سکیں۔ رہے دیوی دیوتاؤں کے نام چڑھاوے، اُن کے لئے مکھن میں ڈبوئی ہوئی حیوانی پُتلیاں جائز قرار دی گئیں۔ یہی نہیں کسی بھی جاندار کے درپے آزار رہنا عدم تشدد کے اصول کے خلاف عمل تصور کیا گیا۔ میگواہن کے عہد کو بجا طور پر عدل و انصاف کا عہد قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ بھیس بدل کر رعایا کی عام زندگی اور مُلکی حالات کا جائزہ لیتا تھا۔ ایک دن ایسے ہی گشت کے دوران راجہ کے کانوں میں زور سے چور! چور! کی آواز آئی۔ کوئی حاضر ہے جو چور کو پکڑے؟ راجہ نے حکم دیا۔ شور و غُل تو تھم گیا، لیکن کوئی چور نظر نہ آیا۔ اور کئی دِن گزرنے کے بعد راجہ کا پھر وہاں سے گزر ہوا۔

تین پری چہرہ عورتیں اُس کے سامنے نمودار ہوئیں اور دست بستہ التجائیں کرنے لگیں کہ "اے جہاں پناہ! عفو و رحم کے پیکر، تمہارے ہوتے ہوئے خوف و دہشت کا وجود باقی رہنا محال ہے۔ اسوقت جب ہمارے ناگا شوہر بادل کی صورت فضاؤں میں پھیلے تھے، تو کسانوں نے صرف اس خوف سے کہ کہیں وہ اُن کی فصلوں کو نقصان نہ پہنچائیں چور چور! چلانا شروع کیا۔ آپ کے چین بجبین ہونے پر انہیں گرفتار کیا گیا۔ کیا ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ اب وہ رہا کئے جائیں گے۔ ناگاؤں کی پری وش بیویوں کی فریاد سُنکر راجہ میگواہن کا دل پسیج گیا اور اس نے اُنکی رہائی کا حکم دیا"[1] ازاں بعد راجہ میگواہن تشدد، ظلم و جبر اور اذیت پسندی کا قلع قمع کرنے کیلئے، سلطنت کشمیر کی سرحدوں کو پھاندتے ہوئے برصغیر ہند و لنکا کو مطیع کرنے چلا۔ اسکے قدموں کو کامیابی و کامرانی نے چوما، جہاں کوئی اس سے منحرف ہوا

1, Raj Tarangni, Kalhan Eng Translation R.S Pandit. III V 21 TO 25

تو وہ قدرت کے ہاتھوں زمین بوس ہو گیا۔ یہ ہے اپنے آپ اپنے نفس پر قابو پانے اور فتحیاب ہونے کی کرشمہ سازیاں، جو راجہ میگواہن کے عزمِ صمیم میں جلوہ گر ہوئیں۔ ایسی ہی عالمِ تشدد مُہم جوئی کے دوران، راجہ کسی جنگل سے ہوتے ہوئے سمندر پار کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اُس کے کانوں میں ایک درد بھری آواز آئی "مجھے میگواہن کے عہدِ عدل میں مارا جا رہا ہے، مجھے میگواہن کے عہدِ عدل میں قتل کیا جا رہا ہے"۔ راجہ کے دل کو جیسے آتشین بھالا چُبھ گیا۔ وہ جھٹ ابر کی سواری پر اُس طرف چل دیا جہاں سے یہ دردانگیز آواز آئی تھی۔ اُس نے کیا دیکھا کہ چنڈکا کے مندر میں ایک آدمی گردن جھکائے، شبارا جنگجو قبیلہ کے لیڈر کے ہاتھوں جان سے ہاتھ دھونے کیلئے بادلِ ناخواستہ کھڑا تھا۔ راجہ کے خوف سے شبرا قبیلہ کا سردار کانپتے ہوئے بولا "کہ میرا بیٹا بسترِ مرگ پر ہے، اور اس انسانی قربانی سے اُسکی جان بچ سکتی ہے"۔[1]

راجہ میگواہن پُر وقار لہجے میں بول اُٹھا "تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس بے گناہ کی قربانی کا مطلب اُسکی فوری موت ہے، لیکن اِسکے احباب و اقارب مستقل عذاب میں گرفتار ہونگے۔ قبیلے کا سردار پھر مُلتجی ہوا کہ "میرے بچے کو بھی کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کے بھی رشتہ دار ہیں"۔ راجہ میگواہن پُرجلال لہجے میں پھر بولا "اے کِرتاش[2] حواس باختہ مت ہو جا، میں تمہارے بیٹے کو اپنی جان دیکر چنڈکا کے نذر کر کے بچاؤنگا۔ اس لئے مجھے اور میرے اِن دو رفیقوں پر قاتلانہ حملہ کر کے اپنی انسانی قربانی کی رسم پوری کر لو"۔ پہاڑی قبیلہ کا سردار راجہ کو ایسا کرنے سے باز رکھنا چاہتا ہے کیونکہ پرجا اور اُسکے عدل گستر خاندان کو اُسکی اشد ضرورت ہے۔ یہاں پر کلہن کا زورِ قلم فطری انسانی کوتاہیوں

---

[1] RAJTARANGNI: KALHAN: Eng Translation R.S. PANDIT
T: III V 30-35 P-71

[2] مؤرخ حسن نے شبارا اور کِرتاش کی جگہ برہمن لکھا ہے۔ یہ لوگ وندھیا اور راجپوتانہ کے پہاڑی (مقامی) قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔

سے پردہ ہٹاتے ہوئے راجہ سے یہ تلخ حقیقت آشکارا کراتا ہے۔ "نہ ہی جاہ و حشم، عیش تنعم، شان و شوکت، دولت و ثروت، چہیتی بیویاں، لاڈلے شہزادے، نہ احباب اور نہ ہی قوانین زندہ رہنے کی تمنا پوری کرنے میں بادشاہوں کے کام آتے ہیں۔"

پہاڑی قبیلہ کا سردار پھر بھی راجہ میگواہن کو اپنی جانی قربانی سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن امن و شانتی کا مجسمہ بالآخر اپنی ہی تلوار سے اپنا کام تمام کرنے کیلئے ہاتھ اٹھانے والا ہی تھا کہ آکاش کی پھول مالاؤں نے اُسکے سر کو ڈھانپ لیا اور ایک نورانی پیکر اُس کے سامنے آموجود ہوا، جس نے اُسکے ہاتھوں کو روک لیا۔ اُس نورانی پیکر کے بغیر اسکے سامنے اور کوئی صورت موجود نہ تھی۔ نورانی شخص نے اُسے اِس حقیقت سے بھی آگاہ کیا کہ یہ سب کچھ تمہارے بلند و ارفع ارادوں کی آزمائش کے سوا اور کچھ نہ تھا[1]۔ مؤرخ حسن اسی واقعہ کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے "شخصے روحانی پیدا شدہ، راجہ بگرفتہ از کشتن خودش باز داشت؛ دراں آں ہمہ کساں از نظر راجہ غائب شدند، و راجہ در ورطۂ حیرت افتادہ آں شخص روحانی گفت کہ ایں جماعہ از عالم غیب برائے امتحان تو آمدہ بودند و منم موکل بجارہ اظہار شفقت رحمتِ تو بر خلقِ خدا دیدہ مطیع و معتقد گشتم اکنوں مرادے خود از من بخواہ[2]" وہ اُسے یہ بھی بتاتا کہ تمہارے پیشرو واسوکول[3] نے جانداروں کی زندگیاں لی تھی اور تم عدم تشدد سے اُسکا کفارہ کئے جا رہے ہو۔ انسانی فطرت بھی ایک عجیب شے ہے، اسی خاندان سے انتہائی ظالم و جابر حکمران بھی پیدا ہوا اور عدل گستری و عدم تشدد کا سہرا بھی اسی کے سر بندھے۔ یہاں انسانی لاشعور کی کارفرمائی ہے جو بالآخر میگواہن کا روپ دھار لیتی ہے اور کائنات کے غیر مرئی قوانین بھی انسانی دکھوں کا مداوا بنتے ہیں۔

---

[1] راج ترنگنی۔ کلہن ترنگ۔ سوئم، انگریزی ترجمہ آر، ایس، پنڈت

[2] تاریخ حسن۔ جلد۔ دوئم۔ صفحہ ۶۰ –

[3] واسوکول ۷۶ ق م سے ساٹھ سال کے لئے کشمیر کا حکمران رہا۔ اسکے بعد مہر کل نے ستر سال حکومت کی جسمیں تین کروڑ لوگ قتل کئے۔

ایک دن ایک برہمن اپنا اکلوتا علیل و نحیف بیٹا گود میں لئے بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر مؤدبانہ عرض کرنے لگا کہ میرا یہ لختِ جگر مدتِ مدید سے بیمار چلا آ رہا ہے، نجومیوں کا کہنا ہے کہ چوپائے کی قربانی کے بغیر اسکا روگ دُور نہیں ہو سکتا۔ چونکہ حیوانات کا ذبح کرنا ممنوع ہے اسلئے قیمتی انسانی جان ضائع ہونیکا احتمال ہے۔ راجہ نے برہمن کی فریاد غور سے سُنی اور جواب کل تک اُٹھا رکھا۔ اس نے ساری رات اِسی معاملہ کے بارے میں سوچ سوچ کے گذار دی، آخرکار وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ میری یہ پیاری جان کبھی اک دن جانی ہے کیوں نہ اسے برہمن زادہ کی نذر کیا جائے اور برہمن کے لئے دُرگا کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ صُبح جب برہمن بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے اُسے اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا کہ وہ ایک چوپائے کی جان کے بدلے میری جان لے سکتا ہے۔ برہمن نے التجا کی کہ اے جہاں پناہ کہ یہ فعل کسی کو پسند نہیں ہوگا۔ بادشاہ نے اپنی تلوار سے اپنا سر قلم کرنے کیلئے ہاتھ اُٹھائے۔ وہ وار کرنے کو ہی تھا کہ ایک نورانی شخص نمودار ہوا اور اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ روحانی پیکر نے اُسکی (راجہ کی) علو ہمتی کو خراج تحسین ادا کیا۔ رضائے خالقِ خلق سے برہمن زادہ بھی رو بہ صحت ہوا۔ راجہ میگواہن کی عزت و توقیر اور بڑھی[1]۔

کلہن نے اِس کے برعکس لکھا ہے کہ اُسے دُرگا نے اپنی جان برہمن زادے کی نذر کرنے سے باز رکھا اور اُسکی راجہ میگواہن کی رحم دلی و عالی ہمتی کو دیکھتے ہوئے برہمن کے لاڈلے اکلوتے بیٹے کو چاک و چوبند کر دیا۔ کچھ بھی ہو دونوں صورتوں میں فطرت کی غیر مرئی قوتوں کو متصف کرنے میں انسانی ذہن کی اختراعی صلاحتیں کارفرما ہیں۔

ایک دن راجہ میگواہن ولر کی سیر کر رہا تھا کہ بادِ صرصر نے کشتی کو آگھیرا اور بادشاہ کے ڈوب جانے کا خطرہ پیدا ہوا۔ سانپوں کی بھاری تعداد دریں اثنا نمودار ہوئی جنہوں نے کشتی کو صحیح سلامت کنارے لگایا۔

مارواڑ کا راجہ، میگواہن کی اطاعت سے منحرف ہو کے، جانور کُشی میں مصروف ہوا۔ راجہ میگواہن

---

[1] تاریخ حسن۔ جلد دوئم ص ۲۵

نے اسکی اطلاع پاکر اسے راہِ راست پر لانے کی ٹھانی۔ شاہی لشکر کو پانی کی قلت کا سامنا ہوا۔ ناگاہ، ناگوں کی بھاری تعداد سانپوں کی صورت میں حاضر ہوئی اور اَن گنت چشمے پھوٹ پڑے کہ طغیانی آگئی سارا لشکر سیراب ہو کر آگے بڑھتا گیا۔ راجہ مارواڑ کو گرفتار کیا گیا۔ مارواڑ کو اپنے قبضہ میں کر کے راجہ میگواہن نے سورت کا رُخ کیا، اور قنوج کو بھی فتح کیا۔

راجہ میگواھن بدھ مت کا سچا پیرو تھا، جس نے اپنی تمام تر قوت عوام کی فلاح و بہبود اور بدھ مت کی اشاعت کیلئے وقف رکھی۔ اس نے بودھ بھکشوؤں کی سہولیات کے لئے میگواہن۔ میگہ گام و میگہ مٹ نامی وہار تعمیر کرائے۔

راجہ میگواھن کی رانیاں کسی طرح پیچھے نہیں رہیں امرتا پربھا نے امرتا بھون، نام کا فلک بوس وہار تعمیر کرایا۔ راجہ میگواہن نے اپنے والد گوپادتیا کے بدیشی گرو، لوُ کے نام سے "لوسٹونپا"، نامی سٹوپا بھی تعمیر کیا۔

"ننده ون"، میں راجہ کی ایک اور رانی یوکا دیوی نے ایک اور وہار یادگار کے طور چھوڑا۔

رانی اندرا دیوی نے اپنے نام سے ایک چوگوشہ عالی شان محل اور سٹوپا تعمیر کرایا۔ اُس کی دوسری رانیوں کھادنا اور سما نے بھی اپنے ناموں سے یادگاری وہار بنوائے[1]

راجہ میگواھن کی عملی زندگی حکمتِ عملی اور اس کے حُسنِ تدبّر سے یہی عیاں ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ ذہنی و روحانی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ بُدھ مت عرفانِ ذات کے سوا جملہ رسومات سے عبادات کو پاک و مبرا گردانتا ہے لیکن صدیوں پُرانے اِنسانی اور اجتماعی لاشعور کی مضبوط گرفت کا کیا کیا جائے کہ راجہ کو بھی دیوی دیوتاؤں کے قہر سے بچانے کیلئے پرجا کی خاطر اپنی قیمتی جان بھی کئی دفعہ قربانی کے طور پیش کرنا پڑی۔ حسنِ اتفاق سے وہ ہر بار سرخرو ہو کر بچ نکلے۔

سرکاری سرپرستی کسی بھی مذہب یا تحریک کی اشاعت کیلئے نہایت ہی کارآمد اور مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ مثبت ذرائع اور وسائل سے کام لیا جائے تو عوامی ایجاب و القان کے وسیع تر امکانات بڑھ

---

[1] راج ترنگنی۔ کلہن انگریزی ترجمہ۔ آر۔ ایس پنڈت۔ ترنگ۔ ۳۔ صفحہ۔ ۶۹۔

جاتے ہیں۔ راجہ میگواہن بدھ مت کے مسلک اہنسا کو عام کرنے میں تا دمِ آخر سرگرمِ عمل رہا۔ راجہ کے بارے میں اور بھی کئی محیر العقول روایتیں عام ہیں، جنہیں تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

راجہ میگواہن کی بظاہر معجز نما شخصیت صحیح معنوں میں ذوقِ عمل و عرفان کا پیکر تھی، جسنے عدم تشدد کے مبنی بر صداقت اصولوں کو قائم و دائم رکھنے کیلئے تشدد سے کام لیا لیکن اپنی ذات کو اس سے ملوث ہونے نہ دیا۔ کلہن نے میگواہن کی فتوحات کا ذکر خیر تو کیا ہے لیکن اس نے تشدد کو محیر العقول واقعات کا روپ دیا ہے جو اسکی جادو بیانی سے سچے دکھائی دیتے ہیں۔

راجہ میگواہن راہبانہ زندگی کا پرچارک یا سرپرست نہیں تھا بلکہ وہ خالقِ کائنات کی نعمتوں سے فیضیاب ہونے کا قائل بھی تھا۔ یہ بات اس لئے پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اسکی کئی بیویاں تھیں جن کے بطن سے اسکے کئی بچے بھی تھے، جو ایک عالی شان وہار میں پرورش پاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گونندا خاندان کی حکومت میگواہن کے بعد پونے چھ سو سال قائم رہی۔

کوئی بھی رسم، رواج پانے سے سماجی قانون کی حیثیت حاصل کرتی ہے۔ اسی طرح عوامی خواہشات کے عین مطابق لاگو کیا گیا قانون اجتماعی طور فطرتِ ثانیہ کی صورت میں ہماری رہنما ہے۔ گو کہ مدنی و تہذیبی سطح پر تبدیلیاں جاری رہتی ہیں۔ عدم تشدد اور اہنسا کے زریں اصولِ انسانی سماج کی خاطر پہلے بھی مشعلِ راہ کا کام دے چکے ہیں اور آج بھی روپ بدل بدل کر انہیں بنی نوعِ انسان کے دکھوں کا مداوا سمجھا جاتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ہماری حریص و بوالہوس نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہیں۔۔۔۔ جسکا نتیجہ رنگ و نسل اور مذاہب پر مبنی قوموں اور قومیتوں کے باہمی تحارب و تصادم کی بھیانک صورت اختیار کرتا رہتا ہے۔ کوئی بھی صورت کسی خاک میں پنہاں صورت کا متبادل نہیں ہو سکتی۔ میگواہن کی عدم آزار و اہنسا کی روشن کی ہوئی قندیل آج بھی فروزاں ہے، اسکے آباء و اجداد نا مساعد سیاسی حالات کی وجہ سے قندھار[۱] میں پناہ

---

[۱] داری کابل تقریباً ایک ہزار سال تک بدھ مذہب کا گہوارہ رہی رگ وید اور اوستا کے مطابق قندھار (مشرقی افغانستان) ہند آریا اور ایرانیوں کی ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کا اہم مرکز رہا ہے۔ راج ترنگنی۔ کلہن۔ انگریزی ترجمہ۔ آر۔ ایس۔ پنڈت۔ صفحہ ۲۸ (III XXV) اور ۴۲-۶۸))

لینے پر مجبور ہوئے تھے۔ لیکن قریباً دوسو سال گزرنے کے بعد وہ پھر وطن مالوف کو لوٹ آتا ہے اور ایک عہد ساز شخصیت کا روپ دھار کر حسین و جمیل انسانی سماج کے خواب بنتا ہے، شاید اسی لئے میر کو کہنا پڑا ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

مشاہیر نمبر (ہمارا ادب)

ترتیب :- رشید نازکی

ریاست جموں و کشمیر کے ۳۴ علما، ادبا، مورخین اور مشائخ کا مکمل تذکرہ ۔ کتاب میں شامل ہر مضمون اپنی جگہ ایک دستاویز کی اہمیت رکھتا ہے ۔

(ناشر)

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

محمد امین شکیب

سلطان شہاب الدین

(۱۳۵۴ ---- ۱۲۷۳)

کشمیر کو جن ہستیوں پر ناز ہے اُن میں سے فاتح اعظم[1] سلطان شہاب الدین کا مقام کسی طرح سے کم نہیں۔ وہ یہاں کی عظمت و وقار کی علامت ہیں اور کشمیریوں کی شجاعت و بہادری کا بہترین نمونہ۔ انکی زندگی کے بارے میں گو کہ تواریخ میں بہت کم واقعات درج ہیں پھر بھی جو کچھ مختلف ذرائع سے دستیاب ہو سکا ہے اُسے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ انکی زندگی کی ابتداء سے لیکر رحلت تک کے حالات کما حقہٗ یکجا ہو جائیں اور انکے کارناموں کو صحیح سیاسی و سماجی تناظر میں سمجھا جائے۔

ابتدائی حالات:- سلطان شہاب الدین کا اصلی نام مرزا شیر شامک[2] تھا۔ وہ علاء الدین علی شیر کا فرزند اور شہمیری سلطنت کے بانی سلطان شمس الدین شہمیر کا پوتا تھا[3]۔ مرزا شیر شامک کی پرورش اور تعلیم و تربیت معقول طریقے سے ہوئی تھی اسی لئے وہ اپنے خاندان کے دوسرے بچوں سے زیادہ

---

[1] جس روز اسے اطراف زمین میں سے کسی نئے ملک کی فتح کی خوش خبری نہ ملتی تھی تو اس روز کو وہ اپنی عمر میں شمار نہ کرتا تھا۔ بلکہ اس کے ضائع ہونے پر ماتم کرتا تھا۔ نزہتہ الخواطر ص ۶۱

[2] جون راج اسے شیراشامک کہتا ہے جسکو فارسی مؤرخوں نے شیر شامک بنا دیا ہے۔ سر وُلزلے ہاگ کے مطابق اسکا لغوی معنی 'چھوٹا شیر خور ہے'۔

[3] ایک جگہ جون راج اسے شہمیر کا پوتا قرار دیتا ہے (راج ترنگنی ص ۲۶) لیکن پھر وہ اسے علاء الدین کا تیسرا بھائی گردانتا ہے (راج ترنگنی ۳۵) مرزا حیدر دوغلت کے مطابق وہ علاء الدین کا بھائی تھا۔ (تاریخ رشیدی مترجمہ راس و الیاس ص ۴۳۲) کشمیر کے فارسی مؤرخین اسے علاء الدین کا بیٹا قرار دیتے ہیں جو درست معلوم ہوتا ہے۔

تنومند بھی تھا۔ اور ہوشمند بھی۔ اسے دینی علوم کے علاوہ جغرافیہ اور تاریخ کے بارے میں بھی اچھی خاصی واقفیت حاصل ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے اپنی مہموں کے دوران مختلف ممالک پر فتح پانے میں کسی خاص دشواری کا سامنا نہ ہوا۔ اسے فن سپہ گری، شمشیر زنی اور گھوڑ سواری کی تربیت بھی مِلی تھی۔ یہ اس تعلیم و تربیت کا فیضان تھا کہ ہر مہم میں اس نے ہمت، حوصلہ اور جوانمردی کا بہترین مظاہرہ کیا۔

سلطان شہاب الدین شیروں کا شکار کرنا بہت پسند کرتا تھا۔ ایک دفعہ شیر کو تلوار سے مارنے کی کوشش میں اسکی جان بال بال بچی۔

پیر حسن شاہ نے اُسکی شاہزادگی کے زمانے کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک دن شکار کی غرض سے آبادی سے دور ایک پہاڑ پر پہنچ گیا جہاں اُسے سخت پیاس لگی۔ اُسکے ساتھ اُسکے تین ساتھی ملک چندر (جبنڈا) شور لولک (رای شرول) اور آختہ جی تھے۔ اتفاقاً للہ عارفہ پہاڑی درہ سے دودھ کا ایک پیالہ ہاتھ میں لئے ہوئے نمودار ہوئی۔ اس نے وہ شاہزادہ کو دیا۔ اُسنے تھوڑا سا اس میں سے پی کر اسے ملک چندر کے حوالہ کیا۔ اسنے بھی تھوڑا پی کر شور لولک کو دیا۔ لیکن اُسنے باقی سارا پی لیا اور آختہ جی کے لئے کچھ نہ چھوڑا۔ اس پر للہ عارفہ نے یہ انکشاف کیا کہ شیر شامک (شہاب الدین) ایک عظیم بادشاہ بنے گا، ملک چندر اور شور لولک اسکے وزیر اور سپہ سالار ہوں گے۔ اور آختہ جی کی عمر مختصر ہو گی۔

چنانچہ جب وہ اس سفر سے شہر کی جانب لوٹ رہے تھے تو آختہ جی اچانک راستے میں ہی جان بحق ہوا۔ پھر جب شہاب الدین تخت نشین ہوا تو اُسنے ملک چندر کو سپہ سالار کا رتبہ دیا اور شور لولک کو وزارت کا منصب بخشدیا[1]

---

[1] تاریخ حسن (جلد دوم) صفحہ ۱۷۱ شور لولک کو کئی فارسی تاریخوں میں رای شرول یا شروال لکھا گیا ہے اس طرح سے ملک چندر کو جبنڈا یا چندر ڈانگر بھی کہتے ہیں۔

شہاب الدّین اپنے والد کے عہد میں ہی امورِ مملکت میں شامل تھا۔ چنانچہ سلطان علاء الدّین علی شیر کو نہ صرف اپنے بیٹے سے حد درجہ اُنس تھا بلکہ اُسکی انتظامی صلاحیتوں پر کافی بھروسہ بھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے اپنے بھائی سلطان جمشید سے اقتدار چھیننے کے بعد ملک میں حالات سدھارنے میں اپنے لائق و فائق فرزند شہاب الدّین کی خدمات سے کبھی فائدہ اٹھایا۔ اس طرح سے شہاب الدّین کو ملکی حالات اور انتظامی مسائل سے واقفیت حاصل کرنیکا نزدیکی موقع ملا۔

سیاسی و سماجی تناظر:۔ شہاب الدّین شیر شامک نے جن حالات میں آنکھ کھولی وہ کشمیر کی تاریخ میں انتہائی آزمائش و ابتلاء کا دور تھا۔ اس کے اثرات نہ صرف اسکے بچپن بلکہ اسکی تخت نشینی تک قائم رہے۔ آخری ہندو حکمران لوہر خاندان کے راجا نا عاقبت اندیش اور نااہل ثابت ہوئے تھے۔ وہ عیش پرستی اور اخلاقی پستی میں مبتلا تھے۔ انکا دورِ حکومت [illegible] سازشوں، بغاوتوں، اور سیاسی قتل و غارت گری کا دور تھا۔ اصل اقتدار اُنکے مصاحبوں اور وزیروں کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ خود برائے نام حکمران تھے۔ یہ لوگ عوام سے بیگار لیتے، ظالمانہ ٹیکس وصول کرتے اور طرح طرح سے انکا استحصال کرتے۔ جاگیردار سرداروں کی طاقت زوروں پر تھی انکی مسلسل بغاوتوں کے سبب ملک میں افراتفری کی حالت پیدا ہو گئی تھی۔ لوگوں کی زندگی اور جائداد محفوظ نہ تھی۔ زرعی پیداوار کم ہو گئی تھی۔ تجارت تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھی معاشرتی و اخلاقی طور پر حکمران اور رعایا دونوں قعرِ مذلت میں گر چکے تھے۔

اِن حالات کے پیشِ نظر کشمیر کے شاندار ماضی کی یاد تک ذہنوں سے محو ہو چکی تھی۔ اقتدار زیادہ سے زیادہ وادی کے حدود تک باقی رہ چکا تھا۔ اصل میں اسے بھی مختلف جاگیرداروں اور ڈانگروں نے محدود کر رکھا تھا۔ جو شاہی احکام کی پیروی اپنے لئے ضروری خیال نہیں کرتے تھے۔ الغرض کشمیر جو ایک دفعہ ایک عظیم سلطنت کا مرکز تھا اب ایک معمولی راجواڑہ بن کر رہ گیا تھا۔ پہلے جو علاقے کشمیر کے باج گذار تھے اب وہیں سے حملوں کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔

کشمیر کی ابتری کا ایک سبب یہ تھا کہ وسط ایشیا سے ایک تاتاری سردار ذولچو[1] ستر ہزار سوار فوج کے ساتھ کشمیر پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس نے آٹھ مہینے تک کشمیر میں جس بربریت اور لوٹ مار کو روا رکھا اسکا تذکرہ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مشہور مورخ جونا راج اسباب میں رقمطراز ہے "جب ذولچو کشمیر سے واپس چلا گیا تو وہ لوگ جو اس کی پکڑ سے بچ گئے تھے۔ اپنی جگہوں کو واپس آنے پر جس تباہی سے دوچار ہوئے اسکا ایک دل گداز نمونہ یہ تھا کہ بیٹا باپ سے اور باپ بیٹے سے نہ مل سکا اور بھائی بھائی کو نہ پا سکا۔ کشمیر ایسا اجڑ چکا تھا کہ جہاں انسانی خوراک سرے سے ہی ناپید تھی"[2] ذولچو کے اس حملہ کے بعد کی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر جاگیرداروں نے خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا۔

ایسے آڑے وقت میں راجا مملکت سے دست کش ہو کر گوشۂ عافیت میں چلے گئے تھے لیکن ان حالات میں جو دو اہم شخصیتیں عوام کے بہی خواہ کے طور پر ابھریں وہ رینچن اور شہمیر کی تھیں۔ یہ انکی ذاتی صلاحیتیں اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف تھے کہ ہندو اکثریت نے مذہبی تبغض کے باوجود انہیں اپنا بھرپور اعتماد و تعاون دے کر حکمران تسلیم کیا۔

پریشان کن ملکی حالات کا لازمی اثر لوگوں کی نفسیات پر پڑا تھا۔ یاسیت و قنوطیت ہر ایک پر چھائی ہوئی تھی۔ یہ حالت سلطان شہاب الدین کے زمانہ تک برابر قائم تھی۔ وہ لوگوں کی زبوں حالی کے اسباب جان گیا تھا۔ اسکے دل میں یہ خواہش موجزن تھی کہ کسطرح سے وہ لوگوں کے دکھ کا مداوا کر سکے اور کشمیری قوم کو اپنا کھویا ہوا وقار واپس دلا سکے۔ چنانچہ یہی تمنا اس کے مستقبل کے عزائم کو مہمیز کرتی رہی۔

---

[1] ذولچو چنگیز خان کے بیٹے ہلاکو خان کا پوتا تھا۔ (تاریخ حسن صفحہ ۱۶۲) پیر حسن شاہ اسکا نام ذوالقدر خان بتاتے ہیں لیکن محب الحسن انہیں مسلمان گردانتے سے اتفاق نہیں کرتے۔

[2] جونا راج صفحہ ۱۵۲ ۔ ۱۵۵

ذاتی اوصاف :۔ سلطان شہاب الدین ایک آزمودہ کار سپاہی ہونے کے علاوہ ایک قابل حکمران تھا۔ وہ ایک صحیح محب وطن کی طرح وطن سے بے پناہ محبت رکھتا تھا۔ وہ اسکے ماضی سے بھی باخبر تھا۔ اور حال سے بھی۔ وہ عقل سند بھی تھا اور صحت مند بھی وہ تیغ زن بھی تھا اور صف شکن بھی، وہ علم دوست بھی تھا اور عالموں کا قدردان بھی۔ وہ بااخلاق بھی تھا اور باکردار بھی۔ وہ میدان جنگ میں فتح پانا بھی جانتا تھا اور مفتوح لوگوں پر مہربانی سے پیش آنا بھی۔ وہ رعایا سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اور وہ بھی اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ وہ رواداری اور اخوت کا علم بردار تھا اور دینی غیرت و حمیت کا پاسدار بھی۔

تخت نشینی :۔ شیر شامک ۔۔ علاء الدین کا بیٹا اور جانشین ۔۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۷۶۱ھ (مطابق ۱۳۵۴ء) میں تخت نشین ہوا۔ اسکی تخت نشینی کا مادۂ تاریخ درج ذیل شعر سے نکالا جاسکتا ہے۔ ہاتف غیبی بہر سال جلوس۔ گفت برگو شہنشہ ثانی

۷۶۱ھ

تخت نشین ہونے پر اس نے شہاب الدین کا لقب اختیار کیا[1]

فتوحات :۔ سلاطین کی مملکت کے حدود عہد بہ عہد بدلتے رہے۔ سلطان شمس الدین اور اسکے بیٹے علاء الدین کی حکومت وادی کشمیر تک محدود تھی۔ یہ دونوں اندرونی امن و امان کے مسائل سے دوچار رہے چنانچہ انہوں نے حدود مملکت کی توسیع کی کوئی کوشش نہیں کی۔ علاؤالدین کے فرزند شہاب الدین نے البتہ دوسرے علاقوں کو فتح کرنے کی طرف قدم بڑھایا اس کی حدود مملکت کو اسکے جانشینوں اور خاندان چک کے حکمرانوں نے تھوڑے بہت تغیر و تبدل کے ساتھ برقرار رکھا۔

---

[1] شاہ میر اور چک خاندان کے تمام حکمرانوں نے سلطان کا مشترکہ لقب اختیار کیا تھا۔ اسکے علاوہ ہر سلطان کا اپنا علیحدہ لقب تھا۔ جیسے شہمیر کا شمس الدین، علی شیر کا علاء الدین اور شیر شامک کا شہاب الدین۔

سلطان شہاب الدین نے تخت نشین ہوتے ہی ملک میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرنا زیادہ ضروری سمجھا، ذولچو کے حملہ کے بعد کی افراتفری سے فائدہ اُٹھا کر جاگیرداروں نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا اور بڑے مضبوط قلعے بنوا لئے تھے۔ شہاب الدین کے پیشروؤں نے ان میں سے کئی ایک کو مغلوب کر لیا تھا لیکن اب بھی کئی سردار ایسے موجود تھے جو خراج دینے سے انکار کرتے تھے اور حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ شہاب الدین نے سب سے پہلے ان سرداروں کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنہوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا۔ اِن کو اس نے قتل کر دیا لیکن جنہوں نے وفادار رہنے کا وعدہ کیا۔ انکو اس نے معاف کر دیا اور جب اسکو اِس بات کا یقین ہو گیا کہ اسکی غیر موجودگی میں وادی میں کوئی خلل پیدا نہ ہوگا تو وہ ان علاقوں کو تسخیر کرنے چلا جو کبھی مملکت کشمیر میں شامل تھے۔ شہاب الدین اپنے مادرِ وطن کی عظمتِ رفتہ کی بازیافت چاہتا تھا۔ اسی خیال کے پیش نظر اُس نے ڈانگر، تانترے اور لون جیسے جنگجو قبیلوں کو اپنی قابل رہنمائی اور حکمت عملی سے اپنے اردگرد جمع کر دیا۔[1] اسکے علاوہ اس نے اپنی فوج میں پونچھ، راجوری، کشتواڑ اور مظفرآباد کے پہاڑی قبائل بھی شامل کر دئیے۔[2]

تواریخی واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فاتح اعظم شہاب الدین بارہمولہ کے راستہ سے

---

[1] ڈاکٹر سٹین کا قول ہے کہ ڈانگر اور تانترے خانہ جنگیوں میں اعلیٰ لڑنے والوں کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں لیکن انکے سر وادی سے باہر کی فتوحات کا سہرا باندھا نہیں جا سکتا۔ اسکے جواب میں محب الحسن اپنی تصنیف (کشمیر انڈر سلطانز) میں لکھتا ہے "کشمیری بہادر اور اچھے جنگجو تھے اور موجودہ زمانے میں غیر ملکیوں نے اگر ان میں جنگی جوش کی کمی پائی ہے یہ انکی فطری کم ہمتی پر محمول نہ کی جانی چاہئے بلکہ یہ محض طویل سیاسی غلامی کا نتیجہ ہے۔ صفحہ ۲۷۵

[2] شری ور کے مطابق (ص ۲۸۸) سلاطین کے فوج کی کوئی خاص وردی نہ ہوتی تھی بلکہ صرف کچھ علامتیں ہوتیں جن سے اسے پہچانا جاتا تھا۔ کشمیری اچانک حملہ کرنے میں ماہر تھے۔ وہ گوریلا جنگ بھی بہت پسند کرتے تھے۔

اپنی فوج لیکر آگے بڑھا۔ اس نے پہلے پکھلی اور سوات پر قبضہ جمایا، اسکے بعد وہ ملتان، شعمان، کابل، غزنی اور قندہار کو فتح کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے ہندوکش کو عبور کرکے بدخشان پر فوج کشی کی[1]۔ اسے وسط ایشیاء کی سلطنتوں کو مطیع کرنیکا خیال بھی تھا لیکن اپنی سلطنت کے قریبی علاقوں پر قبضہ جمانے کے خیال سے اس نے گلگت اور داردو کا رخ کیا۔ ان جگہوں کو اپنی مملکت میں ملا کر وہ بلتستان اور لداخ کو فتح کرنیکے لئے آگے بڑھا۔ یہ علاقے چونکہ کاشغر کے حکمران کے ماتحت تھے اس نے بھاری فوج کے ساتھ شہاب الدین کی مزاحمت کی کوشش کی، لیکن اسے اپنی کثیر فوج کے باوجود کشمیری سرفروشوں کے سامنے شکست نصیب ہوئی۔

اسی دوران سلطان شہاب الدین کے ایک فوجی سردار ملک حیدر نے کشتواڑ اور جموں کو فتح کرلیا۔ اسکے بعد کچھ مدت تک سلطان نے اپنی مملکت میں ربط وضبط پیدا کرنے کی طرف دھیان دیا۔ اس اثناء میں اس نے حرب وضرب کا زیادہ بہتر سامان جمع کیا۔ اس نے پچاس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیادہ فوج کے ساتھ پھر فتوحات کا سلسلہ جاری رکھنے کا عزم کیا۔ اس غرض کیلئے اس نے حضرت امیر کبیرؒ کے بھتیجے سید حسن کو میر لشکر بنا کر بیس ہزار سوار اور ایک لاکھ پیادہ فوج کے ہراول دستہ کی کمان دے دی[2]۔

---

[1] حیدر ملک نے کوہ ہندوکش کو پار کرکے بدخشان فتح کرنیکا تذکرہ کیا ہے۔ (ورق ۵۵) لیکن بہارستان شاہی ورق ۲۰ ب میں لکھا ہے کہ پہاڑ کو پار کرنیکی مشکلات کو سمجھ کر وہ وہاں سے واپس لوٹا۔ محب الحسن کا خیال ہے کہ جون راج اور دوسرے مورخین نے شہاب الدین کی فتوحات کے بارے میں ویسی ہی مبالغہ آرائی کی ہے جیسی کہ کلہن نے اپنے ہیرو للتادیتہ کے کارناموں کے بارے میں — ص ۵۰

[2] تاریخ حسن (جلد دوم) ص ۱۷۲

اِس دفعہ وہ نگر کوٹ (کانگڑا) کی طرف چلا۔ اسکو فتح کرنے کے بعد وہ پنجاب میں ستلج کے میدان میں خیمہ زن ہوا۔ اُسنے نگر کوٹ کے راجہ ادک پتی کو شکست دے کر اپنی سرداری تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد اس نے دہلی کو فتح کرنیکا ارادہ کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے ستلج کے کنارے اسکا مقابلہ کیا۔ یہ جنگ فیصلہ کُن ثابت ہوئی[1]۔ آخر کار حضرت امیر کبیر قدس سرہٗ نے ان دو عظیم بادشاہوں کے درمیان صلح کرائی۔ اسکی رو سے سرہند سے لیکر کشمیر تک کا علاقہ شہاب الدین کو ملا اور بقیہ مشرقی علاقہ فیروز شاہ کی مملکت میں رہا[2]۔ یہ شہاب الدین کی آخری فوج کشی تھی اسکے بعد وہ کشمیر واپس آیا اور اپنی حکومت کے بقیہ نو سال ملک میں اصلاح کے کام میں گزارے

سلطان شہاب الدین کے کردار کی اہم بات یہ تھی کہ اُس نے اپنے تمام فاتحانہ مہموں میں مفتوح عوام اور انکے سرداروں کے ساتھ فیاضانہ سلوک روا رکھا۔[3]

---

[1] پی این کے بامزئی کے مطابق کشمیری مؤرخین نے لکھا ہے کہ شہاب الدین نے فیروز شاہ تغلق کے علاقوں پر حملہ کے دوران ۵۰،۰۰۰ سوار اور ۵۰،۰۰۰ پیادہ فوج سے حملہ کیا ص ۳۱۶

[2] فیروز شاہ تغلق کی تین بیٹیاں تھیں جنہیں حضرت امیر کبیر قدس سرہٗ نے شہاب الدین کے اقرباء کے ازدواجی رشتے میں لایا۔ ایک لڑکی کا نکاح شہاب الدین کے بیٹے حسن خان سے ہوا۔ دوسری کا سلطان کے بھائی قطب الدین سے اور تیسری کا سید حسن کے ساتھ۔ اسی طرح سے شہاب الدین کی دختر کو فیروز شاہ تغلق کے نکاح میں لایا گیا۔ امیر کبیر اس عہد میں (۱۳۷۲ء میں) پہلی بار کشمیر وارد ہوئے تھے۔ تاریخ حسن ص ۱۷۳ سید محمد خاوری آپ کی تشریف آوری کی تاریخ ایک قطعہ میں درج کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے۔

میر سید علی شہ ہمدان   سیر اقلیم سبعہ کردہ نکو
شد مشرف ز مقدمش کشمیر   اہل آں شد از ہدایت جو
سال تاریخ مقدم او را   گفتم از مقدم شریف بجو ۷۷۴ھ

[3] پی، این، کے بامزئی ص ۳۱۶

قومی تعمیرِ نو:۔ سلطان شہاب الدین اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ وہ ایک قابل حکمران تھا اور حکومت کا انتظام عدل وانصاف سے چلاتا تھا۔ اسی لئے عوام وخواص سبھی اُس سے خوش تھے۔ اسی کی کوششوں اور لائق انتظامیہ کی وجہ سے سلاطین کے اقتدار کو کشمیر میں تقویت حاصل ہوئی بلکہ ایک مضبوط بنیاد بھی فراہم ہوئی۔ اُسے ایک پُرامن ملک، اہل اور قابل اعتماد مشیر حاصل ہوئے[1]۔ اس میں مردم شناسی کا جوہر بھی تھا۔ اسلئے وہ اپنی حکومت میں انہی لوگوں کو ملازم رکھتا تھا، جو اپنی لیاقت اور دیانت داری کیلئے مشہور ہوتے تھے[2]۔

سال ۱۳۶۱ء میں کشمیر ایک تباہ کن سیلاب کی زد میں آیا۔ جس سے سرینگر کا ایک وسیع علاقہ برباد ہوگیا۔ تمام پُل بہہ گئے اور بقول حسن شاہ بیس ہزار گھر برباد ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ سلطان کو اب جو فکر دامنگیر رہی وہ یہ تھی کہ کس طرح سے شہر کو آئندہ ایسی آفت سے بچایا جاسکے چنانچہ اُس نے اسکے بارے میں منصوبہ بند کاروائی شروع کی۔ اس نے نشیبی جگہوں کے لوگوں کو اونچی جگہوں پر بسانے کیلئے ہر ممکن امداد دی۔ اُس نے دریائے جہلم کی کھدائی بھی کروائی[3]

اسی منصوبہ بندی کے تحت اس نے کوہ ماراں کے ارد گرد اونچی اور صحت افزاء جگہ کو اپنی راجدھانی کیلئے منتخب کیا۔ یہاں اُسنے ایک نیا قصبہ اپنی رانی لکشمی کے نام پر لکشمی نگر بسایا جو سیلاب اور وبائی امراض سے محفوظ علاقہ ثابت ہوا۔ اس نے جہلم اور سندھ کے سنگم پر ایک اور قصبہ شہاب الدین پورہ (جسے آج شادی پورہ کہتے ہیں) بسایا۔ اس نے اس قصبہ کی تعمیر پر وہ ساری دولت لٹادی جو اس نے اپنی فتوحات کے دوران حاصل کی تھی[4]

---

[1] جون راج، ص ۴۱ [2] محب الحسن (کشمیر انڈر سلطانز) ص ۵۲

[3] آر، کے، پارمو (اے ہسٹری آف مسلم رول ان کشمیر) ص ۹۶

[4] پیر حسن شاہ کے مطابق شہاب الدین پورہ کا آجکل نام شہام پورہ ہے جہاں سلطان نے ستّر ہزار گھر تعمیر کئے تھے۔ وہاں ایک جامع مسجد بھی تعمیر کرائی جو آجتک قائم ہے۔ اُسنے اسی جگہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ ص ۱۷۴

شہاب الدین کی تعمیر پسندی، منصوبہ بندی اور عمدہ دلچسپیوں کا ثبوت جہانگیر کے اس تبصرہ میں ملتا ہے جو اُس نے ۳۲ھ سال سنہ شہاب الدین پورہ کی سیر کے بارے میں کیا ہے۔ اسکا بیان ہے :۔

"شہاب الدین پورہ کشمیر کی بہترین جگہوں میں سے ایک ہے۔ یہاں تقریباً ایک سو پرشکوہ چنار ایک خوش کن سرسبز میدان میں کھڑے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے ملے ہیں کہ سارے میدان کو زیر سایہ لاتے ہیں۔ یہاں قالین بچھانا بے سود اور بے کیف ہے"[1]

زراعت کی ترقی :۔ اس نے زراعت کی ترقی اور کسانوں کی خوشحالی کیطرف خاص توجہ دی اسی لیئے اس نے پیداوار بڑھانے کی سکیموں کی حوصلہ افزائی کی۔[2]

قیام امن :۔ اس نے امن وامان قائم کرنے کیلئے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کے اثر کو کم کیا جو اندرونی بدامنی اور افراتفری کو اپنے مفادات کی خاطر شہہ دیتے تھے۔[3]

تعلیم کا فروغ :۔ وہ پہلا سلطان ہے جس نے وادی کے مختلف حصوں میں مدارس قائم کیئے۔[4] اسکے علاوہ سری نگر میں قرآن وحدیث کے مطالعہ کیلئے اُسنے ایک کالج بھی قائم کیا تھا ان مدرسوں کا نظام اور نصاب تعلیم ترکستان، ایران اور ہندوستان کے مدرسوں کا سا تھا۔ انمیں عربی حروف تہجی، علوم متداولہ مثلاً علم الکلام، علم التوحید، تفسیر، حدیث، فقہ اور طبعی علوم پڑھائے جاتے تھے۔ تیراندازی، شمشیرزنی اور گھوڑسواری بھی سکھائی جاتی تھی۔[5] ان اداروں کے سربراہ مشہور علماء ہوتے اور ترکستان، ہرات اور ہندوستان سے طلبہ آکر اُنسے فیض حاصل کرتے تھے۔

اِس زمانے میں خانقاہیں بھی علم کا مرکز تھیں۔ جہاں قابل اساتذہ طلبہ کو درس دیتے تھے۔[6]

---

[1] تزک جہانگیری [2] آر، کے پارموں ص ۹۶

[3] بہارستان شاہی ورق ۳۰ و [4] نوادر الاخبار ورق ۲۹ ب

[5] تذکرہ مُلا رینہ ورق ۵۱۳ الف [6] خوارق السالکین ۱۵۵ ب

سلطان شہاب الدین کو چونکہ علم و تربیت کے ساتھ کافی لگاؤ تھا اس لئے وہ علماء کی خوب سرپرستی کرتا تھا۔

مذہبی رواداری:۔ سلطان اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ نہایت رواداری کا سلوک کرتا تھا۔ اگرچہ اس وقت تک کشمیر مسلم بادشاہوں کے ماتحت تیس سال سے زیادہ عرصہ تک رہا تھا۔ پھر بھی انہیں کبھی مذہبی منافرت کی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ شہاب الدین کے چند فوجی سردار ہندو اور دوسرے مذہبوں کے ماننے والے تھے۔ جون راج کے مطابق سلطان کے فوجی سرداروں میں سید حسن بہادر جسکے علاوہ لولک، چندر، شورنگ اور راجیہ وغیرہ تھے۔ اُسنے اپنے دو ہندو وزیروں کوٹا بھٹ اللہ اور ادے شری پر بے حد اعتماد رکھا تھا۔ ادے شری اسکا وزیر اعلیٰ اور وزیر مال بھی تھا۔

فارسی مورخین کا یہ کہنا کہ حکومت کے آخری ایام میں اس نے بت شکنی شروع کی غلط ہے[١]۔ جون راج جو اس عہد کا معتبر مورخ مانا جاتا ہے، بیان کرتا ہے کہ جب جنگ کے کثیر اخراجات کی وجہ سے خزانہ خالی ہو گیا اسکے وزیر ادے شری نے بدھ کی پیتل کی مورتی کو پگھلا کر سکہ بنانے کا مشورہ دیا تو سلطان نے خفا ہو کر جواب دیا۔

"گزشتہ نسلوں نے ان دیوتاؤں کی مورتیاں نصب کر کے عزت و شہرت حاصل کیا اور تم انکو گرا دینے کا مشورہ دیتے ہو۔ کچھ لوگ تو انکو نصب کر کے مشہور ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے ان کی پرستش کر کے عزت پائی۔ کچھ لوگوں نے انکی نگہداشت کی اور کچھ لوگ انکو گرا کر اپنا نام پیدا کرینگے یہ کتنی سنگین بداخلاقی ہے[٢]۔"

یہ صحیح ہے کہ اُس نے سرکش جاگیرداروں کو زیر کرنے کیلئے سختی سے کام لیا۔ لیکن اس میں ہرگز اس نے مذہبی امتیاز روا نہ رکھا۔ اسکے برعکس بقول شری پارمو اسکی شہادتیں ملی ہیں کہ اسنے اپنے عہد میں کئی خستہ مندروں کی مرمت کرا کے انہیں ٹھیک کرا دیا۔

---

[١] بہارستان شاہی ورق ١٢٢ الف [٢] جون راج ص ٤٤

شہاب الدین کا انیس سالہ اقتدار ہر لحاظ سے تعمیر و ترقی، خوشحالی و فارغ البالی قومی وقار و عزت کے عروج کا دور تھا۔ اس نے کشمیریوں میں ایک بار پھر خود اعتمادی اور خودداری پیدا کر دی۔ اس کی کوششوں سے انکے سروں پر سے مایوسی اور بے بسی کے بادل چھٹ گئے اور امید کا مہرِ درخشاں نمودار ہوا۔ علم و ادب کے فروغ کیلئے بنیاد قائم ہوئی۔ اس تہذیب و تمدن کی داغ بیل پڑی جس نے کشمیر میں فرقہ وارانہ یک جہتی اور رواداری کو ہمیشہ قائم رکھا۔ یہی چیز ہر آزمائش کے وقت کشمیریوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ کشمیری اگر اس عظیم فاتح اور معمار پر فخر کرتے ہیں تو یہ بجا ہے کیونکہ یہ اسکے جذبۂ شجاعت و تعمیر کا فیض ہے کہ کشمیریوں کا وقار ایشیا کے اس وسیع علاقے میں بہت بڑھ گیا۔ وہ جس قدر محبت اپنے ہم وطنوں سے کرتا تھا۔ اِسی قدر باہر کے لوگ اس سے خائف تھے۔ حالانکہ فتوحات کے بعد اُس نے مفتوحین کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک روا رکھا تھا، یہاں تک کہ اکثر فتح کئے ہوئے علاقوں کا نظم و نسق بہتر بنا کر انکے سابقہ راجاؤں کی تحویل میں ہی دیا۔ انکی یاد علامہ اقبالؔ کو اسوقت ستاتی رہی جبکہ کشمیر غلامی کی عبرتناک پستی میں گرا ہوا تھا۔ "خاکِ ما دیگر شہاب الدین نژاد"

ہمارے وطن عزیز کا یہ نامور سپوت ۱۳۷۳ء میں اس جہان فانی سے رخصت ہوا۔[1]

---

[1] یہ ایک حیران کن امر ہے کہ شہاب الدین جیسا سلطان جس کے بارے میں شری پی، این، کے بامزئی رقمطراز ہے "اس کا ذاتی کردار تمام خامیوں سے پاک تھا۔ وہ عورت اور شراب میں محو رہ کر اپنی قوت ضائع نہ کرتا تھا۔ اسکی سب سے بڑی مسرت اس بات میں تھی کہ وہ اپنی فوج کو فتوحات سے ہم کنار کرے" وہی سلطان اپنی آخری عمر میں اپنی ملکہ لکشمی کی بہن کی لڑکی 'لاسہ' کے عشق میں اس قدر گرفتار ہو جائے کہ وہ ملکہ سے علحدگی اختیار کر کے اپنے دو بیٹوں مرزا حسن اور مرزا علی کو جلاوطن کر بیٹھے (جون راج ص ۵۳) اِسطرح ایک ایسے عالی حوصلہ سلطان کو اپنی آخری عمر میں وہ ابتر گھریلو زندگی اور پراگندگی نصیب ہوگئی جو تمام مادی علائق سے آزاد رہ کر اپنی جوانی کے دنوں میں ملک گیری، مہم جوئی کیطرف مائل بھی تھی اور منہمک بھی ▲

جتندر شرما

راجہ رنجیت دیو

مہاراجہ گلاب سنگھ کی تخت نشینی سے پہلے کے جموں کے تمام حکمرانوں میں مہاراجہ رنجیت دیو کا عہدِ حکومت ہر لحاظ سے اہم و برتر مانا گیا ہے۔ انہوں نے حکومت کی باگ ڈور اس وقت سنبھالی جب پنجاب اور ڈوگرہ پہاڑی ریاستوں کی تاریخ انتہائی نازک دور سے گذر رہی تھی۔ وہ سیاسی اتھل پتھل، بدحالی اور افراتفری کا زمانہ تھا۔ ایک طرف دلّی کے مغل حکمران پنجاب کے میدانوں اور شوالک پہاڑیوں پر اپنے زوال پذیر اقتدار کو کسی طور برقرار رکھنے کی فکر میں مبتلا تھے۔ دوسری طرف خالصہ فوج کے سپاہی گورو گوبند سنگھ کے مطمعٔ نظر سے تحریک پاکر اسلام کے اثر و رسوخ کو محدود کرنے اور اپنی عملداری کو پھیلانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ان دو حریفوں کی زبردست تگ و دو کے علاوہ احمد شاہ دُرانی کی قیادت میں افغان فوجوں کی پے در پے یلغاروں نے پنجاب اور پہاڑی ریاستوں کے امن و سکون کو درہم و برہم کر ڈالا تھا۔

چنانچہ انتہائی غیر یقینیت کے عالم میں رنجیت دیو نے اپنے والد دھرو دیو کی وفات کے بعد ۱۷۲۵ء[1] میں جموں کی حکومت سنبھالی اور فوراً سلطنت کے استحکام میں مصروف ہو گئے قریب قریب دس برس کے قلیل عرصے میں انکی سیاسی سوجھ بوجھ، دوراندیشی، عدل پسندی، مذہبی رواداری اور فیاضی کے طفیل سلطنت میں امن و امان قائم ہو گیا، اقتصادی حالت میں قابلِ قدر سُدھار ہوا اور رعایا خوشحال ہو گئی۔ نتیجے کے طور پر مہاراجہ رنجیت دیو کے حریف راجے

---

[1] 'دیوان کرپا رام'، گلاب نامہ صفحہ ۱۰

ان سے حسد کرنے لگے بلکہ انکی آئے دن بڑھتی طاقت اور ہوس ملک گیری سے خوفزدہ رہنے لگے۔

شروع شروع میں باہو ایک الگ قلمرو تھی لیکن مہاراجہ رنجیت دیو کے بزرگ راجہ ہری دیو (۱۶۵۰ء۔ ۱۶۷۵ء) نے اسے جموں کی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ لہٰذا اسی باہو وال خاندان کے اُگر دیو نے اپنی کھوئی ہوئی حکومت کو پھر سے حاصل کرنے کی غرض سے لاہور کے مغل گورنر ذکریا خان کو مہاراجہ رنجیت دیو کے خلاف اسقدر ورغلایا، بھڑکایا کہ اس نے خود اپنی قیادت میں جموں پر حملہ کیا اور رنجیت دیو کو گرفتار کر کے لاہور لے گیا جہاں انہیں بارہ[1] سال تک قید رکھا گیا۔ اس دوران انکے چھوٹے بھائی میاں گھنسار دیو نے نظم و نسق کا انتظام اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ بالآخر فوجدار اُدِنا بیگ کی وساطت سے دو لاکھ روپے تاوان کی پیش کش کے عوض مہاراجہ رنجیت دیو کی رہائی کیلئے پنجاب کے گورنر کو راضی کر لیا گیا۔

کچھ عرصہ بعد مہاراجہ رنجیت دیو نے باہو پر حملہ کیا اور اگر دیو کو شکست دی جو جان بچا کر لاہور بھاگ گیا۔ پہلے باہو کا علاقہ میاں گھنسار دیو کو جاگیر کے طور پر دیا گیا لیکن بعد کو لاہور کے گورنر کی مداخلت پر باہو کی عملداری پھر اُگر دیو کو سونپ دی گئی لیکن اب کے رنجیت دیو کے حلقہ بگوش اور لگان دار کی حیثیت میں۔

اور پھر مہاراجہ رنجیت دیو نے جلد ہی اپنی انتظامی صلاحیت، اخلاقی قوت اور مستقل مزاجی سے کام لیکر پہاڑی ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنی عظمت اور دبدبے کا احساس دلانے کی دیرینہ خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کی کوششیں شروع کر دیں وہ وقت اس کام کیلئے تھا بھی نہایت موزوں، پنجاب میں احمد شاہ درانی نے قبضہ کر لیا تو پہاڑی ریاستوں پر مغلوں کا دو سو[2] برس سے چلتا آ رہا اقتدار اختتام پذیر ہوا لیکن مرہٹوں کے حملوں اور سکھوں کی غارتگری نے طوائف الملوکی اور بدنظمی کی فضا پیدا کر دی تھی لہذا نئے فتح کئے علاقوں میں افغان بھی اپنی حکومت کی بنیادیں مکمل طور پر استوار نہ کر سکے۔ اسلئے انکے تیئیس پہاڑی ریاستوں کی وفاداری

---

[1] نرسنگھ داس نرگس، تاریخ ڈوگرہ دیس صفحہ ۸۴

محض برائے نام تھی۔

غرض ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مہاراجہ رنجیت دیو نے ایک تو مغلوں اور افغانوں کی اطاعت کو بالائے طاق رکھکر سلطنت جموں کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست کا درجہ عطا کیا۔ اور دوسرے چناب اور راوی کے درمیان واقع تمام چھوٹی بڑی ریاستوں کو اپنے اثر و رسوخ میں لانے کی بھرپور اور واضح کوششیں شروع کر دیں اور جلد ہی جموں کے آس پاس کے راجاؤں کو اپنی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان میں کشتواڑ[1] کے راجہ ناہر سنگھ، چھنینی کے شمشیر چند، بھدرواہ کے کرچی پال اور بسوہلی کے راجہ امرت پال کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

سنہ ۱۷۶۰ء کے ہندوستان کی حالتِ زار کا ذکر کرتے ہوئے کننگھم نے لکھا ہے:۔

> "شمال[2] کی جانب افغان اور سکھ حملے کئے جا رہے تھے۔ جنوب کی طرف جاٹ اور مرہٹے حملہ آور تھے۔ الغرض اس ہنگامہ خیز ماحول اور ابتری کی حالت میں ڈگر کے علاقے کے کچھ ایک راجاؤں نے جموں کے راجہ رنجیت دیو کی اطاعت قبول کر لی تھی اور باقی جسروٹہ کے راجہ کرپال دیو کے حلقہ بگوش بن بیٹھے تھے"

مہاراجہ رنجیت دیو نے اپنی قلمرو کو مزید وسعت دینے کی خاطر ایک نہایت چابکدست ترکیب استعمال میں لائی۔ جسروٹہ کے راجہ کرپال دیو کو اس بہانے جموں آنے کی دعوت دی تاکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی ایسا حل ڈھونڈ نکالیں جس سے دلی کے حاکموں کے تاوان کی وصولی کے لئے بڑھتے ہوئے تقاضوں سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نجات حاصل کی جاسکے۔ جونہی کرپال دیو جموں پہونچا تو اسے قید کر دیا گیا۔ اور پھر مہاراجہ رنجیت دیو نے خود دلی کی فرمانبرداری قبول کرنے کے عوض جسروٹہ کی ریاست کو اپنی عملداری میں شامل کرنیکی اجازت

---

[1] K.M.Panikkar : The founding of Kashmir State : P.10

[2] Col .W.B.Cunningham: The Dogras : P. 15

حاصل کرلی۔ اور اس طرح مہاراجہ رنجیت دیو کی عظمت اور وقار کے سامنے دریائے راوی کے مغرب تک کی تمام ڈوگرہ سلطنتوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ بسوہلی اور بھدرو کے راجاؤں کو تو پہلے ہی سے راجہ دھرو دیو نے سلطنت جموں کا حلقہ بگوش بنا رکھا تھا مگر مہاراجہ رنجیت دیو کے خسروانہ اقدامات نے انہیں مزید فرمان بردار بنا ڈالا۔

۱۷۹۴ء میں جب ریاست چمبہ کی گدی پر نو برس کے راج سنگھ کو بٹھایا گیا تو اسکی کم عمری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کانگڑہ کے راجہ گھمنڈ چند نے پتھیار کے قلعے پر قبضہ کر لیا چونکہ راج سنگھ کی ماں یعنی قائم مقام رانی جموں کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی لہٰذا مہاراجہ رنجیت دیو کو مداخلت پر آمادہ کیا گیا۔ جنہوں نے قلعہ واپس دلوا کر چمبہ کو بھی اپنے اثر و رسوخ میں شامل کر لیا۔

چنانچہ مہاراجہ رنجیت دیو دریائے راوی کے دونوں اطراف کی پہاڑی ریاستوں میں غیر معمولی اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب و کامران ہوئے۔ بہت سے راجہ اور رئیس اکثر اوقات بذاتِ خود انکے دربار میں حاضر ہو کر انکی جاہ و حشمت میں اضافہ کیا کرتے۔ لیکن جب مہاراجہ نے اپنے جانشین برج راج دیو کو راوی کے اس پار کی ریاستوں کو زیرِ حمایت لانے کی غرض سے بھیجا تو انکے داماد نورپور کے راجہ پرتھوی سنگھ نے اپنی قوت مزاحمت کا اظہار کرتے ہوئے جموال شاہی خاندان کی اطاعت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بلکہ مہاراجہ کی شان کے خلاف برے کلمات استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ نتیجے کے طور پر شاہی حکم ملتے ہی برج راج دیو کی قیادت اور میاں رتن دیو کی کمان میں جموں کی ڈوگرہ فوج نے نورپور پر دھاوا بول دیا۔ ادھر پرتھوی سنگھ نے بھی جالندھر کے راجہ اور کنہیا سرداروں کی فوجی امداد حاصل کر لی اور نورپور سے لیکر سیدھون تک کے تمام علاقے میں غضبناک جنگ چھڑ گئی جو طویل مدت تک جاری رہی؛ لیکن بالآخر پرتھوی سنگھ نورپور کے قلعے میں چھپنے پر مجبور ہو گیا جسکا جموں کی فوج نے ایک عرصے تک محاصرہ کئے رکھا۔ آخر پرتھوی سنگھ نے مجبوری کی حالت میں ہتھیار ڈال دئے اور ان سے

گرفتار کر کے جموں لایا گیا۔ لیکن خلاف قیاس مہاراجہ رنجیت دیو اسکے ساتھ نہایت لطف و کرم سے پیش آئے اور شان کے لائق اعزازات سے نوازنے کے ساتھ ساتھ یہ اعلان کیا گیا کہ پرتھوی سنگھ بدستور والی سلطنت نورپور رہے گا۔

اسطرح مہاراجہ رنجیت دیو کا اقتدار رفتہ رفتہ بڑھتا چلا گیا اور سنہ ۱۷۷۰ء کے بعد اوج کمال کو پہنچ گیا۔ پہاڑی ریاستوں کے راجاؤں کو نیچا دکھانے کے بعد انہوں نے میدانی علاقوں میں معرکہ آریاں شروع کیں اور سنہ ۱۷۷۳ء میں جسروٹہ سے لیکر کالووال تک اور گورداس پور کا بیشتر علاقہ فتح کر لیا۔ گجرات، [illegible] ہوپور، پسرور، ظفروال اور دیگر میدانی علاقوں کے بیشتر حصوں کو اپنی عملداری میں شامل کر لیا۔ مہاراجہ رنجیت دیو نے وادیٔ کشمیر کا بھی دوبارہ رُخ کیا۔ ایک بار افغان حملہ آوروں کی حمایت میں اور دوسری بار خود وادی کو فتح کرنے کی خاطر لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

بہرحال آپ یقیناً پہلے ڈوگرہ حکمران تھے جنہوں نے سلطنت جموں کی سرحدوں کو خاطر خواہ وسعت عطا کی۔ اسے ایک آزاد، خودمختار و خودکفیل ریاست بنایا۔ یہاں مہذب حکومت کی بنیادیں استوار کیں۔ یہاں کے باشندوں کو متمدن قوم کا درجہ حاصل کرنیکے قابل بنایا۔ غرض جو منفرد ڈوگرہ شائستگی و ثقافت آج ہمیں دیکھنے کو مل رہی ہے اسکی داغ بیل ڈالنے کا شرف بلاشک مہاراجہ رنجیت دیو کو ہی حاصل ہے۔

مہاراجہ رنجیت دیو کے طرز حکومت کی امتیازی شان یہ تھی کہ انہوں نے اسوقت بھی اپنے دارالسلطنت جموں میں مکمل طور پر امن و امان قائم کر رکھا تھا جبکہ ملک بھر میں افراتفری کا دور دورہ تھا۔ آپ کی عدل پسندی، غیر جانبداری، انتظامی صلاحیت اور مذہبی رواداری کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ انکی عالمگیر مقبولیت سے متعلق بہت سی حکایات زبان زدِ عام تھیں۔ جنکا ذکر گنیش داس وڈھیرا نے راج درشنی میں بڑے مفصل ڈھنگ سے کیا ہے اور جنہیں دیوان کرپا رام نے گلاب نامہ میں نقل کیا ہے۔

جارج فارسٹر نے، جو مہاراجہ کی وفات کے سال بھر بعد سنہ ۱۷۸۳ء میں جموں آیا تھا

[illegible] کرپا رام، گلاب نامہ صفحہ ۹۶

آپ کی[1] بلند پایۂ مثالیت، مذہبی رواداری اور پدرانہ شفقت کا تذکرہ کیا ہے۔ اور فریڈرک ڈریو نے مہاراجہ کے عہد حکومت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

> "اٹھارویں[2] صدی میں راجہ رنجیت دیو جموں کا حکمران تھا لیکن اب بھی لوگ اس کی بے مثال خوبیوں اور اخلاقی قدروں کا ذکر نہایت عزت و احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ راجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک جیسی حوصلہ افزائی کرتا تھا جس سے متاثر ہو کر بے شمار کاریگروں، ہنرمندوں نے جموں کا رخ کیا اور یہیں بود و باش اختیار کر لی۔ چنانچہ شہر تیزی سے پھیلتا اور ترقی کرتا گیا۔"

گورنر جنرل کو کلکتہ میں ۱۹ر اپریل ۱۷۸۰ء میں ایک مراسلہ موصول ہوا جس میں مہاراجہ کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے:۔

> "راجہ[3] بہادری اور شجاعت کیلئے مشہور و ممتاز ہے۔ اپنی رعایا کے ساتھ اتنا عمدہ برتاؤ کرتا ہے کہ نادر شاہ کے حملوں سے تنگ آکر پنجاب، لاہور اور دوآبے کے ان گنت لوگ جموں کے پُر امن شہر میں پناہ لینے آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ جموں کی رعایا جسقدر آزادی اور بے فکری سے زندگی بسر کر رہی ہے ویسے سازگار حالات اور مواقع دلّی سے لیکر اٹک تک کسی کو نصیب نہیں۔"

مہاراجہ رنجیت دیو نے پنجاب کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کو ہر طرح کی سہولیات بہم پہونچانے کے حکم صادر کر رکھے تھے۔ لاہور اور دلّی کے درباروں سے متعلق خانہ جنگیوں کے شکار رئیس زادوں اور دیگر شریف النفس پناہ گزینوں کو خاص رعائتیں

---

1. George Forster : A Journey : P. 383

2: Fredrick Drew: Jammu and Kashmir Territories: P. 10

3: Calander of Persian Correspondence V. 1836

دی جاتی تھیں انکے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا تھا۔ مغلانی بیگم کے ساتھ مہاراجہ کا شاندار برتاؤ انکی فیاضی اور بے تعصبی کا واضح ثبوت ہے۔

مغلانی بیگم پنجاب کے گورنر میر معین الملک کی بیوہ تھی ۱۷۵۸ء میں لاہور کے گورنر ادینا بیگ کی وفات کے بعد جب کوئی پوچھنے والا نہ رہا تو اس نے دشمنوں کے جنگل میں پھنسنے کے بجائے ہجرت کرنا بہتر سمجھا اور بالآخر جموں میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہ شہر اُن دنوں 'دارالامن' کے نام سے دور دور تک مشہور تھا۔ بیگم موصوف کی جموں میں آمد کا ذکر کرتے ہوئے مسکین نے لکھا ہے کہ مہاراجہ رنجیت دیو اسکے خیر مقدم کیلئے شہر سے تین کوس باہر نکل آئے تھے۔ بیگم نے احتراماً سر پیچ کلاہ، کلغی اور جواہرات جڑے ملبوسات پیش کئے۔ اور مہاراجہ مغلانی بیگم کو اپنے ہمراہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ جموں لائے پہلے اسے وزیر اودھو کی رہائش گاہ کے نزدیک ٹھہرایا گیا اور پھر اس کی شایانِ شان دریائے توی کے سامنے ایک نئی عمارت[۱] تعمیر کروائی گئی۔ جہاں مہاراجہ بیگم کی خیر و عافیت دریافت کرنے اکثر آیا کرتے تھے۔ مہاراجہ نے شاہی مہمان کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ وظیفے کی پیشکش بھی کی تھی لیکن باوقار بیگم نے مالی مدد لینے سے انکار کر دیا تھا۔

کچھ دیر بعد بیگم کے ملازم شہباز کے ساتھ ناجائز تعلقات کے چرچے شہر بھر میں پھیل گئے۔ اور بقول مسکین وہ بدنامی کے ڈر سے سانبہ چلی گئی جہاں اس نے شہباز سے شادی کر لی۔ اٹھارہ برس کسمپرسی اور گمنامی کے عالم میں رہنے کے بعد وہ ۱۷۷۹ء میں جموں لوٹ آئی اور دو ایک ماہ بعد اسکا انتقال ہو گیا۔

مہاراجہ رنجیت دیو کی عنایتوں کے زیر سایہ جموں میں پناہ لینے والی نامور ہستیوں میں دلّی

---

[۱] یہ عمارت بیگم کی حویلی کے نام سے آج تک مشہور ہے اور اب اسی عمارت میں ردّ و بدل کرنے کے بعد ریڈیو اسٹیشن بنا دیا گیا ہے۔

کی ملازمانی، لاہور کے دیوان کوڑامل کے صاحبزادے ہری سنگھ، مغل وائسرائے یحییٰ خان کے دیوان لکھپت رائے کے صاحبزادے دلپت رائے، چیڑت سنگھ شکرچکیا کے خاندان کے افراد کے نام قابل ذکر ہیں۔ غرض طوائف الملوکی کے اس زمانے میں جموں واقعی ایک دارالامن کا درجہ حاصل کر چکا تھا جہاں بیرونی حملہ آوروں کے شکار لوگ پہونچتے ہی تسکین و راحت محسوس کرنے لگتے۔

جموں کی سلامتی و سکون کی شہرت سن کر دور دراز علاقوں سے مختلف کام دھندوں میں یکتا کاریگر اور ہنرمند بہت بڑی تعداد میں یہاں آ بسے اور پھر ان کی کوششوں سے اور مہاراجہ کی حوصلہ افزائی کے طفیل شہر کے عین وسط میں میل دو میل کے رقبے میں ایسا شاندار بازار تعمیر ہوا جس کی زیبائش اور آب و تاب ناقابلِ تشریح تھی جب ۱۷۸۳ء میں فارسٹر جموں پہونچا تو سکھوں کی لوٹ مار اور غارتگری کی وجہ سے حالانکہ شہر کے پرانے ٹھاٹ نہ رہے تھے اور نہ آب و تاب تاہم وہ یہ لکھنے پر مجبور تھا۔

"اسقدر تنزل کے بعد بھی یہ شہر یقیناً ایک اعلیٰ درجے کا تجارتی مرکز ہے۔"

توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کے اس پچھڑے زمانے میں مہاراجہ رنجیت دیو کی بے تعصبی کسی معجزے سے کم نہیں۔ انہوں نے مسلم رعایا کو مکمل مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ انکی رہائش کیلئے شہر کا ایک الگ حصہ مخصوص کر رکھا تھا جہاں عبادت کی خاطر مسجد تعمیر کروا کر مہاراجہ نے اپنی مذہبی رواداری اور روشن خیالی کا ناقابلِ تردید ثبوت دیا۔ جارج فارسٹر اپنے سفرنامے میں رقمطراز ہے:-

"جموں[1] کے موجودہ راجہ کا والد رنجیت دیو بڑا قابل اور روشن خیال حکمران تھا اس نے مسلم تاجروں کی خاص طور سے حوصلہ افزائی کی اور اسطرح جموں کی

1: George Forster: A Journey : P. 283-85

تجارت کو قابلِ قدر تقویت پہونچائی۔ اس نے اُن کے لئے ایک الگ محلّہ عطا کیا جسے مغلپورہ[1] کا نام دیا اور جہاں مسجد تعمیر کروا کر ایسی فراخدلی کا ثبوت دیا جس کی دوسری مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ شہر کی گشت کے دوران اگر مسجد میں اذان گونج اٹھتی تو وہ گھوڑا روک لیتا اور اذان ختم ہونے تک نہایت احترام کے ساتھ وہیں کھڑا رہتا تھا"

فارسٹر نے اپنے سفرنامہ میں ایک اور اہم واقعہ درج کیا ہے کہ ایکبار تقلید پسندی و تعصب کے شکار چند ایک ہندوؤں نے مہاراجہ کے حضور میں شکایت کی کہ مُسلم آبادی چمڑے کے برتن استعمال کر کے کنوئیں کا پانی ناپاک کر رہی ہے لہذا حکم صادر فرمایا جائے کہ وہ آئندہ دریا سے پانی بھر کر لایا کرے۔ مہاراجہ نے انکی درخواست رد کرتے ہوئے فرمایا کہ پانی تمام بنی نوع انسان کیلئے خدا کی ایک ایسی متبرک دین ہے جو کسی ایک قوم یا طبقے کے چھونے سے ہرگز ناپاک یا غلیظ نہیں ہو سکتی۔ اس واقعہ سے مہاراجہ رنجیت کی دور اندیشی اور بے لاگ پن کا مزید ثبوت مِلتا ہے

یہاں کی خوشحالی اور مہاراجہ رنجیت دیو کی شفقت و سرپرستی کی شہرت سنکر تاجروں اور کاریگروں کے علاوہ فنکاروں اور شاعروں نے بھی یقیناً جموّں کا رخ کیا ہوگا لیکن بدقسمتی سے اسوقت کی ادبی اور فنی سرگرمیوں کو قلمبند نہیں کیا گیا ہے۔ بہر حال مہاراجہ کے دورِ حکومت میں برج بھاشا کے کہنہ مشق شاعر دیوی دِتّہ (دَتّو) نے قابلِ قدر کام کیا وہ کبھڈ کا رہنے والا تھا اور ۱۷۷۱ء میں جموّں آیا تھا۔ اپنی اہم تصنیف "دیر وِلاس" میں اس نے مہاراجہ کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:۔ "چرنجیت[2] رنجیت نرپ"۔ اس کتاب کے علاوہ دتو کی درج ذیل تصنیفات قابلِ ذکر ہیں:۔

---

[1] اس محلے کو اب ست گڑھ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

[2] مہاراجہ رنجیت دیو کی عمر دراز ہو۔

۱:۔ برج راج پنچاسیکا

۲:۔ بارہ ماہ

۳:۔ رُت سنگرہ

۴:۔ کلبویت دیوگ

۵:۔ امرت دیوگ

۶:۔ کمل نیتر ستوتر

مہاراجہ رنجیت دیو کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ انکے عہد حکومت میں ہی جموں میں مصوری کا ایک منفرد اسکول ظہور میں آیا۔ آرچر کی تحقیق کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ سن ۱۷۳۰ء سے لیکر ۱۷۸۵ء تک جموں میں مصوری کے کئی ایک نمونے تخلیق کئے گئے۔ ان دنوں زیادہ تر پورٹریٹ ہی بنانے کا رواج تھا۔ گو شروع شروع کی اِن تصویروں پر بسوہلی قلم کی چھاپ نظر آتی ہے تاہم ۱۷۴۰-۸۵ء کی تصاویر بالکل انفرادیت کی حامل ہیں۔ جنہیں کھنڈالوالا نے "قبل کانگڑہ قلم" کے نام سے منسوب کیا ہے۔ اس قلم کا سب سے پرانا نمونہ ۱۷۴۸ء کا ہے۔ یہ جسروٹہ کے مشہور مصور پنڈت سیو کے سب سے بڑے بیٹے نین سکھ کی تخلیق ہے جسمیں مہاراجہ رنجیت دیو کے سب سے چھوٹے بھائی راجہ بلونت سنگھ کو چند موسیقاروں کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نین سکھ نے بلونت سنگھ کی روزمرہ زندگی سے متعلق، بہت سی تصاویر بنائیں۔

نین سکھ کے علاوہ پنڈت سیو کے تین اور بیٹے مانک نِکا اور رام لعل بھی فن مصوری میں ماہر تھے۔ مانک نے گُلیر میں نِکا اور رام لعل نے پہلے جسروٹہ، پھر جموں اور آخر گُلیر میں کام کرتے ہوئے جموں قلم کے خزانے میں قابل قدر اضافہ کیا۔ غرض مہاراجہ کا عہد حکومت محض اقتصادی ترقی، تجارتی فروغ مذہبی رواداری اور خوشحالی کے لحاظ سے ہی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ یہاں ادبی، فنی اور ثقافتی سرگرمیاں بھی جاری و ساری تھیں۔

اس طرح بُلند اقبالی اور انتہائی کامیابی کے ساتھ ۵۷ برس حکومت کرنے کے بعد ۱۷۸۱-۸۲ء میں مہاراجہ رنجیت کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور اُنکے جانشین برج راج دیو نے ۲۲ اپریل ۱۷۸۲ء کے دن عنان حکومت سنبھالی۔

دیوان کرپارام نے فارسی سوانح "گلاب نامہ" میں سلطنت جموں کے اور ڈوگرہ ثقافت کے حقیقی بانی عظیم مہاراجہ رنجیت دیو کو خراج پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"۵۷ برس تک انہوں نے اپنی حکومت کا علم بُلند کئے رکھا۔ اس عرصہ میں انکی عالمگیر شہرت اور مرحوم کا ڈنکہ بجتا رہا اور آخر کار ۲۲ چیت ۱۸۳۸ بکرمی (۱۷۸۱-۸۲ء) کے زلف آسیب موت کے نقاب سے اپنا چہرہ ڈھک کر تہیشہ ہمیشہ کیلئے پردۂ پوشیدگی میں گم ہو گئے۔"

علماء و شعراء

پروفیسر پی۔ این پشپ

کھیشمندر

سنسکرت ادب کو کھیشمندر نے جو کچھ اور جتنا کچھ دیا ہے اس کی بھرپور نوعیت کو سمجھنے کی ابھی کوشش ہوئی ہی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ سنسکرت ادب کی تاریخ مرتب کرنے والے عالموں نے اس نرالے قلم کار کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ کیتھ ایسے عالم نے بھی اس پر بہت سطحی نظر ڈالی ہے اور اس کی کئی تصنیفات کو محض بسیار گوئی یا تلخیص کا نتیجہ بتا کر ایک لحاظ سے ناقابل اعتنا ہی ٹھہرا لیا ہے۔ لیکن اس کی تمام تصنیفات پر گہری نظر ڈالئے تو انکی اہمیت کے کئی خد و خال ابھر آتے ہیں اُن تصنیفات کی اہمیت بھی نمودار ہو جاتی ہے جنہیں اکثر کتابی سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔

کھیشمیندر کا جنم ۹۹۰ء کے آس پاس ہوا تھا اور ۱۰۶۵ء تک وہ بقید حیات تھا۔ غالباً اسکے بعد بھی چند سال زندہ رہا۔ اس کے باپ کا پردادا نریندر تھا جو مہاراجہ جیاپیڈ (۷۷۰ء-۸۱۲ء) کا وزیر تھا۔ باپ کا نام تھا پرکاشیندر جو سنسکرت کا عالم اور کرم کانڈ (ہندوؤں کی مذہبی رسومات) کا ماہر تھا۔ شروع شروع میں کھیشمیندر نے اپنے باپ ہی سے درس لیا ہوگا۔ بعد میں وادی کی مشہور درس گاہوں میں خاطر خواہ تعلیم حاصل کی ہوگی اور اپنے طور بھی گہرا مطالعہ کیا ہوگا۔ لیکن علم و ادب کی باریکیاں سمجھنے کیلئے آچاریہ ابھنوگپت جیسے عالم با عمل یکتائے روزگار استادوں سے بھی فیض یاب ہوا۔ آچاریہ سوریہ تری کے بارے میں خود ہی لکھا ہے کہ "انکے ہاتھوں ہر شاستر شدھ ہو جاتا تھا"۔ رامہ یش اور سہجانند جیسے ہمدموں نے اسے گوناگوں چیزیں لکھنے کی تحریک کی تھی، شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد تھی جن میں راجکمار اور امیرزادے بھی شامل تھے۔ ان میں سے بھی کچھ ایک کے لئے خاص طور اونچے درجے کی چند ایسی کتابیں تیار کیں جو دوسروں کے بھی کام آتی رہیں۔ بودھ قصے لکھنے میں اُس ویربھدر نے رہنمائی کی جو بقول کھیشمیندر "بودھ شاستروں

پر رتن دیپ کی طرح نور برساتا تھا۔"

کھیشمیندر نے سنسکرت زبان اور ادب کے وسیع سمندر کو خوب کھنگالا تھا۔ رامائن، مہابھارت اعد پران کے علاوہ لوک ادب، جنسیات، معاشیات، شعریات، جمالیات اور عروضیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ شروع شروع میں (مہابھارت کے) ویاس سے خاص طور متاثر تھا۔ جبھی بڑے فخر سے اپنے آپ کو 'ویاس داس' جتلاتا تھا۔

کھیشمیندر کی گھریلو زندگی کے بارے میں ہمیں بہت کم معلوم ہے۔ تصنیف کا کلمۂ اختتامیہ سے فقط یہ بات عیاں ہے کہ اسکے ایک بیٹا تھا سومیندر جسے اُس نے اِس قابل بنایا تھا کہ اُسکے اُودان کلپ لتا نام والے کادیہ کا آخری (یعنی ۱۰۸واں) اُودان لکھ سکے (اودان بودھ اصطلاح میں اُس قصے کو کہتے ہیں جو بدھ کے کسی گذشتہ جنم سے وابستہ ہو) چنانچہ سومیندر نے اس کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ [اُسکے لکھے اُودان (جیموت واہن اُودان) کی منفرد حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا] تکملہ ہوتے ہوئے بھی یہ اُودان اپنے آپ میں ایک مکمل کادیہ جاتا ہے۔ ۲۰ اُودان کے تمہیدی اشعار میں سومیندر نے بجا طور اپنے باپ کے شاہکار کا فخریہ انداز میں ذکر کیا ہے اور دعا کی ہے کہ آب و آتش کی آفات معادی سے محفوظ رہکر یہ شاہکار نیک بندوں کے دلوں کو فرحت بخشتا رہے۔

کھیشمیندر کی تصنیفات تیس ۳۰ سے اوپر ہیں، جنکا موضوعاتی تنوع حیران کُن ہے۔ انداز بیان اکثر حکایاتی ہوتے ہوئے بھی پہلو دار ہے۔ موضوعات خصوصاً سماجی ہیں، جن میں موقع اور محل کے مطابق اساطیری لوک ادبی، اخلاقی، مذہبی، نیم تاریخی اور سیاسی آثار بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے سماجی تانے بانے میں عقل و دانش کے کرشمے بھی بُنے گئے ہیں۔ حماقت اور بددماغی کے کارنامے بھی۔ نیک کرداری کے دل خوش کُن منظر بھی پیش کئے گئے ہیں، بدکرداری کے ہولناک سانحے بھی، تدبیر آفرینی کے عوامل بھی، تقدیر پرستی کے عواقب بھی، ظرافت کے شگوفے بھی، طنز کے تیر و نشتر بھی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ کھشیمندر کو اپنے شاگردوں سے ذہنی لگاؤ تھا۔ چنانچہ ان کی فرمائش پر بھی کئی ایک چیزیں لکھیں۔ مثلاً: علم عروض پر سُس وِرِتّ تلکم (: عروض کا جھومر)، شعریات پر کوِی کنٹھا بھرن (: شاعر کے گلے کا ہار) اور شعری جمالیات پر اَوچتیہ وِچار چرچا (: شعری موزونیت پر سوچ وچار) جس میں شعری آہنگ کی رُو سے حرف کی صوتی موزونیت، لفظ کی معنوی موزونیت، فقرے اور جملے کی اجمالی موزونیت کے علاوہ عروضی موزونیت اور صنائع و بدائع کی موزونیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ حُسن و قبح کی وضاحت کے طور اپنی تصنیفات سے بھی بیسیوں مثالیں پیش کی ہیں اس عمل میں انہوں نے رو رعایت کئے بغیر جس بے باکی کا ثبوت دیا ہے، اسے دیکھ کر قاری دنگ رہ جاتا ہے۔ تجزیہ کرتے وقت دوسروں کا ہی نہیں، بلکہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں پر بھی بڑی ایمانداری سے پردہ سرکایا ہے۔

غالباً منجری کاویہ (: اکتسابی یا تلخیصی منظومات) کہلانے والی تینوں تصنیفات بھی کھشیمندر نے اپنے شاگردوں کے لئے تیار کی تھیں۔ ان میں سے بھارت منجری ویاس کے مہابھارت سے ماخوذ ہے، رامائن منجری (یا رام کتھا سار) والمیکی رامائن پر مبنی ہے، اور برہت کتھا منجری گنادھیہ کی اس برہت کتھا کی تلخیص ہے جو پیشاچی زبان میں لکھی گئی بتائی جاتی ہے۔ موضوعاتی اکتساب اور تلخیص کے باوجود یہ تینوں منظومات (جیسا کہ پہلے بھی اشارتاً لکھا جا چکا ہے) انداز بیان کی رو سے منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ محل اور موقع کے مطابق مقامی رنگ اُبھارنے کی جو خوبی کھشیمندر کی دوسری منظومات میں موجود ہے، وہ یہاں بھی نظر آتی ہے۔

مقامی رنگ اُبھارنے کی بات چھڑی تو یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ دشاوتار چرِتم، (: دس اوتاروں کا تذکرہ) نام کی تصنیف میں بھی جس کا موضوع پرانوں سے ماخوذ ہے۔ اور اساطیری نوعیت کا ہے کھشیمندر نے اپنے زمان و مکان کا مقامی رنگ بھرنے کی معقول گنجائش نکال ہی لی ہے۔ بُدھ کے پچھلے جنموں کی روایتی حکایات پر مبنی اَودان کلپ لتا میں بھی یہ کام بڑی خوبی سے نبھایا گیا ہے۔ اور تو اور ایسے نازک مرحلوں پر بھی جہاں مقامی رنگ

اُبھارنا خطرہ مول لینے سے کم نہیں تھا۔ کھشیمندر نے بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ مثلاً سماج کی معاشی لوٹ کھسوٹ میں اندھا دھند مچانے والے کائستھوں کی خبر لیتے وقت یہ تمہید باندھی ہے کہ جی میں محض ہنسی مذاق کیلئے بیتے ہوئے زمانے کے کائستھوں کی کردار نگاری کرنے لگا ہوں (یعنی: اپنے زمانے کے کائستھو یہ نہ سمجھو کہ میں تمہاری بات کر رہا ہوں۔ اس میں بھلا بگڑنے کی بات ہی کیا ہے!)

یہ مقامی رنگ جن تصنیفات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ دراصل اپنے عصری دور کے خدوخال ابھارنے کی غرض ہی سے شعر کے سانچے میں ڈھالی گئی ہیں۔ اور مجموعی طور طنز و مزاح کا رنگ لئے ہیں۔ یہ ہیں: کَلا وِلاس، دیشوپدیش، دَرپ دَلَن، سَمَیہ ماتِرکا اور نَرم مالا۔ جن منظومات کا موضوع محض اخلاقی اور تلقینی ہے اُن میں یہ رنگ لازمی طور بہت کم اُبھر پایا ہے مثلاً چَترُوَرگ سنگرہ (: دھرم، ارتھ، کام اور موکش کے بارے میں) اور چارُ چریا (: طریقِ احسن) میں (جہاں عملی کردار کی چند ایک خوبیوں کو الگ الگ ایک ایک مثالی قصہ بیان کر کے واضح کیا گیا ہے)۔ ہاں، سیویہ سیوکوپدیش (: پند نامۂ مخدوم و خادم) کے اخلاقی تانے بانے میں بھی مقامی رنگ بآسانی پہچانا جا سکتا ہے۔

کھشیمیندر کی آدھ درجن سے زیادہ تصنیفات معدوم ہو چکی ہیں، لیکن ان میں سے جو اقتباسات اَوچتیہ وِچار چرچا، سُوِرت تِلکم اور کَوی کنٹھابھرن میں شامل ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر کی ادبی تاریخ میں ان کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ اِن میں سے پَدیہ کادَمبری صریحاً بان بھٹ (ساتویں صدی) کے شاہکار کادمبری کا منظوم روپ تھی واتسیاین سوترسار واتسیاین کے مشہور کام سوتر کی منظوم تلخیص تھی۔ چِتر بھارت مہابھارت کا ایک منظوم قصہ تھا۔ کنک جانکی راماین سے ماخوذ تھی، جب کہ نیتی کلپ لتا اور لوک پرکاش سماجی سیاسی موضوعات پر دستور العمل طرز کی دو تالیفات بھی کھشیمندر کے نام سے منسوب ہیں، حالانکہ جس صورت میں یہ شائع ہوئی ہیں وہ نہایت مسخ شدہ معلوم ہوتی ہیں۔ خصوصاً لوک پرکاش جس کے چند ایک اجزا پر شاہجہان

کے مغلیہ عہد کی چھاپ بھی عیاں ہے۔ کلہن نے کھیشمندر کی جس نرپاولی (: شاہنامہ) کو تواریخی شہادت کے اعتبار سے ناقص پایا تھا۔ وہ بھی اب معدوم ہے۔ مل پاتی تو اس کی شعری خصوصیات واضح ہوجاتیں۔

خیر کھیشمندر کی ذہن اتنی ہمہ گیر ہوتے ہوئے بھی جس خصوصیت کی وجہ سے بالکل نرالی ہے وہ ہے طنز و مزاح جس کی نظیر سنسکرت ادب میں بہت کم ملتی ہے۔ اس سے پہلے بھی بے شک چند طنزیہ اشعار یا قطعات سنسکرت میں لکھے گئے تھے، لیکن متفرقہ جات کی ضرورت میں لکھے گئے تھے، ایک جداگانہ ادبی صنف کے طور نہیں۔ ہاں دامودر گپت (آٹھویں صدی) کے کُٹنی مَتم (: ہدایت نامہ کُٹنی) میں بلاشبہ اس صنف کو برتنے کے چند کامیاب تجربے ملتے ہیں لیکن یہ تجربے بھی ضمنی طور ہیں، جداگانہ طور نہیں۔ جینت بھٹ (نویں صدی) اپنے ناٹک آگم اڈمبر میں ضرور ریاکاروں کی مذہب بازی کا تمسخر اڑاتا ہے، اور طنز و مزاح کے تیکھے وار کرتا ہے۔ تاہم کھیشمندر کے بعد اس صنف کیطرف ماسوائے کلہن (بارھویں صدی) کے کسی نے دھیان نہیں دیا۔ کلہن نے راج ترنگنی میں کہیں کہیں اسے خوب برتا ہے، لیکن اسکے ہاں بھی اسے جداگانہ حیثیت دینے کی چنداں گنجائش نہیں تھی۔

اس طرح کھیشمندر سنسکرت طنز و مزاح کے میدان کا اکیلا شہسوار جان پڑتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ کشمیر کے سنسکرت ادب ہی میں نہیں، بلکہ ملک بھر کے سنسکرت ادب میں یگانہ حیثیت کا مالک ہے اس ضمن میں یہ قابل ذکر ہے کہ کھیشمندر نے اپنی طنزیہ نگارشات کو ست پکش رکشا کشم" یعنی درست موقف کو استوار کرنے میں موثر جان کر ہی اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ ساتھ ہی اُسے اس بات کا اعتراف تھا کہ

"ہنسی مذاق سے انتہائی شرمندگی اٹھا کر کوئی بھی شخص بداطواری کا شکار نہیں ہوجاتا ہے جبھی اس کی بھلائی کیلئے طنز و مزاح کے اس منصوبے کا آغاز کرتا ہوں۔ (دیشوپدیش ۱) ۔ ہنسی مذاق کو ایک ادبی حربہ بنانے کی اس شعوری کوشش کے باوجود کھیشمندر ایک چابکدست طنزنگار کیطرح

گوناگوں حیلوں سے کام لیکر اپنے قاری کا دل موہ لیتا ہے۔ کبھی فرد کی کمزوری سے پردہ سرکاتا ہے، کبھی گروہ کی دستبردی کو بے نقاب کرتا ہے، کبھی خوش فہمی کی چٹکی لیتا ہے، کبھی سنک پر ہنسی مذاق کی بوچھاڑ کرتا ہے؛ کبھی سادہ لوحی کی تضحیک کرتا ہے، کبھی مکاری کا بخیہ اُدھیڑ کے رکھ دیتا ہے؛ کبھی مالک کی سنگدلی پر چوٹ کرتا ہے، کبھی چاکر کی بوالہوسی کی دھجیاں اڑاتا ہے۔

اخلاقی بے راہ روی اور معاشی لوٹ کھسوٹ کی جس صورت حال کے خلاف کھیشمبندر نے ادبی جہاد شروع کیا تھا اس میں کائستھ (کارندۂ سرکار) کی کلیدی حیثیت تھی۔ جبھی اُس پر پیہم ادبی کاری چوٹ کرتا رہا۔ تاہم اس کے غیض و غضب اور انتقامی ردعمل سے بچنے کیلئے اُس نے لطیف مصلحت سے کام لیا۔ نرم مالا میں اُس نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ میں تو محض ہنسی مذاق کیلئے گزرے ہوئے زمانے کے کائستھوں کے کرتوت سنانے لگا ہوں اور اسی ضمن میں بداطواری کی کھلی اڑا رہا ہوں۔

کلاوِلاس میں بھی بداطواری اور بے راہ روی کی متنوع موشگافیوں کی قلعی کھولنے کے بعد کھیشمبندر نے اپنے قارئین کو تاکید کی ہے کہ ان ہتھکنڈوں کو بے شک سمجھ لیا جائے، ان پر عمل نہ کیا جائے! گویا کہ بداطواری کی طرف لے جانے والی خامیوں اور کمزوریوں پر سے پردہ سرکا کر اور دُرست موقف کی تائید میں آواز اُٹھا کر ہی کھیشمبندر ہنسی مذاق کو حق بجانب قرار دیتا ہے۔ اسی غرض سے اس نے بالخصوص دیشوپدیش، نرم مالا، درپ دلن، سمیہ ماترکا اور سیویہ سیوکوپدیش میں سماج کی کم ظرفیوں کوتاہیوں اور کمزوریوں پر طنز و مزاح کے تیر برسائے ہیں۔ وار کسی پر سیدھا ہے، کسی پر آڑا ترچھا، لیکن دونوں صورتوں میں کارگر ہے۔ آڑا ترچھا وار کرنے کی ضرورت اسے خاص طور ان منظومات میں پڑی ہے۔ جن کا موضوع اکتسابی ہے یا عصری دور سے بالواسطہ تعلق نہیں رکھتا۔ مثلاً وشاد تار چرتم میں جس کی پورانک مضمون بندی کے روائتی تاروپود میں بھی عصری حیثیت کے بیل بوٹے بڑی خوبی سے بنے گئے ہیں۔ چنانچہ کلجگ کی اندھیر گردی کے ضمن میں کھیشمندر نے مظلوموں کی ایک فریاد قلمبند کی ہے:

"گرۂ ارض اب کھشتریوں (: عوام کے محافظوں) سے محروم ہو چکا ہے۔ دھرتی کے والی کہلانے والے اب تو محض نام کے کھشتری رہ چکے ہیں۔ جنہیں شہریوں کے محافظ سمجھا جاتا رہا ہے وہ اب جان و مال پر ڈاکہ ڈالنے والے جابر بن چکے ہیں۔ اب کے بھوپال (: والیٔ ملک) تو ستم رسیدہ عوام کی چیخ و پکار کے تئیں بہرے ہیں، طاقت کے نشے میں چور اندھے ہیں، انصاف کے بارے میں خاموشی برتتے ہیں، دل کے کالے ہیں جو ہمیشہ لوگوں کو ستانے پر تلے ہوئے ہیں۔"

یہ اظہار صورت حال کا ایک حقیقت پسندانہ بیان ہی نہیں بلکہ اس صورت حال کے خلاف ایک شدید احتجاج بھی ہے جسے کشمیر کے چند ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے روا رکھا تھا، اور شر انگیز کائستھوں نے سفاکانہ انہماک سے بڑھاوا دیا تھا۔ کھیشمندر کا ذاتی مشاہدہ ہے کہ:

"خزانۂ عامرہ سمندر ہے تو کائستھ وَڈواگنی (: بحری آگ)"

دِوِر (: دبیر) کہلانے والے کائستھوں کی عیاری کے بارے میں کھیشمندر رقمطراز ہے!

"یہی تو ہیں جو عوام کو نگل جاتے ہیں، موت بیچاری یونہی بدنام ہے!"

"اندھیرا پاکھ کے گھٹاٹوپ اندھیرے کی طرح مہیب یہ دِوِر سینکڑوں طرح کے مکر و فریب کے قلعوں میں پناہ لیتے ہیں" (کلاوِلاس سے)

"پونم کے چاند کی طرح بھرپور لہلہاتی فصل کو انہی دِوِروں کی چالبازی نے راہو کی کلا کی طرح ہڑپ کر لیا" (کلاوِلاس سے)

"انہی بھیس بدل کر ٹھگنے والے لٹیروں نے مالامال دھرتی کو نادار کر ڈالا ہے" (نرم مالا سے)

کھیشمندر کے دُکھی دل کی دھڑکن درد بھرے انداز میں چیخ اُٹھی!

"ہائے ری پرجا، تو کہاں جائیگی، جب دھن کے نشے میں چور راجا، نیچ، فتنہ پرور، ابن الوقت کرسی اقتدار سنبھالے گا!"

نرم مالا میں کائستھ کی شر انگیز شخصیت کے خوفناک خدوخال یوں اُبھارے گئے ہیں۔

„ نقد شماری اور غبن میں پشاچوں کی طرح بے باک، بھاری بھرکم ڈنڈوں سے لوگوں کو بے حال کرنے والے یہ ملک الموت کے ہرکارے، بھوج پتر (: دستاویزوں) کا پرچم لہراتے ہوئے کھل کھیل رہے ہیں۔"

(دستاویزی) بھوج پتر کا پرچم لہرانے والے، (کھیمشمندر کے الفاظ میں بھوُرج دھوجارہ) کیا چیست فقرہ ہے جو آجکل کے ان فائل برداروں کی یاد دلاتا ہے جو دفتری سیاہ سفید کے مالک ہیں، گڑل مال اور ہیرا پھیری میں کائستھ کی مہارت کا کہنا ہی کیا۔

„ جو فقط ایک لکیر مٹا دینے سے مثبت کو منفی میں تبدیل کر ڈالتے ہیں۔"

قلم کے دھنی اِن محرروں، مُنشیوں اور دبیروں کے کاغذات (توز) پر رقم کئے گئے ٹیڑھے میڑھے حروف (اور اعداد شمار) "چندن کے پیڑوں سے لپٹے کالے ناگ کنڈلی مارے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جن پر نظر ڈالتے ہی مجبور عوام مارے وحشت کے پکار اُٹھتے ہیں:

„ واہ ری محترمہ (بی بی) سیاہی جو ہر منصوبے میں مکمل کامیابی بخشتی ہے۔ واہ رے بارسوخ قلم جو کملا (: ثروت) کا آسرا ہے!" (نرم مالا سے)

" اُسکے قلم سے چونے والی سیاہی کے قطرے ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے لُٹتی ہوئی دھرتی کی غمناک آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں کی سُرمہ دُھلی (کالی کالی) بوندیں!"

کلاولاس میں یہ سانحہ یوں بول اُٹھا ہے:

„ کائستھوں سے لٹی ہوئی راج لکشمی (: شہنشاہیت) مغموم ہو کر سُرمہ دُھلے آنسو بہا رہی ہے"

مارگ پتِ (افسرِ مال) جب کسی گاؤں میں قدم دھرنے تو بیچارے گاؤں والوں کی شامت آجاتی ہے یوں سمجھئے کہ:-

„ گاؤں کی مچھلیوں کو نیست و نابود کرنے کیلئے کوئی بوڑھا بگلا آ پہنچا!" (نرم مالا)

اپنے افسرِ اعلیٰ کے تئیں بے رُخی کا دکھاوا اس کی ایک پیشہ ورانہ چال ہے۔ بھولے بھالے عوام کو مرعوب کرنے کیلئے وہ انہی کے سامنے احکامات والے اُس کاغذ پر تھوک دیتا ہے جو افسرِ اعلیٰ

کی جانب سے آیا ہے۔ لیکن کسی بھی افسر اعلیٰ کے آ پہنچنے کی دیر ہے کہ منتری [illegible] بن جاتا ہے اور نمک سے پرہیز کر کے مونگ کے چند ایک دانوں پر ہی گزارہ کرنے کا ڈھونگ رچاتا ہے حالانکہ اسکے معمول کا کھانا پُرمصالحہ مُرغن گوشت کے بغیر ادھورا رہتا ہے۔ آج کے پٹواری کا پیش رو گرام دوو (گاؤں کا کائستھ) بھی اپنی قلم کے ہی بل بوتے پر دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا ہے۔ لہٰذا وہ اس قلم کو بڑے بانکپن سے چلاتا ہے۔ اور صریرِ خامہ سے بھولے عوام کو مبہوت کر دیتا ہے۔ کچہری کے دیویروں (یا محرروں) کی خونخواری کا کہنا ہی کیا؛ بدقسمتی سے کوئی ان کی گرفت میں آ گیا تو!

"خونخوار کتوں کی طرح اسکی ہڈی بھی باقی نہیں چھوڑتے!"

حاکم شاہی کی ریشہ دوانیوں سے لوگوں کو خبردار کرتے ہوئے کھیمندر آواز دیتا ہے۔

"بھورج بھٹا (ہ) بھینکرا (ہ)!"

"یعنی! بھوج پتر (کے دفتری کاغذات) کی نگہداشت کرنے والے حضرات بھیانک ہیں!"

لیکن کھیمندر اس مخدوش صورتحال کیلئے اکیلے کائستھ ہی کو گردن زدنی نہیں ٹھہراتا، بلکہ ان شر پسندوں کے مکمل گٹھ جوڑ کو آڑے ہاتھوں لیتا ہے کیونکہ کائستھ تو اس چنڈال چوکڑی (گمبھیر چکڑی) کا ایک حربہ ہی تو ہے جو عوام کی بربادی کے سامان کرتی رہتی ہے۔ کھیمندر کے الفاظ میں:

"مُنتر سینایَتِ دوا (ہ) سَتھ سبھایَتِ پُروہِتے (ہ)۔ اَنکورِ ژُرو وِلوتان بانِ بھ (ہ)
کنٔپیتا (ہ) برجا (ہ)" (درشاونار چرت سے)

[یعنی منتری (: وزیر اعلیٰ)، سیناپتر (: سپہ سالار)، دوارہ ستھ (: وزیر خاص)، سبھاپتہ (: قاضی)) اور پروہت،

"جن کی ہتھیلیاں ہر ہمیشہ رشوت کی رقوم کیلئے تُلی رہتی ہیں، انہی نے پرجا کا کچومر نکال دیا ہے۔"

حاکم شاہی کی رعونت پسندی کا یہ عالم تھا کہ: "نیوگی کی زبان پر سے [illegible] و متاع کی قرقی، قید و بند، گرفتاری اور مسماریٔ مکان ایسے الفاظ کبھی دور بھاگتے ہی نہیں تھے!"

اس طرح کی پُرمعنی پھبتیاں کس کر کھیمندر اپنے قاری کو ہنسنے یا ہنسی مذاق سے حظ اٹھانے کی تحریک کرتا ہے۔ ساتھ ہی رہ رہ کر وہ جنتا کے بھلے کی دہائی دیتا ہے اور ان تمام [illegible]۔

کے خلاف آواز بلند کرتا ہے جو جنتا کا استحصال کرنے پر کمربستہ رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عوام کی زندگی کا اس نے قریب سے مشاہدہ کیا تھا اور انکے سکھ دکھ سے ذہنی طور وابستہ تھا۔ اُن سے بے نیاز رہنا تو کئی دوسرے سنسکرت شعراء کی طرح یا تو مہا کاویہ کی گھسی پٹی روایت کا بوجھ ڈھوتا پھرتا، نہیں تو حُسن و عشق کے ہوائی قلعے تعمیر کرنے میں ہی اپنی کامرانی سمجھتا، برعکس اسکے کھیشمندر کی منظومات میں ہمیں موضوع اور ہیئت کی ایک حیران کُن غیر معمولیت ہی نہیں، بلکہ ایک دلکش عصری تازہ گی بھی ملتی ہے۔

کائستھ کی رعونت پسندی کے پس منظر میں چاکر کی بے بسی کا یہ سماں کتنا دردناک ہے:-

" مالک کے سامنے جھکتے ہوئے چاکر کی نظر اُس پیٹ پر پڑتی ہے جو اُسکی بیچارہ گی کا مول کارن ہے۔ بیچارہ مارے خجالت کے زمین کو کھودنے لگتا ہے۔ مانو اسی کے اندر سما جانے کی کوشش کر رہا ہو۔"

" کیا ستم ظریفی ہے کہ امید کے آسیب سے مغلوب اِن ملازموں کے جُڑے ہوئے ہاتھ اِن کے سروں پر چاکری کا پرچم بن کر لہرا رہے ہیں۔ دل میں واماندہ گی کا احساس ہے اور (اسکے باوجود) ثنا خوانی کا راگ ہے۔"

" کسر نفسی اور جی توڑ محنت کے باوجود یہ چاکر سب کی آنکھوں میں کھٹکتا رہتا ہے۔ کپڑوں کے اندر پھنسی ہوئی مکھی کی طرح یہ چاکر بھلا کیسے ہراسان نہیں ہوتا!"

ملازمت کی تلاش میں سرگرداں بیکار کی بے بسی کا یہ قلمی چہرہ آج بھی اتنا ہی تازہ لگتا ہے جتنا کھیشمندر کے عہد میں رہا ہوگا!

" قوی بازو والے دربانوں نے اسے دروازے پر کھڑا رہنے کیلئے خوب جھڑکا، پھر بھی۔۔ دروازہ پٹکنے کی کرخت آواز پر دانت پیستا ہوا چاکر آگے کھڑے امیدواروں کی ٹانگوں کے بیچ میں سے اندر جانے کی کوشش میں جھکا ہوا خاموش لوٹ کر باہر آنے والے اُمیدواروں سے پوچھتا ہے۔ کیوں بھئی کچھ ہونے والا ہے بھی کہ نہیں!" (سیوبہ سیوکوپدیش سے)

بیکار کی کس مپرسی پہ تشویش ظاہر کرنیکے باوجود کھیشمندر چاکر کی چاپلوسانہ روش کی کھلی

اُڑاتا ہے:

"آنکھ جمی ہے دروازے پر، ہاتھ جُڑے ہیں، بندگی میں، زبان محو ہے ثنا خوانی میں (اور) سر جھکا ہے تعظیم میں، ارے ان چاکروں نے تو اپنے جسم کو کلیتاً پرَدپکار (فلاح عامہ) کے لئے وقف کر رکھا ہے"

صورت حال نے مالک اور چاکر دونوں کو اندھا کر رکھا ہے۔

"مالک بھی اندھا، چاکر بھی اندھا!
ایک نخوت سے، دوسرا لالچ سے
کون بھلا کس کے چہرے پر دیکھتا ہے
اس چہرے پر جو دھن کی گرمی یا ناداری کی بے بسی سے مسخ ہو چکا ہے!"

ذکر آچکا ہے کہ کھیشمندر کو اپنے شاگردوں سے بڑی شفقت تھی، لیکن سبھی استادوں کی طرح آسودہ حال اور فارغ البال نہیں تھے۔ ایسے مفلوک الحال استادوں کی کبھی کمی نہ تھی جو ٹکڑے ٹکڑے کو ترستے تھے اور بال بچوں کا پیٹ پالنے کیلئے طرح طرح کے پاپڑ بیلنے پر مجبور رہ جاتے تھے۔ انہی مفلوک الحال میں سے ایک کا المیہ یوں ہے:

"اسکی پگڑی تار تار ہے جسکے اوپر سے کنارے والے دھاگے لٹک رہے ہیں۔ میلے کچیلے انگرکھے پر سینکڑوں ٹانکیاں سلی ہوئی ہیں۔ پھٹی پرانی چادر ہے جیتھڑے بغلوں کے قریب کس کر چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مانگ کر لائی ہوئی سوکھی اینٹھی جوتی سے بیچارے کے پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں"

اور ادھر:

"اسکی گھروالی نے پھٹے پرانے کپڑے کی ایک لیر سے کمر کے آس پاس جسم کے حصے کو ڈھانپ لیا ہے
اسکی ناک کی نوک کاجل سے مٹ میلی ہے۔
کان سے مٹی کے زیور آویزاں ہیں
بھوک کے مارے بلبلاتے بچوں پر غصہ اگل رہی ہے۔

ماتھے کو چھاج کے آدھے حصے سے ڈھک لیا ہے۔

دفعتاً وہ اپنے چوتڑ کھجلاتی ہوئی ٹھوکر کے اٹھ کھڑی ہو گئی!" (نرم کلا سے)

دیشوپدیش میں سے ایک ذخیرہ اندوز کا یہ قلمی خاکہ آج کل کے ذخیرہ اندوزوں کی ایک دیرینہ روایت کی نشاندہی بھی کرتا ہے:

"سچ تو یہ ہے کہ اس لالچی نے غاصبوں کے غاصب کال (: دماں مرگ) کو بھی بھلا دیا ہے۔ جبھی تو ساٹھ سالہ پرانا اناج بیچنے سے دریغ کرتا ہے۔ خشک سالی ہو تو خوب ناچتا ہے، زیادہ برسے جب بھی ناچ اٹھتا ہے۔ دھان کے نرخوں میں اضافہ ہی ہوگا، اسی خیال سے قحط کی آفت سماوی کا منتظر رہتا ہے۔"

کھیمشمندر کی منظومات میں طنز و مزاح کا دائرہ ویسے تو بہت وسیع ہے، لیکن اس وسیع دائرے کے اندر کئی چھوٹے چھوٹے دائرے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ گھریلو زندگی کا بھی انہی میں سے ایک دائرہ ہے۔ بڑھاپے کی شادی بہت قدیم سماجی سانحہ ہے کھیمشمندر نے (دیشوپدیش میں) اپنے زمانے کے اس سانحے کو بھی ہنسی مذاق کا موضوع بنایا ہے:

"جینے سے بیزار ہے، سانس پھولی ہے، آنکھوں کو کچھ سوجھتا نہیں! (پھر بھی) گھن پیدا کرتا ہوا بڑھا کنواری کو بیاہنے آ ہی گیا۔ مانو (اس بیچارے کیلئے) تپ دق مجسم ہو کر آ دھمکا ہو" سٹھیایا خاوند اپنی نئی نویلی دلہن کی خوشامدیں کرتے تھکتا نہیں۔ اپنے بے دانت منہ سے رال ٹپکاتا ہوا اس سہمی ہوئی معصومہ کی منت سماجت کرتا ہے۔ آخر بیچاری اسکے جھانسے میں آ کر ایک مشکوک ماں بن جاتی ہے تو اڑوس پڑوس کی عورتوں کو ہنسی مذاق کا ایک نادر موقع مل جاتا ہے۔ وہ طرح طرح کی پھبتیاں کستی ہیں:

"بوڑھے کے گھر بیٹا ہونے کی تقریب پر وہ عورتیں ناچ ناچ کر گانے لگتی ہیں کہ گھن لگے بوسیدہ پیڑ سے ایک تازہ کونپل پھوٹ پڑی ہے۔"

مہاجن کے داؤ پیچ بھی کھیمشمندر کی تیز بین نظروں سے اوجھل نہ رہے۔ ایک مجبور قرض خواہ اپنی

جائیداد رہن رکھکر قرض مانگنے آتا ہے تو مہاجن حیلے بہانے سے ٹال دیتا ہے۔ آخر اتنی کڑی شرطوں پر قرض دیتا ہے کہ مول (اصل زر) سے سود بڑھ جاتا ہے اور جائیداد چھن جانے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے

کھیئشمندر نے اپنے اہم پیشہ برادری پر بھی ایک معنی خیز نظر ڈالی ہے۔ انہی میں سے ایک نمایاں چہرہ اس نوخیز عالم کا ابھرتا ہے جو حسد کی آگ میں جل کر دوسروں کا کام بگاڑنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے، ہائے رے! نوخیز عالم کے بگڑتے رنگ ڈھنگ دیکھکر ایسا لگتا ہے کہ بیچارے پر بھیانک بخار کا دورہ پڑنے والا ہے۔ (جبھی) اسکی گردن اکڑ گئی ہے، پرائے کے عروج کی بات سنتے ہی (بیچارے کو) سرسام ہو جاتا ہے۔ آپے سے باہر ہو کر بغیر مطلب کے ٹہلتا رہتا ہے، اناپ شناپ بکتا رہتا ہے، نہایت ہی بوکھلایا ہوا ہے۔ اندر ہی اندر کڑھ رہا ہے۔ اور پیش نہ چلنے کے باعث غیض و غضب سے گرم آہیں بھر رہا ہے۔"

اسطرح کھیئشمندر نے بڑی چابکدستی سے ادب اور سماج کے رشتے کو استوار کیا اور ادبی اظہار کی نئی نئی راہیں نکالیں۔ بھولیے گا نہیں کہ ایسا کرتے ہوئے اس نے نہ صرف انحطاط کی گرفت کو ڈھیلا کروایا، بلکہ روایت کی فرسودہ قدامت پسندی کے خلاف بغاوت بھی کی۔ چنانچہ عصری حقیقتوں کو منعکس کرنے کی گنجائش اس نے دشاوتار چرتم جیسی منظومات میں بھی نکالی جو ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ نظم کے آغاز پر متسیاوتار (مچھاوتار) کے ضمن میں ایک ننھی سی مچھلی کے منہ سے یہ دعا کرائی ہے۔

"ہے دیا ساگر (الرحمٰن الرحیم) موٹی مچھلیوں سے سہمی ہوئی ہوں، مجھے بچاؤ۔ بھوکے زور آور ہر ہمیشہ کمزور کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ دھن رہا ہی نہیں، رہا بھی تو بہت تھوڑا وہ بھی مال حرام ہے، اسلئے رہنے نہیں پاتا۔ داہنے ہاتھ کو بایاں ہاتھ ٹھگ رہا ہے، بائیں کو داہنا ہاتھ!"

اسی طرح وامن اوتار کے بیان میں تفاوت زر کی سماجی کرشمہ سازیاں یوں منعکس ہوئی ہیں۔

"سرمایہ دار مردہ تو شرادھ کی تقریب پر اعزا و اقربا کی ضیافت طبع کے طفیل زندہ ہی رہتا ہے۔ (جب کہ) نادار اپنے رشتہ داروں کو نہ کھلا سکنے کے باعث جیتے جی بھی مرا ہوا ہے۔"

"گُن ملتے ہیں تو دھن سے گُنوں سے دھن نہیں ملتا۔ دھنی والا گنیوں کا مخدوم ہے، گنی دھنیوں

کا نہیں۔"

"زندہ باد بولنے والے تو اپنی مطلب برآری ہی کیلئے حکمرانوں کی خدمت میں جُتے رہتے ہیں زر کا رشتہ کٹ جاتے پر کون ہے مالک اور کون چاکر؟"

"کیا ستم ظریفی ہے کہ انسانی وجود دونوں کا ایک سا ہے۔ ہاتھ پیر ہیں تو دونوں کے پھر بھی ایک کہلاتا ہے پربھو (مالک) اور دوسرا داس (چاکر)!"

اسلوب کے لحاظ سے مصنف نے طنز و مزاح کے کئی پیرایوں کو اپنایا ہے۔ کہیں پر ستم ظریفی کہیں پر پھبتی، کسی پر تمسخر، کسی پر تضحیک، کسی پر ظاہرہ تضاد بیانی کہیں پر ظاہری بد لفظی، کہیں پر پیروڈی اور کہیں پر کارٹون نویسی، غرضیکہ گوناگوں حربے ہیں، گوناگوں استعمال!

اختتام پر مصنف کی ایک نہایت حیران کن جدت طرازی کا نمونہ پیش کرنے کی گنجائش نکالنی ہی پڑے گی۔ جدت طرازی کے اس شہ پارے کا عنوان ہے: 'دُبھارچن' (یعنی پوجا کا ڈھنگ) پس منظر یوں ہے کہ ایک نیوگی (افسرِ اعلیٰ) دکھاوے کیلئے مندر میں جاکر قادرِ مطلق کے حضور میں ایک شستہ اور بلیغ (دعائیہ) گیت پڑھنے بیٹھ جاتا ہے۔ زبان سے اس گیت کا ایک بول گاتا ہے اور سر دُھنتا جاتا ہے۔ لیکن من ہی من اپنی جبلت سے مجبور ہو کر بول کی اُس نظیر پر غور کرتا ہے جس میں اسکا جابرانہ اور غاصبانہ کردار حرکت میں آجاتا ہے۔ گیت پڑھکر نیوگی دہایا، کی دہائی دیتا ہے۔ آنسوؤں کی دھار بہاتا ہے، مندر کے گھڑیال کو اتنا زور سے بجاتا ہے کہ کان بہرے ہوئے جاتے ہیں۔ پھر گیت گنگناتا ہوا نیوگیوں کے مجمع میں جا پہنچتا ہے ـــــ شہ پارے کا خاکہ کچھ اسطرح کا ہے!

(زبان سے) "جھکتا ہوں! اسکو جو سرِ سنا ابدی کا مجسمہ ہے، برکات بے نہایت کا باعث ہے۔"

(من ہی من) "جو سامنے کی شیخی سے گریز کرنے والے لوگ جائداد کی ترقی کے بعد گردن زدنی ہیں۔"

(زبان سے) "(جھکتا ہوں) مصائب کو دور بھگانے والے اُس چدرُوپ برہم (مجسم آگہی) کو!"

(من ہی من) "عوام کو کچل ڈالو تو ویسے ہی ادائیگی کرتے ہیں جیسے سرسوں کے بیج کچلے جاکر تیل دیتے ہیں"

قدیم سنسکرت ادب میں شعور کے دھارے کی کرشمہ سازی کا غالباً یہ پہلا اور ایک ہی نمونہ ہے ●●●

پروفیسر مرغوب بانہالی

مُلّا احمد کشمیری

شہمیری دور یوں تو بحیثیت مجموعی کشمیر کی تمدنی تعمیر نو اور علمی ترقی کا درخشندہ دور رہا ہے۔ سلطان شمس الدین شہمیر کی بلند ہمتی، سلطان شہاب الدین کی وسیع پرچم کشائی اور سلطان قطب الدین کی بے مثال خداترسی و صلح کوشی نے ایک طویل دورِ انحطاط کے بعد تاریخ کشمیر میں انسان دوستی اور عظمتِ اخلاق کے نئے باب کھولے ہی تھے۔ لیکن اُن تمام فلاحی خاکوں کو یکجا کر کے اُن میں رنگ بھرنے کی سعادت کشمیر کے جس عظیم اور مثالی بادشاہ کے حصے میں لکھی گئی تھی۔ وہ سلطان زین العابدین بڈشاہ تھا۔ قطب شاہ۔ اکبر بادشاہ، جہانگیر اور شاہجہاں جیسے مشہور بادشاہوں کیلئے ایک نمونہ اور پیشرو کا درجہ رکھنے والے اس عظیم کشمیری تاجدار کے دربار سے آسمان ادب کے جن ستاروں کا جھُرمٹ وابستہ رہا ہے۔ اُن میں سے تابناک ترین ستارے کا درجہ ملا احمد کشمیری کو حاصل تھا۔

تاریخ ادبیات کشمیر کے ایک طالب علم کو مُلّا احمد یا مولانا احمد نام کے کئی ادیبوں اور شاعروں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جن میں سے ایک کا تعلق بڈشاہی دور سے پہلے کے زمانے کے ساتھ ایک کا تعلق خود ملک الشعراء موصوف کے اپنے زمانے سے اور دوسروں کا تعلق بعد کے زمانے سے رہا ہے۔ ملّا احمد کے اپنے زمانے سے پیشتر کے ادیب اور عالم کو ہم تاریخ میں دو حیثیتوں سے جانتے ہیں۔ ایک بابا بُلبُل شاہ ترکستانی کے ہمدم کی حیثیت سے دوسرے سلطان شہاب الدین کیلئے چند کتابیں لکھنے والے اور ملا احمد کے دادا کی حیثیت سے۔ البتہ اس کا نام اکثر تاریخوں میں مولانا احمد علامہ کے طور پر لیا گیا ہے۔ ہم عصر ملا احمد کو مولانا احمد رومی کی حیثیت سے شہرت رہی ہے۔ آپ کا بھائی بھی پائے کا عالم

اور ادب دوست تھا جنکا نام مولانا محمدؐ رومی تھا۔ بڈشاہی دور کے بعد گذرے ہوئے اس نام کے عالموں اور ادیبوں میں چک دور کا ملا احمد۔ تذکرہ خوارق السالکین کا مؤلف ملا احمد ہادی اور بحر الانساب میں مشاہیرِ کشمیر کی تاریخ ہائے وفات قلمبند کرنے والا ملا احمد شامل تھے۔ موخر الذکر نے اپنا نام احمد کشمیری کے طور ہی زیادہ لیا ہے۔ لیکن تاریخیں نظم کرنے کا اس سے منسوب سلسلہ چونکہ چک دور کے بعد بھی جاری دکھایا گیا ہے اسلئے وہ لازماً بڈشاہی عہد کے ملا احمد اور چک دور کے ملا احمد سے مختلف معلوم ہوتا ہے بڈشاہی دور کے سب سے ممتاز شاعر ملا احمد کو کشمیر کا پہلا ملک الشعراء ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا اور کشمیر میں سنجیدہ علمی کاموں کی نئی داغ بیل ڈالنے والوں میں آپ کو ایک اہم ترین بانیٔ تمدن کا درجہ بھی حاصل تھا۔ اسلامی طرز کے فن تاریخ نویسی کو رائج کرنے کے سلسلے میں بھی آپ کی اوّلیت مُسلّم ہے۔ مولانا احمد علامہ کا نواسہ ہونے کے علاوہ آپکو وقت کے جید عالموں سے استفادۂ علوم کا نہایت ساز گار ماحول میسّر ہو گیا تھا۔ چنانچہ آپ کو ملا فضل بخاری جیسے اس عالم متبحر اور صدر المدرسین کے شاگردوں میں سرفہرست رہنے کا شرف بھی حاصل تھا جو سلطان سکندر کے زمانے میں بخارا سے آ کر کشمیر میں تدریسی کام میں زبردست تبدیلی لانے کا باعث بن گئے تھے۔[1]

ملا احمد کشمیری کے خاندانی کوائف اور ذاتی حالات بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔ آپکی تاریخ ولادت اور سال وفات کے متعلق بھی تاریخوں میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ درج کی ہوئی نہیں ملتی بلکہ ملا احمد کے اصلی وطن سے متعلق چہ میگوئیوں کی گنجائش پیدا ہونے میں بھی اسی مواد کی کمیابی کا براہ راست دخل معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً مورخ محمدؐ دین فوق اور علامہ ہدایت اللہ نے لکھا ہے کہ آپ جوانی کے دنوں میں کشمیر آ کر آباد ہوئے تھے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ انکے برعکس ایک قریب العصر مورخ بدایونی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ملا احمد کشمیری کا تعلق شاہ آباد ڈورو کے مردم خیز علاقے سے تھا۔[2] ڈاکٹر صوفی محی الدین نے بھی اپنے تحقیقی مقالے میں اسی بیان کی پذیرائی کی ہے ویسے تو دیگر مصاحبین سلطان زین العابدین میں صرف آپکا کشمیری نسبت سے معروف ہونا بجائے خو

---

[1] کشمیر ج ۱ ص ۱۶۳ [2] کشمیر ج ۱ ص ۱۶۲

خود آپ کے کشمیری النسل ہونے کا بڑا ثبوت ہے۔

ملا احمد نے بے تکلفی کے تحت اپنے نام احمد کو ہی تخلص کے طور پر استعمال کیا ہے۔ آپکے دستیاب کلام سے بھی صرف اسی تخلص کی توثیق ہوتی ہے۔ اس بات کا اندازہ بعض آثار و قرائن سے ہو جاتا ہے کہ ملا احمد کشمیری نے کافی لمبی عمر پائی تھی۔ اس بات کے بھی تاریخی شواہد مل جاتے ہیں کہ وفات پانے کے بعد ملک الشعراء ملا احمد کو پورے شاہی اعزازات کے ساتھ مزار سلاطین المعروف ملک پورہ سرینگر میں دفن کیا گیا تھا۱؎

ملا احمد کی شگفتہ اور رنگین شخصیت میں کئی پہلوؤں کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ چنانچہ آپ بڈشاہ کے طویل تمدن ساز اور باوقار عہدِ حکومت میں ایک اعلیٰ پایہ شاعر، ایک صاحب طرز مورخ ایک بالغ نظر تذکرہ نویس، ایک منفرد مفسرِ کلام علمدار کشمیر، ایک ممتاز مزاح نگار، ایک ماہرِ لسانیات مترجم اور ایک مایہ ناز بدیہہ گو کی سطح پر اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ ایک شگفتہ مزاج اور پختہ کار شاعر کی حیثیت سے آپ سلطان زین العابدین کے بے تکلف ترین مصاحبوں میں شامل تھے۔ وہ ذہانت و فطانت اور لیاقت و صلاحیت جو ملک الشعرائی کے جلیل القدر عہدے کیلئے مطلوب ہو سکتی تھی۔ خاص طور پر اس روایت کے مطابق جس کے تحت ایران کے عظیم غزنوی دربار کے اولین ملک الشعراء عنصری سے لیکر برصغیر کے مشہور مغل دربار کے آخری ملک الشعراء میرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب تک اس عہدے پر تقرری عمل میں آتی رہی ہے۔ حقیقت میں ملک الشعرائی ایک اہم عہدے پر تقرری ہونے سے زیادہ ایک اہم ادارے کے قیام اور نظام کا نام ہوا کرتی تھی۔ جس کی ذمہ داریوں میں بادشاہ وقت کی مدح سرائی میں کی جانیوالی طبع آزمائی کو سلیقہ بخشنا تمام اہم شاعروں کے کلام کو شاہی دربار میں پیش ہونے کے قابل بنانے کی خاطر اس کی نوک پلک سنوارنا اور ان لوازمات کے ساتھ بادشاہ کو خوش رکھنے کی کوشش ایک ہمہ وقتی مصاحب کی حیثیت سے انجام دیتے رہنا شامل ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ملا احمد ان تمام انتظامی صلاحیتوں سے بھی متصف رہا ہے۔

۱؎ تاریخ حسن ج ۱ ص ۵۳

ایک صاحب طرز مورخ کی حیثیت سے ملا احمد کشمیری نے کشمیر کے ایک قدیم حکمران مہاراجہ اونتی ورمن کے معاصر مورخ رتناکر کی لکھی ہوئی سنسکرت تاریخ رتناکر پران کو چند قابل قدر اضافوں کے ساتھ فارسی میں منتقل کیا تھا۔[1] اور اس کارنامے کو "وقایع ملک کشمیر" کے نام سے ترتیب دیا تھا۔[2] بعض محققوں نے ملا احمد کے اس کارنامے کا ماخذ رتناکر پران کے بجائے کلہن پنڈت کی راج ترنگنی کو مانا ہے۔ ان کی نظر میں وقائع کشمیر راج ترنگنی کا براہِ راست ترجمہ تھی۔[3] لیکن جس مورخ نے وقائع کشمیر کا ایک نسخہ پانے اور اسکو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ ٹھوس حوالوں سے اس ترجمے اور اضافے کو رتناکر پران سے وابستہ گردانتا ہے۔ ایسا مورخ تاریخ حسن کا مصنف ہے۔ چنانچہ موصوف اور باتوں کے علاوہ اسی ناطے سے وقائع کشمیر کو راج ترنگنی کے راجگانِ گمشدہ کی اطلاعات بہم کر سکنے کا باعث قرار دیتا ہے۔

اس ضمن میں ایک مشہور ایرانی عالم اور محقق آقای سعید نفیسی کی اس دلچسپ رائے سے بالواسطہ حوالے کی کمی کے باوجود صرف نظر نہیں کیا جاسکتا جس کے تحت ملا احمد کشمیری کی مذکورہ تاریخ کو سنسکرت کے بجائے کشمیری سے فارسی میں کیا گیا ترجمہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ واضح الفاظ میں لکھا گیا ہے "ملا احمد تاریخ کشمیر را از زبان کشمیری بفارسی ترجمہ کردہ است"۔[4]

ایک تذکرہ نویس اور ممتاز شارح کی حیثیت سے ملا احمد نے علمدارِ کشمیر حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ المعروف نندہ ریشی کے کارناموں اور انکے خلیفوں کا حال مراۃ الاولیاء نام کی کتاب میں تفصیل کیساتھ درج کیا تھا۔ جیساکہ خود کتاب کے نام سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وقائع کشمیر کیطرح دستیاب نہ ہو نیوالی تمدن کشمیر سے وابستہ یہ اہم دستاویز یعنی مراۃ الاولیاء ایک تذکرہ نہیں بلکہ شیخ نورالدین نورانیؒ کے کلام بلاغت نظام کو کشمیری سے فارسی میں منتقل کرنے کی کاروائی تک محدود تھی۔[5]

ایک مترجم کی حیثیت سے ملا احمد نوشہرہ سرینگر میں قائم کئے گئے دارالترجمہ کے اراکین میں سب سے ممتاز تھے۔ بلکہ آپ ہی اس اہم تمدن ساز ادارے کے بانی کار تھے۔[6] دارالترجمہ کے رکن

---

[1] تاریخ حسن ج ا ص ۵۳ [2] ڈاکٹر صوفی کشیر ج ا ص ۱۶۳ [3] تاریخ نظم و نثر در ایران بحوالہ تذکرہ شعرای کشمیر (ڈاکٹر راشدی) ج ا ص ۷۷ [4] محمد اسلم منعمی مخطوطہ تاریخ گوہر عالم ص ۱۶۲ [5] تاریخ بڈشاہی ص ۲۹۵

رکین کی حیثیت سے منجملہ دیگر کارناموں کے ملا احمد کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستان کی سب سے لمبی رزمیہ نظم مہابھارت کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ تھا۔ یہی وہ کارنامہ ہے جس نے ملا احمد کشمیری کو مغل اعظم اکبر کے دربار سے وابستہ عالموں اور مترجموں کا حقیقی پیشرو بنا دیا ہے۔ بلکہ فارسی مہابھارت اور بحرالاسمار جیسے کارنامے بڈشاہی عہد کے اس میر مترجم کی طرف ان صلاحیتوں کا اعتراف نہیں کراتے کہ آپ اپنی مادری زبان جیسی ہی دسترس عربی سنسکرت اور فارسی پر بھی رکھتے تھے۔ بلکہ اس بات کی بھی توثیق کراتے ہیں کہ آپ ایک منفرد اسٹائل والے نثر نگار گذرے ہیں۔ اسی طرح آپ کا بیشتر کلام تلف ہو جانے کے باوجود آپ کے ایک صاحبِ دیوان شاعر ہونے میں شک کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی بذلہ سنجی اور بدیہہ گوئی میں مُلّا احمد کشمیری کی طبیعت باغ و بہار واقع ہوئی ہے۔ دستبردِ زمانہ سے آپکی شوخی و طراری کا آئینہ دار کلام تلف ہو جانے کے باوجود اس ضمن میں چند اہم اور دلچسپ ثبوت فراہم ہو گئے ہیں۔ جن میں سے بعض کا نذرِ قارئین کیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

یہ بات پہلے ہی زیرِ بحث آچکی ہے کہ اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والا بڈشاہ المتخلص قطب اسی شاعر کو اپنی فکر کا بذلہ سنج سمجھتا تھا اور اِسی وجہ سے پوری بے تکلفی اختیار کر کے اُسے اپنی طنز و ظرافت کا ہدف بنا تا رہتا تھا۔ اس سلسلے میں خوش قسمتی سے کئی واقعات تذکروں میں درج ہو کر محفوظ کر لئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر لکھا گیا ہے کہ مُلا احمد ایک خاص ڈھنگ سے پگڑی باندھ کر دربار میں آتا تھا اور وہ پگڑی لبہ اوقات درباریوں کو ملا احمد کی عجیب و غریب شخصیت کی طرف یوں متوجہ کر دیتی کہ دربار میں جاری کاروائی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتی تھی۔ شملہ بقدر علم لمبا رکھنے کا رواج ہونے کے باوجود ملا احمد کی پگڑی کا چھوٹا تو کدار شملہ اسکی پیشانی پر ایک گینڈے کے سینگ کی طرح آگے کو جھکا رہتا تھا۔ ایک بار ملا احمد اسی چال ڈھال سے دربار میں داخل ہو رہے تھے کہ بڈشاہ کو پھبتی سوجھی کیونکہ اس روز شملہ معمول سے قدرے لمبا ہونے کے علاوہ ماتھے کی جانب پوری تیزی کے ساتھ اُبھر آیا تھا۔ اسلئے بڈشاہ نے سرِ محفل اپنے ملک الشعراء پر یہ شعر چسپاں کر لیا؎

شاخ بر پیشانی مُلّا احمد کشمیر بین
گر ندیدستی تو در آفاق انسان شاخدار[1]

[1] کشیر ج ۱ ص ۱۶۳

حضرت ذوالقرنین کا واقعہ شاہد ہے کہ سر پر سینگ رکھنے والے شخص کو بھی سینگوں والا کہنا گوارا نہیں ہوتا چہ جائیکہ شملے کی آڑ میں ایک عالم متبحر پر بھری محفل میں یوں حملہ کیا جائے۔ بس یہی احساس تھا جس نے ملک الشعراء کو لال پیلا بنا دیا۔ اس نے ہزار چاہا کہ سنگ آمد و سہل آمد کے مصداق جوابی کاروائی نہ کرے تاکہ بادشاہ کی شان میں کوئی گستاخی واقع ہو جانے سے تاک میں رہنے والے دشمنوں کو اُچھالنے کا موقع نہ مِل سکے۔ لیکن اندر چھپے ہوئے بدیہہ گو شاعر نے اسکو چپ کے کب بیٹھنے دیا۔ چنانچہ چند ہی لمحوں میں وہ سنبھلا اور پلٹ کر پوری جرأت اور مہارت کے ساتھ آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ شعر

چُست کرلیا۔ ؎ شاخِ پیشانی خدیوا، کرگ واری داشتم
تا نیایم درمیانِ مادہ گاوان درشمار[۹۲]

یہ شعر جس میں ملا احمد نے اپنے آپکو معنی آفرینی اور بدیہہ گوئی کا گینڈا ثابت کرتے ہوئے بادشاہ سمیت تمام درباریوں کو طعنہ زنی کرنے والی پست مخلوق یعنی صف مادہ گاوان میں شامل رہنے والی مخلوق قرار دیا ہے۔ مختلف تذکروں میں مختلف غلطیوں کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صوفی نے اپنی کتاب کشمیر کے صفحہ ۱۶۳ (جلد ۱) میں غلطی سے انسانِ شاخسار لکھا ہے۔ اسکے برعکس مورخ فوق نے تاریخ بڈشاہی کے صفحہ ۲۹۳ انسانِ شاخوار درج کیا ہے۔ اور یہ بھی غلط ہے۔ مورخ پیر غلام حسن نے شعر تو املا کی صحت کے ساتھ نقل کیا ہے البتہ ڈاکٹر صوفی کی طرح آپ نے بھی کرگ کا مفہوم غلط ظاہر کیا ہے۔ حالانکہ کرگ فارسی لفظ کرگدن کا مخفف ہے جسکا مطلب گینڈا ہوتا ہے۔

زندہ دلی کے باوجود ربط و ضبط کا زبردست خیال رکھنے والے عظیم کشمیری سلطان بڈشاہ نے ہنسی مخول کا یہ سلسلہ اپنے عالی ظرف ملک الشعراء کے علاوہ کسی دوسرے درباری کے ساتھ روا نہ رکھا تھا شاید یہ جان کر کہ جب ہنسی مذاق حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو بے حیائی کی شکل اختیار کر کے نظم و نسق میں زبردست رخنہ ڈالنے کا باعث بن جاتا ہے۔ حالانکہ کمال شستگی و احتیاط کے باوجود بڈشاہ کے ساتھ ملا احمد کی بے تکلفی اور مذاق نے بھی ایک وقت ایسی صورت اختیار کر لی کہ بڈشاہ نے ملا احمد کے مخول کو گستاخی پر محمول کر لیا۔ اُدھر تو اُسکے بادشاہ کیساتھ بے تکلفانہ تعلقات دیکھ کر جلنے والے درباریوں کی

کوئی کمی نہ تھی۔ انہوں نے ملا احمد کی معصومانہ گستاخی میں مرچ مصالحہ لگا کر اپنی مبہمات اور تاویلات سے آگ پر تیل چھڑکا اور بادشاہ کو اس حد تک مشتعل کر لیا کہ اس نے ملا احمد کو ملکِ کشمیر سے نکل جانے اور جلا وطنی کی زندگی اختیار کرنے کا حکم دیدیا اور مُلا احمد "مرتا کیا نہ کرتا"، کے مصداق ناچار ترک وطن کر کے (ضلع ہزارہ) پکھلی کی جانب روانہ ہوگیا۔ لیکن ابھی وہ پکھلی کے قریب پہنچ بھی نہ پایا تھا کہ اپنی چھٹی حس نے اُسکو بادشاہ کی طرف بزبان شعر رجوع کرنے اور کنایتاً اشتعال دلانے والوں کی امکانی چہ میگوئیوں کی نشاندہی کرنے کی تحریک دی اپنی چھٹی حس کے اس فیصلے کو بروئے کار لا کر مُلا احمد نہ صرف دوبارہ بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بلکہ غلط فہمی کا ازالہ ہوتے ہی بادشاہ نے اسکو پورے احترام کے ساتھ دربار میں واپس بُلالیا۔ ظاہر ہے کہ ملا احمد کے جس خط نے جادو کا سا اثر دکھا کر دربار میں موجود اُسکے دشمنوں کو اچنبھے میں ڈالدیا تھا۔ وہ کیونکر نثر میں ہوتا۔ آخر ملک الشعرائی کے اہل ہونے کا ثبوت تو اسکو شاعرانہ ڈھنگ سے ہی دینا چاہئے تھا۔ آثار و قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ پکھلی سے بھیجا گیا پورا خط نظم میں ہی تھا۔ مورخ پیر غلام حسن نے موجود رہے ہوئے خط کے دو شعروں پر مشتمل حصے کو مثنوی کا قطعہ قرار دینے کے بجائے غلطی سے رباعی قرار دیا ہے چنانچہ لکھا ہے"

"ملا احمد در عہدِ او ملک الشعراء بود۔ ارباب بغض و حسد بعضی سخنانِ ناملائم از ملا احمد بعرض رسانیدند۔ و خاطر سلطان ازو منحرف گشتہ مولانا را از ملک اخراج نمود۔ مولانا از پکھلی این رباعی معروض داشت۔"

؎ نی بنجوم ز مبتدا خبری — نی بمنطق ز جزو کل اثری
برمن این کسر و جر چرا رانند — احمد از غیر منصرف خوانند

پہلے مصرعے کی عدم صحت سے قطعِ نظر ان دو شعروں کے تیور بتاتے ہیں کہ یہ ایک لمبے اور مفصل منظوم خط کے آخری دو شعر ہیں نہ صرف اسلئے کہ مقدار کی یہ کمی ملک الشعراء سے آنے والے خط کے شایانِ شان نہیں بلکہ ان سے بیشتر مدح و ثنا کا حق ادا کرنا حالات کے عین مطابق ہوتا۔ اور وہ حق ادا کرنیکے بعد ہی بگڑے ہوئے ماحول میں "رانند" اور "خوانند" کے معنی خیز جمع صیغے استعمال کئے جا سکتے تھے۔ اور

جبھی وہ اصل واقعہ کا احساس دلانے میں کارگر ثابت ہو سکے ہیں۔ پہلے شعر سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ حاسدوں میں جلن پیدا کرنے کا باعث ملّا احمد کی علوم متداولہ پر چھائی ہوئی شخصیت کے وہ سارے پہلو تھے جن میں مذکورہ صفات کے علاوہ آپکا علم نجوم اور علم منطق میں بھی مہارت رکھنا شامل تھا۔ مولانا عبدالوہاب شائق نے ان پہلوؤں کا ادراک حاصل کر کے ہی لکھا ہے۔

؎ من از مولوی ناظم خوش بیان   چہ گویم کہ بود از سخن پروران
زہر علم آگاہ بود و خبیر   بشعر و سخن داشت طبع منیر[۱]

اس خصوصی واقعہ یعنی بڈشاہ کے بگڑنے اور چند شعر دیکھ کر دوبارہ مہربان ہو جانے کی تفصیل بھی شائق مرحوم نے عمدہ ڈھنگ سے پیش کی ہے۔

؎ زہی مولوی احمدِ باکمال   ز ارباب طبع آن عدیم المثال
محیط علوم و فصیح و ظریف   بسلطان شب و روز گشتہ حریف
چوں در بزم سلطان شدی نکتہ سنج   بیک نکتہ اش شاہ دادی دو گنج
دگر بارہ سلطان شدش مہربان   ز بیکلی نمودش طلب در زمان
بسی کرد اعزاز و اکرام او   ز اقران فزودش دگر آبرو
برویش در لطف گفتگو دباز   شد از خلعتِ خاصِ شہ سرفراز[۲]

جس نابغہ روزگار کی شان میں بڈشاہ جیسا سلطان رطب اللسان اس قدر مہربان رہا ہو۔ اسکے خلاف سازشی عناصر کا سرگرم عمل ہونا ہی قابل فہم نہیں۔ بلکہ اپنے ہم عصروں پر ہر طرح کی برتری حاصل ہونا بھی ثابت ہے۔

فوق صاحب نے ملّا احمد کی اس برتری اور افضلیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"بڈشاہی دربار کے علمی مباحثوں میں جو نامور ادیب اور شاعر حصہ لیتے تھے ملک الشعراء ملّا احمد ان سب کا سرتاج تھا۔ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کی بدولت ملّا احمد

[۱] + [۲] ریاض السلام ص ۱۴۳

نے اپنے جلیل القدر اُستاد مُلّا محمد افضل بخاری کی زندگی میں ہی ملک الشعرائی کا خطاب حاصل کیا تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے بڈشاہ کے دارالترجمہ اور دارالتصانیف کا رکنِ رکین اور روحِ رواں بن گیا تھا۔“ [1]

اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ بعض قریب العصر تاریخوں میں کتابت کی غلطی سے ملّا احمد کا نام مُلّا محمد لکھا گیا ہے ایسی تاریخوں میں تاریخ فرشتہ بھی شامل ہے۔ البتہ اس تاریخ میں جن معنی خیز الفاظ میں مُلّا احمد کا واضح ذکر ہوا ہے اُن کا اردو ترجمہ پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے لکھا گیا ہے۔

”سلطان زین العابدین کے عہد میں مُلّا محمد نام ایک باکمال شاعر پیدا ہوا جس کا ذوقِ سلیم اس درجہ تک پہنچا ہوا تھا کہ ایک ہی نِشست میں جس بحر اور قافیہ میں آپ سے فرمائش کی جاتی تو آپ فی البدیہہ کئی کئی اشعار نظم کر دیتے تھے۔ بلکہ اسی انداز میں آپ کئی مشکل مسائل کا جواب بھی میسّر کر دیتے تھے۔ بادشاہ اس باکمال شاعر کی اور دیگر علمائے اسلام کی بیحد تعظیم و تکریم کرتا تھا۔“ [2]

اس طرح کے واضح بیانات سے ملّا احمد کی نکتہ سنجی اور اسکا صاحبِ دیوان شاعر ہونیکی بات بخوبی سمجھ آجاتی ہے۔ طبقات اکبری میں بھی ملّا احمد کی زبردست صلاحیتوں کا ایسے ہی الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔ البتہ وہاں پر نام کی غلطی نیا روپ دھار لیتی ہے۔ چنانچہ وہاں مُلّا احمد کے بجائے سُلطان محمود لکھا گیا ہے [3]۔ حالانکہ اوصاف وہی بیان کئے گئے ہیں جو مُلّا احمد کیلئے مخصوص ہیں۔ لیکن نام کے اس مغالطہ سے فوق صاحب اس قدر پریشان ہو گئے ہیں کہ انہیں اپنی تاریخ میں سلطان محمود نام کا ایک اور شاعر درج کرنا پڑا ہے [4]۔

مُلّا احمد کی زبردست صلاحیتوں کا معنی خیز اظہار کرنے والوں میں تاریخ ہادی یا خوارق السالکین کے مصنف کا نام بھی اہم ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:۔

---

[1] تاریخ بڈشاہی ص ۲۹۳ [2] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۲۷۲ [3] طبقات اکبری ۳ ص ۴۰۲ [4] تاریخ بڈشاہی ص ۲۹۶

مولانا احمد کشمیری آن نامدار ازین دیار در عہد پادشاہ کامگار سر بر آوردہ دادِ بلاغت داد و در فن شاعری چراغ سخن را منور گردانید۔

؎ بود احمد شمع بزم عاشقان
بود احمد نورِ چشم شاعران ۱؎

بیجا طوالت اور تحصیلِ حاصل نقولات سے احتراز کرنے کیلئے مُلا احمد کے چند شعر پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

خواجہ محمد اعظم دیدہ مری اور محمد اسلم منعمی نے اپنے اپنے تذکروں میں سلطان سکندر کی وفاتِ حسرت آیات پر مختلف شعراء کے لکھے ہوئے مرثیوں میں سے خصوصیت کے ساتھ مُلا احمد کے مرثیوں کا ذکر کیا ہے اور اُن میں سے یہ اشعار نقل کئے ہیں۔

؎ کجاست شاہ سکندر، کجاست میدانش
در انتظار رہا کند گوی ز چوگانش

؎ عجب کہ دیدہ شود گُل شگفتہ در گلزار   عجب کہ کبک خرامد بناز در کہسار
عجب کہ باغ بخندد چو مردم غافل   عجب کہ زاغ نگرید بسان ابر بہار
بآب دیدہ بشوئید ای مُسلمانان   زمین روضۂ شہ را برای استظہار
درین مزار بخواہید ہر چہ می خواہید   باعتقاد درست و درونِ بے انکار
خداشناس، پیمبر صفت، سکندر شاہ   کہ آفرینِ خُدا بر روانش باد ہزار ۲؎

ایک واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار بھکاری نے دربار سے نکلتے ہی اپنا کاسۂ گدائی بادشاہ کے سامنے یوں پھیلایا کہ بادشاہ کو بہت ناگوار گذرا۔ اظہار ناراضگی کے طور اس نے کاسہ کو جھٹکتے ہوئے کہا کہ یہ کاسہ تُم کو کس ظالم نے دیا ہے؟ مُلا احمد نے بات سے بات نکالکر نہ صرف بادشاہ کا غصہ فرو کرنے کی ترکیب شعر کے قالب میں

۱؎ خوارق السالکین (محفوظ ریسرچ لائبریری) ق ۱۲۱/ب ۔ ۲؎ واقعات کشمیر ص الم گوہر عالم ص ۱۷۱

ڈالدی بلکہ بھکاری کی ترجمانی کا حق ادا کرتے ہوئے بادشاہ کیلئے یوں لحۂ فکریہ پیدا کر دیا۔

؎ اے آنکہ ترا تاجوری داد و سری داد
در دستِ گدا کاسۂ دریوزہ گری داد ؎۱

کہتے ہیں کہ احساس ندامت طاری ہو جانے کے باوجود بادشاہ مُلا احمد کا یہ برجستہ اظہار دیکھ کر بے حد خوش ہو گیا اور اسکو انعام سے نوازنے کے علاوہ بھکاری کو بھی مالامال کر دیا۔

شہمیری دور کے ممتاز شاعروں میں شامل ملّا احمد کشمیری سے متعلق یہ تعارفی مضمون ادھورا رہے گا۔ اگر قریب العصر ہم نام شاعر کی واضح نشاندہی نہ کی جائے یہ بات عجیب اتفاق پر محمول ہوگی کہ کشمیر کا پہلا ملک الشعراء بھی ملّا احمد تھا اور آخری ملک الشعراء کا نام بھی ملّا احمد ہی تھا۔ البتہ پہلے ایک کا تعلق بڈشاہ کے زمانے سے اور آخری کا تعلق سلطان علی شاہ چک کے عہد سے تھا۔ دونوں کے ذوق شعر کی نشاندہی کے طور پر چند شعر مقابلے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

شہمیری دور کے ملّا احمد سے منسوب چند شعر

؎ از کوی کہ شُد موجِ خیالم کہ ازنجا
ہر کاوشِ دل گُل بہ کنار است دریں باغ
مرہون رگِ گُل بشدہ ہمہ نالۂ بُلبُل
زان سان کہ صدا در پی خُد است دریں باغ

؎ تا خبردار شُدم بے خبر خویشتم
نیستم نیستم اندر نظر خویشتم ؎۲

؎۱ ؎۲ تاریخ بادشاہی ص ۳۹

چک دور کے ملّا احمدؒ سے منسوب چند شعر

؎ مرتضیٰ آنکہ شہِ مسند عالی نسبی است
آفتابی است کہ برج شرفش دوش نبیؐ است

بسلسلۂ قحط در زمانِ علی شاہ چک

؎ گر نظر بہ ہلال می کردند
لب نانی خیال می کردند

اقبالؒ شناسی کی دنیا میں ایک گراں قدر اضافہ
شیرازہ
اقبالؒ نمبر

مدیر اعلیٰ: محمد یوسف ٹینگ

مدیر: رشید نازکی

علامہ اقبال کے فن فکر اور حیات پر مستند دستاویز جس کی سراہنا ہند و پاک کے متعدد فضلائے نے کی ہے۔

ناشر:۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

پروفیسر شفیع شوق

حبّہ خاتون

حبہ خاتون کی شاعری کا مطالعہ کرنے کیلئے اس کی صحیح تفہیم کیلئے اور اس سے لطف اندوز ہونے کیلئے حبہ خاتون کی سوانح کے مطالعہ کی ناگزیریت قابل غور ہے۔ حبہ خاتون نے تمام شاعروں سے بڑھ کر اپنی حسین مگر المناک زندگی کے ذاتی تجربوں کو ہی اپنی شاعری میں خصوصی ترجیح دی ہے۔ یوں تو غنائی شاعری لازمی طور پر داخلی ہوتی ہے کیونکہ اسکا تعلق براہ راست شاعر کی نجی زندگی سے ہی ہوتا ہے۔ مگر حبہ خاتون کی شاعری مکمل طور پر تمام قسم کی فکری، اخلاقی یا واعظانہ ظاہرداری سے آزاد ہے اور محض شاعرہ کے اپنے حسی تجربوں، تلخ یادوں، دھڑکتی آرزوؤں کا برملا اظہار ہے۔ حبہ خاتون کی زندگی اور حبہ خاتون کی شاعری درحقیقت ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ اسلئے انکی زندگی کا مطالعہ باقی شاعروں کے مقابلے میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے انکے سوانحی حالات ماسوائے چند نیم تاریخی روایات ماضی کے دھندلکے میں غائب ہیں۔ لیکن پھر بھی انکی زندگی کے بارے میں مقبول عام باتوں کی روشنی میں ایک زندہ جاوید عورت کی شخصیت ٹھیک طرح سے ابھرتی ہے۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ انکی زندگی کے ہر مرحلے کے ساتھ انکا کوئی نہ کوئی گیت مُنسلک ہے۔

عام روایت یہی ہے کہ حبہ خاتون دُہو پرگنہ کے چندرہار گاؤں میں پیدا ہوئی۔ والد کا نام عبدی راتھر تھا۔ اسکا نام "زون" (چاند) رکھا گیا۔ زون کی پرورش بڑے لاڈ پیار سے ہوئی اور اسے گاؤں کے ایک خواجہ مسعود نام کے ملا کے پاس قرآن شریف اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے بھیج دیا گیا۔ زون انتہائی ذہین لڑکی تھی جسکی وجہ سے وہ آس پاس کے علاقے میں مشہور ہوئی

باپ نے ایسا پسند نہ کیا اور اسکی شادی سن بلوغ سے پہلے ہی گاؤں کے ایک جاہل اوباش جوان کیساتھ کر دی جسکا نام عزیز لون تھا۔ لیکن سسرال میں زون کو آرام نصیب نہ ہوا اور اسے طرح طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ زون اپنے رنج و الم کا اظہار اپنے گیتوں میں کر کے اپنے دکھوں کو عارضی طور پر بھول جاتی۔ چنانچہ اپنے کچھ گیتوں میں اُسنے اپنی ساس اور باقی سسرال والوں کی دی ہوئی اذیتوں اور میکے کی میٹھی یادوں کا بھی اظہار کیا ہے۔ شوہر کا سلوک بھی بہت بُرا تھا جسکی وجہ سے وہ اسکے ساتھ نباہ کر نہ سکی۔ کہتے ہیں کہ ایک دن وہ کھیت پر کام میں مشغول اپنی سحر انگیز آواز میں اپنا کوئی نغمہ گنگنا رہی تھی کہ حُسنِ اتفاق سے وہاں سے کشمیر کا بادشاہ یوسف شاہ چک کا گذر ہوا۔ آواز کے جادو نے اسکے قدموں کو روکا اور وہ زون کو دیکھتے ہی اسکے حسن پر فریفتہ ہو۔ بادشاہ نے زون کو عزیز لون سے طلاق دلوا کر اپنی ملکہ بنایا۔ لیکن محل کی خوشیاں زون کے نصیب میں زیادہ دیر نہ رہیں ۱۵۸۶ء میں جب ہندوستان کے شہنشاہ اکبر نے کشمیر کو اپنے قبضے میں کر لیا اور یوسف شاہ چک کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا تو حبہ خاتون نے محل چھوڑ کر راہبانہ زندگی اختیار کی۔ مہجور، شاہ کی یاد میں گاتی رہی۔ زون زیادہ وقت تک اپنے محبوب کی جدائی برداشت نہ کر سکی اور اس دنیا کو رخصت کیا۔ اسے پانتہ چھوک کے مقام پر دریائے جہلم کے کنارے دفن کیا گیا۔[1]

حبہ خاتون زون کا تخلّص ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہ تخلّص اسکے استاد خواجہ مسعود نے اسے تجویز کیا ہے اور دوسری روایت ہے کہ یہ نام اس نے شاہی محل میں پہنچکر اختیار کیا۔ لیکن اسکے اپنے ایک گیت میں وجہ کچھ اور بتائی جاتی ہے۔

مالِنی میأنی ارباب آسی
توے درام حبَ خوتوٗن ناو
(میرے میکے والے رئیس تھے اسی لئے میرا نام حبہ خاتون مشہور ہوا)

---

[1] موجودہ تحقیق کے مطابق حبہ خاتون کا اصل مرقد بسوک (بہار) میں یوسف شاہ کے قدموں میں ہے۔ مرتب

اسی طرح ایک اور گیت میں یہ اشارہ کتنا بہت دلچسپ ہے۔

یار میٹھون جمالہٕ کٹھہٕ　　کمال تس چھُم ناو
سُہ تتہٕ، بہٕ کس مَنٹھہٕ　　اکہٕ لَٹہٕ ییہِ ہم نا

{ترجمہ:- میرا محبوب "جمالٹہ" (سرینگر کے ایک محلے کا نام) میں ہے، اسکا نام کمال ہے۔ وہ وہاں ہے اور میں یہاں کس کے سہارے۔ کاش صرف ایک بار آئے۔}

اس قسم کے اشارے اس شک کیلئے گنجائش رکھتے ہیں کہ حبہ خاتون کے گیتوں میں لوک گیتوں کی آمیزش ہے۔

بہرحال حبہ خاتون کی زندگی کے بارے میں یہی روایت تقریباً تمام مورخین نے کم و بیش قبول کی ہے، پھر ایک بار کہنا پڑتا ہے۔ احساس کمتری کے شکار ہمارے مورخین مرتکب ہیں کہ انہوں نے ہمارے ماضی کو ہم سے چھپا رکھا۔ چک دور کے تمام مورخین سید محمد مہدی، خواجہ محمد اعظم دیدہ مری، نراین کول عاجز، ملک حیدر چاڈورہ حبہ خاتون کے بارے میں مکمل طور پر خاموش ہیں۔ انکی خاموشی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ حبہ خاتون کوئی معمولی اور قابل فراموش شخصیت تھیں، ہمارے مورخین نے شیخ العالمؒ جیسی عظیم شخصیت کو بھی نظرانداز کیا ہے ــــ سب سے پہلے حبہ خاتون کا ذکر پنڈت بیربل کاچرو نے حبہ خاتون کے کوئی ڈھائی سو سال بعد اپنی تاریخ میں اس طرح کیا ہے:-

> یوسف شاہ چک، حبہ خاتون نام کی ایک محبوبہ سے، جو کہ حسن و جمال اور لہجہ و آواز میں بے مثال تھی، صحبت رکھتا تھا۔ تفصیل یہ ہے کہ اسکے آباد اجداد پرگنہ وُہو (پانپور) کے گاؤں چندہار کے رہنے والے تھے۔ جب وہ سن بلوغ کو پہنچی تو اس کی شادی اپنے ہی خاندان میں کروائی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد اپنی اقتضائے طبیعت کے باعث وہ کشمیری اشعار گانے لگی۔ جس پر اسکی سسرال کے تمام چھوٹے بڑے اسکو لعنت و ملامت کرنے لگے۔ آخر ایک دن اسکی سر چادر کے پلو میں خلع نامہ باندھ،

دیا گیا اور اسکے خاوند کے ہمراہ کسی بہانے گھر سے نکالکر میکے کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ اثنائے راہ میں یوسف شاہ کے ملازموں نے اسکی شکل و صورت کو دیکھا اور اسکی آوازِ شیریں کو سنا تو انہوں نے اسے حضور ولی نعمت کے پاس پہنچا دیا۔ وہ اسکے حسنِ صورت پر ہزار جان سے فریفتہ ہوا اور اسے اپنی ہم بستری کا شرف عطا کیا۔ ——— (پنڈت بیربل کاچرو مجموعۃ التواریخ ۱۸۳۵ء)

عبدالوہاب شائق نے بھی اپنی منظوم تاریخ   میں حبہ خاتون کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان چند اشعار میں اسکی پُر اسرار زندگی کا کوئی خاص پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ شائق کے الفاظ یوں ہیں

چوں بودہ است خاتون حبہ نام　　یکی عارفہ بود صاحب مقام
سخن ہائے خوش داشت آں نغمہ سنج　　بادشاہ بخشید صد روز گنج
کلامش بہ سوز و گداز آشنا　　ہمی داد با مردہ جاں از نوا
چو آں عارفہ نظم گوہر فشاند　　در و شعر موزوں بہ کشمیر ماند

(　　　　　　　　)

حسن کھویہامی نے کچھ اور باتوں کا اضافہ کیا ہے:۔

"کہتے ہیں کہ وہ گلعذار پرگنہ ڈنگو (یا بانپور) کے چندہار گاؤں کے ایک زمیندار کی لڑکی تھی۔ اسکی شادی ایک آوارہ مزاج اور قلاش آدمی سے ہوئی تھی۔ اپنے خاوند کی اس اوباشی کے باعث اسکی سسرال والوں سے بن نہ گئی اور بات میاں بیوی کی علیحدگی پر ختم ہو گئی۔ ایک دن راہ چلتے یوسف شاہ کی نظر اس پر پڑی جبکہ وہ مقام عراق پر کوئی کشمیری گیت گا رہی تھی۔ اسکے ہوش جاتے رہے۔ چنانچہ اُسنے دوسرے دن اسکے ماں باپ کو بے انتہا مہربانیوں سے سرفراز کرکے اس نازنین صورت کو اپنی ہم بستری کی عزت بخشی۔

(پیر غلام حسن کھویہامی۔ تاریخ حسن)

محمد دین فوقؔ نے حبہ خاتون کی حیات کے بارے میں تفصیل سے کام لیا ہے۔ انکے اپنے بیان کے مطابق انہیں یہ تفصیلات مرحوم غلام احمد مہجورؔ سے موصول ہوئی تھیں، لیکن مرحوم مہجورؔ کی رائے کا ماخذ بھی شاید عام روایت ہی ہے۔ فوقؔ کے بیان میں خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے حبہ خاتون کے سن ولادت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔

"۱۵۷۱ء کی بات ہے کہ حبہ خاتون کھیت میں گوڑی کرتے ہوئے مقام عراق پر کوئی کشمیری گیت گا رہی تھی کہ یوسف شاہ کا وہاں سے گذر ہوا۔ وہ اس پر فریفتہ ہوا اور اسے اسکے شوہر سے پانچ ہزار درہم کے عوض طلاق دلوا کر اپنی زوجیت میں لایا۔ اس وقت یوسف شاہ کی عمر اٹھائیس ۲۸ اور حبہ خاتون کی ۲۹ سال کے قریب تھی۔ اسکے بعد حبہ خاتون نے پچیس سال تک ملکہ کشمیر بن کر شاہانہ زندگی بسر کی۔"

فوقؔ کو شاید اپنی رائے میں موجود تضاد کا احساس نہ تھا۔ ۱۵۷۱ء میں یوسف شاہ چک کی حکومت نہ تھی بلکہ علی شاہ چک کشمیر کا بادشاہ تھا۔ یوسف شاہ چک کا عہد حکومت ۱۵۷۹ء سے لیکر ۱۵۸۵ء تک رہا ہے۔ اگر فوقؔ کی رائے کے مطابق ۱۵۷۱ء میں جب حبہ خاتون کشمیر کی ملکہ بنی اور اس وقت اس کی عمر ۲۹ سال تھی تو حبہ خاتون کا سن ولادت ۱۵۵۲-۵۳ء بنتا ہے۔ لیکن یہ بھول کر فوقؔ آگے لکھتے ہیں کہ حبہ خاتون ۱۵۴۱ء سے ۱۵۵۲ء تک کے عرصے میں پیدا ہوئی۔ اور یہ کہ حبہ خاتون قلیچ خان کے کشمیر میں داخل ہونے سے ایک سال پہلے انتقال کر گئی ہیں۔ اس اندازے کے مطابق حبہ خاتون نے تقریباً ۵۶ سے ۵۷ سال کی عمر پائی ہے۔

ان سب نظریوں کے برعکس پروفیسر محی الدین حاجنی اپنی کتاب "گلہ رس" میں بالکل ایک مختلف نظریہ پیش کرتے ہیں۔

"ہلہ ہوم گاؤں کے خواجہ حیا بند اور حبہ لالہ جن کے درمیان باپ بیٹے کا رشتہ تھا۔ تجارت کی غرض سے گریز جایا کرتے تھے۔ گریز میں ان دنوں ایک بوڑھا راجہ تھا جو خواجہ صاحب سے قرض لیتا تھا۔ قرض ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے بوڑھے راجہ نے اپنی اکلوتی لڑکی کو قرض کے عوض خواجہ حیا بند کے

حوالے کیا۔ خواجہ صاحب لڑکی کو ساتھ لیکر کشمیر آئے اور یہاں پر کچھ عرصے کے بعد اس نے بوڑا راجا کی لڑکی کو اپنے بیٹے کے ساتھ بیاہا۔ خاوند اور بیوی کا زیادہ دنوں تک نبھا نہ ہو سکا۔ ایک دن جب حبہ کپاس کی گڈائی میں مصروف کوئی گیت گنگنا رہی تھی، اسکی آواز یوسف شاہ چک کے کانوں سے جا ٹکرائی۔ سنتے ہی وہ دیوانہ ہو گیا۔ آخر کار حبہ لالہ نے حبہ خاتون کو طلاق دے دی اور ایک ہانجی کی وساطت سے وہ شاہی محل میں پہنچ گئی۔ اکبر کی فوج کے ہاتھوں جب چک فوج کو ہار کا سامنا کرنا پڑا، یوسف شاہ دہلی کی طرف روانہ ہوا اور حبہ خاتون محل سے نکل کر چندہار میں ایک کسان عبدی راتھر کے گھر میں پناہ گزین ہو گئی۔"

پروفیسر صاحب کے اس نظریہ کی بنیاد بھی ایک لوک کہاوت ہے کہ گریز میں داور جگہ کے نزدیک جہاں کشپت ندی کا سنگم کشن گنگا سے ہوتا ہے، ایک پہاڑی کو آج بھی "حبہ خاتون پہاڑی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

بہر حال ان تمام متضاد بیانات میں صرف اتنا کچھ مشترک ہے کہ حبہ خاتون ہماری ایک اچھی شاعرہ گذری ہے۔ جسنے اپنے حسن اور اوصاف حمیدہ کی بدولت کشمیر کی ملکہ کا مقام پایا اسمیں کوئی شک نہیں ہے کہ یوسف شاہ چک اسے بہت چاہتا تھا اور وہ دونوں اپنا بیشتر وقت کشمیر کی مختلف سیرگاہوں میں گذارتے تھے۔ اس بات کے ثبوت میں ہماری لوک کہانیوں اور لوک گیتوں میں کئی جگہ اشارے ہیں۔ پچھلے سال جدید محقق محمد یوسف ٹینگ نے ایک حیران کن بات کی نقاب کشائی کی جب انکی رہنمائی میں کشمیر کے قومی ہیرو یوسف شاہ چک کو خراج تحسین ادا کرنے کیلئے ایک ٹیم بسوک (بہار) گئی اور انکی قبر پر ایک تاریخی کتبہ نصب کیا گیا۔ ٹینگ صاحب کا خیال ہے کہ حبہ خاتون بسوک میں یوسف شاہ کے پہلو میں دفن ہے۔ اس سلسلے میں کلچرل اکادمی کے خبرنامہ 'اکادمی' میں یہ عبارت قابل غور ہے:۔

"تقریب کے دوران جناب محمد یوسف ٹینگ کو مزید تحقیقات و تجسس کا موقعہ ملا،

چنانچہ تحقیقات کے دوران کچھ حیرت انگیز واقعات سے پردے سرک گئے۔ مقامی روایات کے مطابق لسبوک اور اسکے نزدیک ترین گاؤں کشمیری چک میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، لیکن بہار کے فسادات میں کشمیری چک کا گاؤں بے چراغ ہوگیا اور لسبوک سے بھی اکثر مسلم گھرانے ہجرت کرگئے۔ جناب ٹیلنگ صاحب کو یہ بھی معلوم ہوا کہ یوسف شاہ چک کی اولاد ایک نزدیکی قصبہ اسلام پور میں آباد ہے۔ چنانچہ تقریب میں یہ لوگ بھی شریک تھے۔ ایک بوڑھے برہمن نے ایک اور حیرت انگیز انکشاف کیا۔ جب اس نے جناب ٹیلنگ صاحب سے کہا کہ یوسف شاہ کی قبر کے نزدیک والی چھوٹی سی قبر یوسف شاہ کی بیوی حبہ بی بی کی ہے۔ اس گاؤں میں مشہور ہے کہ یہ قبریں کشمیر کے دو بزرگوں پیر یوسف شاہ اور یعقوب شاہ کی ہیں۔ جناب ٹیلنگ صاحب نے مقامی روایات کی بنا پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ شاید یوسف شاہ کی التجا پر حبہ خاتون بھی بہار بھیجدی گئی تھی، کیونکہ یوسف شاہ کے خاندان کے باقی تمام افراد بہار ہی میں مقیم تھے۔ یاد رہے کہ یوسف شاہ حبہ خاتون کی معیت کیلئے بہت زیادہ بیتاب تھے، جس کا اندازہ انکے اس پُر گداز شعر سے ہوتا ہے۔

دلا کر زوے آں بت کشمیر نژادے
شُد تار سَرو مار سَراز گریہ دو چشم

اس حیرت انگیز تاریخی انکشاف سے حبہ خاتون کی حیات، موت اور آرامگاہ سے متعلق تمام تصورات تبدیل ہو گئے ہیں۔"

(اکادمی - جلد ۵ جنوری ۸۷ء شمارہ ۱)

اس طرح سے ایک اہم تاریخی معمہ ہمیشہ کیلئے سلجھ گیا ہے۔ اس فیصلے کو اس حقیقت سے بھی تقویت ملتی ہے کہ یوسف شاہ چک فنون لطیفہ کے بڑے قدر دان تھے۔ ظاہر ہے کہ اپنی فن شناسی اور حُسن نوازی کی وجہ سے وہ ضرور حبہ خاتون کی قدر کرتے ہونگے۔ یوسف شاہ چک کے ہم عصر

مورخ ملک حیدر چاڈورہ رقمطراز ہیں :-

"جب یوسف شاہ کو اکبر بادشاہ کے دربار میں پیش کیا گیا وہ موسیقی میں اپنے شوق کیلئے یوسف شاہ کو بہت چاہنے لگا۔ علم موسیقی پر یوسف شاہ کی اسقدر دسترس تھی کہ جب ایک دفعہ تان سین راگ کلونت گاتے ہوئے غلط سُر بجا رہا تھا، یوسف شاہ نے گوئیے کو فوراً غلطی کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ تان سین نے علم موسیقی میں یوسف شاہ کی برتر مہارت کو بغیر ہچکچاہٹ تسلیم کیا اور غلطی دور کی"۔

(رئیس الملک حیدر ملک چاڈورہ ۔ احوال ملک کشمیر ۱۶۱۹ء)

کشمیر کے ایک اور بلند مرتبہ عالم اور بزرگ بابا داؤد خاکیؒ (وفات ۱۵۸۶ء) نے بھی بہت خوبصورت لفظوں میں یوسف شاہ کی مدح سرائی کی ہے :-

نام این منظوم من غسلی یوسف شاہی است   چوں بفرخ دور یوسف شاہ آمد در خیال
نامور شاہے کہ بارِ دیگر از لطفِ حقش   گشتہ حاصل تخت و تاج و باج و ملک و مال
دوستدار مصطفیٰؐ و اہل بیتؓ و صحبؓ اوست   مذہب مقبول دارد ایں شہِ نیکو مآل
زانکہ باخلاص گفتنا مسلمان و مومنیم   نیز بیزارم بدل از بدعت و کفر و ضلال
طالب علم و شریعت ہست خوانائے کتب   از مسائل عالمانرا مے کند اکثر سوال
بشنود از عالمان معنیِ تفسیر و حدیث   فکر و دخلے ے تواند کردن اندر مایقال
در جماعت خانہ وقتے خود امامت می کند   سورہ خواند گہ قصار و گہ اوساط و طوال
بہرۂ دارد زِ علم اصطلاح صرفیان   ے شناسد وزن و صرفِ افتعال و انفعال
ہم زِ عرفِ نحویان نوعے خبر میدارد او   میتواند فہم کردن حدِ استثنا و حال
تیز فہمی و سوادے دارد اندر نظم و شعر   حل معمّا داند استخراج اعمال و مثال
خواہش علم تصوف نیز در دل دارد او   فہمد از قولِ بخاری رمزہائے اہل حال
بیر نعمت ہا واقفست در ہنرہا ذو فنون   حسنِ خطے نیز دارد این شہِ فرخندہ فال

اہل حرفست و سخن دان باشناسائی شعر طبعِ موزون نیز دارد این شہ نیکو خصال
ورزش نیکو بداز پد گفتنِ موزوں نمود بازبانِ ہند میگوید ثنائے ذوالجلال
علم موسیقی رسانید بحدِ انتہا ہر مقامے نیک داند چوں حُسینیؑ وغزال
ہست شاہے نرم خوش شیریں زبان و بُردبار باز در فہم و فطانت بے نظیر ولا مثال
بر دُعا کُن اکتفائے دل چو اندر مدحِ شاہ ہست در نظمِ قصیدہ نطق را طبق محال
یارب این شہ راز فضلِ خویشتن انعام کُن صحت و ایمان و تن توفیق عدل اصلاحِ حال

(حضرت بابا داؤد خاکیؒ ۔ "قصیدۂ غسلیہ یوسف شاہی")

محکمہ ریسرچ سرینگر

یہ قصیدہ یوسف شاہ چک کے ایک ہمعصر شاعر اور بزرگ کے قلم سے نکلا ہے اور اس سے بڑھ کر اور کوئی بیان معتبر نہیں ہو سکتا اور اسکی روشنی میں یوسف شاہ چک کے بارے میں تمام متعصب مورخین کی بہتان تراشی رد ہوتی ہے۔

میری مراد یہ نہیں ہے کہ میں یوسف شاہ چک کی عظمت بیان کروں بلکہ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ حبہ خاتون کو یوسف شاہ کی زوجیت میں زبردست عزت اور احترام حاصل رہا ہو گا۔ اور یہ کہ اس قسم کے فن کار اور فن شناس بادشاہ کے پہلو میں رہ کر حبہ خاتون کا فن اور زیادہ نکھرا ہو گا کہا جاتا ہے کہ حبہ خاتون کو بھی اپنے سرتاج کی طرح فن موسیقی میں خصوصاً مقام عراق میں کمال حاصل تھا اس نے موسیقی پر اپنی دسترس کو بروئے کار لا کر کشمیری شاعری کی عروضی بنیادوں کو بھی از سرِ نو تشکیل دیا۔ اس کی اپنی شاعری قدیم کشمیری شاعری کے عروض اور ایرانی عروض کا ایک حسین امتزاج پیش کرتی ہے جسکی بدولت کشمیری شاعری کو رنگا رنگ جذبات اور احساسات کے اظہار کیلئے ایک کامیاب آہنگ مل گیا جو آجتک ہماری شاعری میں موجود ہے۔ ان نئے آہنگ میں ایرانی شاعری میں سخت گیری ہے اور نہ اسمیں ایرانی کشمیری شاعری کی غیر مستقلیت۔

جب ہم حبہ خاتون کی شاعری اور اس سے پہلے کی شاعری کا بغور تقابلی جائزہ لیں تو یہ

بات عیاں ہوگی کہ حبہ خاتون کی شاعری مکمل طور پر مختلف ہے۔ یہ تبدیلی انتہائی اہم اور دور رس نتائج کی تبدیلی ہے۔ میری رائے میں یہ موضوع کی تبدیلی کی نسبت زبان کیساتھ شاعر کے رویّے کی تبدیلی ہے۔ آج ہماری اس نئی تبدیلی کی ندرت کو سمجھنا کچھ مشکل ہے کیونکہ حبہ خاتون کے بعد یہ روایت بن گئی اور اس روایت کا اسقدر استعمال ہوا کہ بعد میں انیسویں صدی کے کئی "وژن" نگاروں کے ہاتھوں زبان کی قوت ترسیل ہی مخدوش ہوگئی۔ اور زبان میں نئی تبدیلی کی ضرورت شدت اختیار کر گئی۔ درحقیقت شاعری میں کوئی تبدیلی بنیادی طور پر زبان کے ساتھ شاعر کے رویّے ہی کی تبدیلی ہوتی ہے۔ حبہ خاتون سے پہلے کشمیری زبان ہمارے صوفی شاعروں مثلاً لل دید اور کہیں کہیں شیخ العالمؒ کے ہاتھوں کی زبردست گرفت میں تھی۔ وہ الفاظ کے لغوی اور رائج معنوں کی پرواہ نہ کرکے الفاظ کو جسطرح چاہتے استعمال کرتے۔ ان کا تعلق دنیا میں انسان کی معمولی کی زندگی سے نہ تھا اسلئے وہ زبان میں لوگوں کے تسلیم شدہ قواعد اور ضابطوں سے ہٹ کر زبان کو اپنی تخلیقی ضرورت کیمطابق انفرادی سطح پر ہی استعمال کر سکتے تھے۔ وہ زندگی۔ ناؤ، دنیا، سمندر، عمل، دھاگہ، خدا، گھر جیسے انفرادی تاویلیں قائم کرنے میں خود مختار تھے۔ موجودہ جمالیاتی معیار پر اس قسم کی تاویلیں کرنے میں شاعر کی مہارت اور تخیلی قوت کو ہی ہم تخلیقی معراج کہہ سکتے ہیں مگر جب الفاظ کے جذباتی رشتوں کی بشری زندگی کی حقیقتوں سے لاتعلقی انتہا کو پہنچتی ہے تو شاعری اپنا اثر کھو بیٹھتی ہے اور شاعری محض چیستان بنکر رہ جاتی ہے۔ گو کہ کشمیری شاعری میں وہ منزل سولہویں صدی میں نہ آئی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شیخ العالم سے حبہ خاتون تک کشمیری شاعری کی تاریخ میں خلا ایک بڑا ثبوت ہے کہ کشمیری شاعری ایک بہت ہی تنگ دائرے میں محدود ہو چکی تھی اور یہ ابتذال ایک بنیادی تبدیلی کا پیش خیمہ تھا۔ اس لحاظ سے حبہ خاتون نے کشمیری شاعری میں اپنے رومان پرور گیت لکھ کر ایک انقلاب بپا کیا۔ شاعرانہ مزاج میں یہ تبدیلی انیسویں صدی میں انگریزی شاعری میں انقلاب کی یاد دلاتی ہے۔ گو کہ حبہ خاتون نے شاعری کا کوئی مینیفسٹو پیش نہ کیا لیکن اس نے اپنی شاعری کے ذریعے عام بول چال کی زبان کے تخلیقی سرچشموں

کو بروئے کار لا کر عام بول چال کی زبان کے فطری حسن کو نمایاں ضرور کیا۔ شاعری میں ہر کوئی بنیادی تبدیلی عام بول چال کی زبان کی طرف شاعر کی واپسی کا نام ہے۔ حبہ خاتون نے عام بول چال کی زبان کے ہی استعاراتی امکانات کو روشن کیا کیونکہ شاید وہ ضرور یہ احساس رکھتی تھی کہ عام بول چال کی زبان کا بیشتر حصہ استعاروں پر ہی مشتمل ہے لیکن کثرت استعمال سے ہم اسکی استعاراتی جدّت کو محسوس نہیں کرتے۔

دِل نِتھ رُٹی تھم گو شے   وہ لا مشیانہٕ پوشے مدنو
وہ لہٕ ولیسی گژھوَے ہیٚئے   لیُس مَرِ سہ کَتہِ ییٚیے
ژاران چھُس چانہٕ زِییے   وہ لا مشیانہٕ پوشے مدنو
وہ لہٕ ولیسی گژھوَے ہَندے   لا نِنہٕ نشیاے کَرٕ اَنٛدے
ٹُکہ ٹُتی کُدٕ ٹُس رَنٛدے   وہ لا میشیانہٕ پوشے مدنو
وہ لہٕ ولیسی گژھوَے ببرے   چھیچھ کھسے لوٕئے ٹُکم تَرے
کاژھاہ سوٗزُنَم نہٕ خبرے   وہ لا میانہٕ پوشے مدنو

ترجمہ:۔

”میرا من چرا کے مجھے چھوڑ کر کیوں چلے   آ میرے پھولوں کے متوالے! آ
آ سہیلی جوہی کے پھول لانے جائیں   مر کر کون واپس آجاتا ہے
میں تمہاری کمائی کی منتظر ہوں   آ میرے پھولوں کے متوالے آ
آ سہیلی 'سلاد' لانے جائیں   تقدیر کی الجھن کب سلجھتی ہے
لوگوں نے مجھ پر ہنس ہنس کے مجھے رسوا کیا   آ میرے پھولوں کے متوالے آ
آ سہیلی ریحان کے گچھے لانے جائیں   اس نے تو مجھے بسمل کیا ہے
اور پھر میری خبر نہ لی   آ میرے پھولوں کے متوالے آ،،

اس نوعیت کی غمناک انبساطی کیفیت لوک گیتوں کی بنیادی خاصیتوں میں سے

ایک ہے۔ یہ شاعری کسی فکری گہرائی یا کسی بڑی حقیقت کی تہہ کو نہیں چھوتی بلکہ اسکی ساری اپیل اسکی سطحیت میں ہی پوشیدہ ہے۔ لیکن پھر بھی زندگی کی density & Exuberancy اور SPOUTANOIR کا جو احساس اس نظم سے ابھرتا ہے وہ اسے شاعرِ عظیم بنانے کیلئے کافی ہے حبہ خاتون کی شاعری ”خالص شاعری“ کی ایک آمدہ مثال ہے، جس میں شعر کی تخلیق ہی شعر کا مقصد ہے۔ حبہ خاتون کی شاعری میں کہیں بھی کسی اخلاقی، روحانی یا دیگر قسم کے فکری دکھاوے کی مثال موجود نہیں۔ وہ اسلئے لکھتی ہیں کہ اسکے اندر کا شاعر اُسے لکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسکی شاعری میں کسی بھی جگہ صفائی کا احساس نہیں ہوتا۔ اکثر ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اسکی شاعری اپنے آپ ہی تخلیق ہوتی ہے۔ اس نے کسی بھی جگہ شاعری کو کسی مقصد کے حصول کیلئے نہیں لکھا اسکے لئے شاعری میں حُسن ہی واحد حقیقت ہے ـــــ دائمی اور آفاقی حقیقت کہیں کہیں نسوانی حسن کی تعریف پورنو گرافی کے حدوں کو بھی چھو لیتی ہے۔ مثال کے طور یہ اشعار انتہائی جوش آفرین ہیں:۔

زہ لہٕ چھَم خوابوان سولہٕ چھُکھ والان   غم چھُم وانجِہ سئے
نہٕ چھُکھ ہٕ زوٚد مٕت سینہ شیہلاوان   ژ تتے کھوزِ گیٔ مشآنی دے

”میں پل بھر نہیں سو سکتی اور تم میری قیمت نہیں جانتے۔ یہی غم میرے دل میں ہے
کبھی تم میری جلتی ہوئی چھاتی کو ٹھنڈک نہیں پہنچاتے۔ مجھ سے یہ نفرت کیوں۔“

بہٕ چھَس زُمین، ژٕ چھُکھ آسمانے   سپرس ژٕ چھُکھ سَرپوشِ
بہٕ چھَس نعمت ژٕ چھُکھ مہمانے   چھاوِ مےٚ آنٕز دانے پوشِ

”میں دھرتی ہوں اور تم آکاش   تم میرے بھیدوں پر پردہ ہو
میں نعمت ہوں اور تو میرا مہمان   میری انار کی کلیوں سے جی بھر کے لابھ اُٹھا“

ایسی بات نہیں ہے کہ حبہ خاتون زندگی سے فرار اختیار کرتی ہے۔ وہ زندگی سے اسکے تمام رنگوں، رعنائیوں اور لذتوں کے ساتھ بے پناہ پیار کرتی ہے۔ وہ زندگی سے جدائی کے خیال سے ہی کانپ

اُٹھتی ہے۔

رہ بخشتم ساری پروردِگارو   ژیتھ کہو واتہ لومیانہ مرنے
ہلینہ بو آیس دہن رکھو برِلیو   دہنہ کے رنگ گوم خاصہ ببرے
لولہ سئے تھوو نم للہ وُن نارو   ژیتے کہو واتہ لومیانہ مرنے
لُدِ لُدی دزاہمو مال کھچالو   ژھرِ اکھہ ساہنے لرِ قبرے
اڈکو ہنہ مدرِد وتھہمو لو کھچارو   ژیتے کہو واتہ لومیانہ مرنے

ترجمہ
"میرے تمام گناہ معاف کر، میرے خدا   میرے خدا میری موت سے تجھے کیا حاصل ہوگا؟
میں گرفتار ہوئی اور یہ دن کیسے بیتیں   میرا ریحان جیسا رنگ پھیکا پڑ گیا
یہ کیسی آگ میرے سینے میں بھر دی   میرے خدا میری موت سے تجھے کیا حاصل ہوگا؟
میری جوانی! تو تمام دولتوں سے مالا مال ہے   لیکن ایکدن خالی ہاتھ قبر میں سُلا دیا جائیگا
میری جوانی! پھر کیوں ہوش میں نہیں آتی   میرے خدا تجھے میری موت سے کیا ملیگا؟"

زندگی کی لذتوں سے یہی والہانہ عشق بار بار حبہ خاتون کی شاعری میں کسی نہ کسی صورت میں اظہار پاتا ہے۔ کہیں محبوب کے ساتھ وصل کی تڑپ کی صورت میں اور کہیں کھوئے ہوئے بچپن کی طرف لوٹ جانے کے جذبے کی صورت میں۔ یہی وہ درپردہ حقیقت ہے جو حبہ خاتون کی شاعری کو تمام اقدار کے مسمار کرنے کے باوجود دائمی اپیل بخشتی ہے۔

زندگی کی معروضیت کے ساتھ حبہ خاتون کے جوش آفرین عشق کی وجہ سے اسکی شاعری میں حواسیت SENSUOSNESS کا عنصر بہت غالب ہے۔ وہ قدرت کی متعدد چیزوں، آوازوں اور رنگوں کے ساتھ جازیدا اور پرجوش محبت رکھتی ہے۔ قدرت کے حسن کو الفاظ کا روپ دینے کیلئے اس کے تمام حواس ہوشیار ہیں۔ حسی تجربات کی بہتات حبہ خاتون کی شاعری میں فطرت کے مجرد چیزوں جیسی کشش پیدا کرتے ہیں۔

رُژہ رُژھ ریتہ کول چھُم سوراَنے
برِما گژھن اَچھہ پوشش

کُنہ ہیتہ بُلبُلہ بیتہ اکہ آسنے   چھاو میانی دانے پوشس

"میری (جوانی کی) بہار بیت رہی ہے   تیرے آنے سے پہلے کہیں چمپلکے پھول مُرجھا نہ جائیں!

(کسی بہانے گھڑی بھر کیلئے) آ میری بُلبل!   میری جوانی کے (انار) کلیوں سے لہلہا اٹھا"

حبہ خاتون کے اکثر استعارے ایسے واضح لفظی پیکروں سے ابھارے گئے ہیں جو بیک وقت مانوس بھی ہیں اور حیران کن بھی ان میں حیرانی کا عنصر مشابہت کی ندرت سے پیدا ہوتا ہے۔ حبہ خاتون کے بعد تمام شاعروں نے حبہ خاتون کے اختراع کئے ہوئے استعارے کثرت سے اپنی شاعری میں استعمال کئے ہیں، جسکی وجہ سے انکی ندرت محسوس کرنا ذرا مشکل ہوگیا ہے۔

بالن زونِ لجُس ژھلہ   ژٕ بے کتہ زوہ لہ گمژ چھے

برو نزاہ چھکس تہ پتو ڈلہ   لالو کلہ آلہ وَے

"میں پہاڑ کے پیچھے غروب ہونیوالا چاند ہوں۔ اور نہ جانے تم کہاں محو خواب ہو!۔ میں چند لمحوں کی مہمان ہوں اور پھر ہمیشہ کیلئے اوجھل ہو جاؤنگا۔ میرے محبوب آ میں اپنا سر تجھ پر قربان کروں۔"

حُسن کی ناپائیداری کا اس سے بہتر استعارہ ہو ہی نہیں سکتا۔ حبہ خاتون کی تمام شاعری میں حُسن کی عظمت کے ساتھ ساتھ حُسن کی ناپائیداری کا تلخ احساس ہوتا ہے۔ فطرت کے دائمی حُسن اور انسانی زندگی کی تلخ حقیقتوں کے درمیان مقابلے نے حبہ خاتون کی شاعری میں درجہ بدرجہ گہرائی پاتی ہوئی یاسیت اور وحشت ناکی پیدا کی ہے۔ یہ استعارے کہیں انتہائی گھمبیر ہیں اور کہیں نیم حزنیہ۔ جوانی کو ڈھلتے چاند کے ساتھ مشابہت اگر ہولناک ہے تو جوانی اور مال و متاع سے بھری دکان کے درمیان تشابہت بہت حد تک حزنیہ ہیں۔ متاع نہ رہی تو کوئی گاہک دوکان کیطرف نہیں آتا

حبہ خاتون کی شاعری موسیقی کے ساتھ قریبی رشتہ رکھتے ہوئے بھی موسیقی کے ماتحت نہیں ہے۔ یہ کتاب میں پڑھنے کی چیز بھی ہے۔ البتہ اپنے اسلوب، روانی اور اوزان میں اسنے موسیقی کی خصوصیات پیدا کرلی ہیں۔ اسکی صوتی فضا غنائیت سے بھرپور ہے اور ہر ایک گیت ایک دلکش راگ، ایک حسین SYMPHONY معلوم ہوتا ہے لیکن محض مترنم الفاظ اور

اوران ان گیتوں کو شاعری کا درجہ نہیں بخشتے بلکہ یہ ان گیتوں میں موجود زندگی کی حقیقتیں غنائیت کے ساتھ ساتھ ہیں جو انہیں محض سماعت نواز نغموں سے بلند کر کے شاعروں کا رُتبہ بخشتی ہیں۔ حبہ خاتون کے گیتوں میں موجود ذاتی اور شخصی جذبات اور بالکل انفرادی احساسات انہیں لوک گیتوں سے بھی ممیز کرتے ہیں۔ لوک گیتوں میں عموماً شاعری سے شاعر کی شخصیت بالکل غائب رہتی ہے۔

حبہ خاتون کی شاعری کشمیری شاعری کے ارتقاء میں ایک اہم منزل کی حیثیت رکھتی ہے یہ جاگیردارانہ سماج کی جبرّیہ بندشوں میں ایک دھڑکتی جوانی کی چیخ ہے۔ محبوب کی سنگدلی اور بے وفائی، سسرال کے ظلم، سوکن کی رقابت، تقدیر کے سامنے لاچاری، اور اس قسم کے دیگر امتزاجی جذبات کا اظہار درحقیقت سماج کی جبرّیہ زنجیروں کو توڑنے کی ایک تمنّا ہے۔ جسکی وجہ سے حبہ خاتون کی شاعری میں Nostalgia کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ حبہ خاتون مستقبل کی ایک اکیلی روشن مشعل تھی جو ماضی کے خوفناک اندھیرے میں غائب ہوئی۔ اسی شاعری کیلئے کشمیری شاعری کی قدیم صنف ”واکھ“ مناسب نہیں تھی۔ حبہ خاتون نے اس سے قدرے وسیع اور لچکدار صنف ’وژُن‘ کو اپنایا جسکی ابتدائی صورت پہلے ہی شیخ العالمؒ کے کلام میں ملتی ہے ——— حبہ خاتون نئی شاعری کا آغاز کرتی ہیں۔

ناجی منور

محمود گامی

محمود گامی کشمیری زبان کے سب سے پہلے زبان ساز شاعر گذرے ہیں ان سے پہلے للہ عارفہ، نندہ ریشی اور حبہ خاتون جیسے بلند مرتبت شاعروں نے ہماری زبان کی بنیادیں کو مستحکم کیا تھا۔ محمود کے سامنے ان ہی تین شاعروں کی روایات موجود تھیں للہ عارفہ اور نندہ ریشی کا عارفانہ کلام تو کشمیر کے طول و عرض میں گونج رہا تھا۔ ساتھ ہی حبہ خاتون کی رومان پرور شاعری بھی مقبول ہو چکی تھی لیکن ان سبھی شاعروں کی کاوشیں انکی غیر شعوری کوششیں تھیں۔ محمودؔ نے پہلی دفعہ شعوری طور پر کشمیری زبان کے دامن کو وسعت دینا چاہی اسطرح اس نے اپنی زبان کو مثنوی، غزل، نظم اور قطعات جیسی اضاف سے متعارف کرایا اور ان کو بام عروج پر بھی پہنچایا۔ اس لئے یہ بات قدرتی تھی کہ بعد کے آنیوالے سبھی شاعروں پر محمودؔ کے کافی اثرات پڑیں۔ اور انکے احسانات سے کوئی بے بہرہ نہ رہ سکے رسولؔ میر نے انکی غزل اور گیتوں کی روایت کو آگے بڑھایا اور اس میں نئی زندگی بھر دی۔ مقبولؔ نے مثنوی گلریز لکھ کر محمودؔ کے جلائے ہوئے چراغ کو روشن رکھا۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ محمودؔ ۱۷۶۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر میں افغان حکومت قائم ہو چکی تھی ادھر ساری ریاست میں فارسی زبان کا بول بالا عام ہو چکا تھا۔ اور اس زبان نے یہاں کی تہذیبی زندگی میں اپنی جڑیں مضبوط کی تھیں۔ غنی کشمیری اور صرفیؔ جیسے بڑے فارسی شعرا نے ایران سے خراج تحسین حاصل کیا تھا اور کشمیر کے فارسی داں اصحاب بھی مقامی اقتدار سے داد تحسین حاصل کر رہے تھے۔ اسی ماحول میں محمودؔ ایک

پُرفضا گاؤں آرہ واری (محمود آباد) میں ایک پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے ہی گھر میں مروّجہ فارسی اور عربی کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے۔ انکے کلام سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ انہوں نے فارسی کے مستند اساتذہ جیسے سعدیؔ، فردوسیؔ، حافظؔ، رومیؔ، عطارؔ اور جامیؔ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔

محمودؔ گامی نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا فارسی سے ہی کی۔ انکی نعتوں کا ایک گلدستہ جو حال ہی میں دریافت ہوا ہے اس بات کا غمّاز ہے کہ محمودؔ نے بارہ تیرہ سال کی عمر ہی میں فارسی زبان میں نعت گوئی شروع کی۔ ابتدا میں وہ مولانا جامیؒ اور نظامیؔ کی نعتوں کا تتبع کرتے تھے اور انکا ہم پلہ بننے کی کوشش کرتے تھے۔ انکی چھوٹی عمر میں لکھی ہوئی نعتیں پڑھکر اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں فارسی زبان پر بڑی قدرت حاصل رہی ہے مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

یا الٰہی بتولائے رسول عربیؐ   عاشقم کن بہ منقبتہائے رسول عربیؐ
راحت روح روانم اے صبا زود بیار   بوئے گیسوئے سمن سائے رسول عربیؐ
مخزن جود و سخا و مظہر اسرار حق   مطلع انوار سبحانی گریبان رسول عربیؐ

فارسی زبان پر محمودؔ کی یہی قدرت تھی کہ بعد میں کبھی کبھی وہ فارسی غزل لکھ کر ہمیں محظوظ کرتے ہیں اور ایسے اشعار لکھتے ہیں:-

آمد بہ چمن گل بدنے موئے میانے   آزاد وشے بادہ کشے مست جوانے
سرتاج شہاں خسرو خوبان جہاں است   شیریں دہنے لب شکرے سحر بیانے

فارسی زبان میں محمودؔ نعت لکھتے لکھتے غیر ارادی طور پر کچھ کشمیری اشعار کہہ گئے ہیں۔ اور انہیں مقبول ہوتے دیکھکر وہ کشمیری زبان کی طرف مائل ہوتے نظر آتے ہیں۔ انکی اسی ابتدائی شاعری میں ہمیں انکی دو مقبول نعتیں بھی ملتی ہیں جو آج بھی گھر گھر میں گائی جاتی ہیں۔

مہربان باشس برس یا محمدؐ   پہ وندے سر قدس یا محمدؐ
ذکر غم دفایا حسیات النبیؐ   متے کر تم شفایا حسیات النبیؐ

محمودؔ نے اپنا مشہور [illegible] ۱۱۹۶ھ میں لکھی ہے جیسا کہ اس مثنوی کے آخر میں

درج ہے۔ محمود کی عمر اسوقت ۲۵ رسال سے زیادہ نہ تھی۔ اسطرح سے انکی یہ مثنوی کشمیری زبان کی پہلی مثنوی گنی جاتی ہے۔ اسے پڑھ کر یہ بات صاف عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ انکی ابتدائی کوشش تھی شاعر اس مثنوی میں وہ تسلسل قائم نہیں رکھ سکا ہے جو اصل فارسی کتاب میں موجود ہے لیکن محمود کی شاعرانہ اُپج کا پتہ اس مثنوی کو پڑھ کر ضرور لگتا ہے۔ کہیں کہیں اس مثنوی میں ایسی نادر تشبیہات ملتی ہیں کہ انسان عش عش کر اٹھتا ہے۔ مثلاً

دزان زن مرژ پھول منز باگ نارس　　شباں کیاہ خال تتہ برگِ انارس

ترجمہ "محبوب کے گال برگِ انار ہیں اور اُس پر تل ایسا زیب دیتا ہے۔ جیسے آگ میں کالی مرچ کا دانہ جل رہا ہو" یا

شمع زن منزِ نین شرمندِ کرتھس　　یہ شکر خندہ شاہا نیند کرتھس

ترجمہ "اے بادشاہ اپنی مسکان سے تو نے مجھے قید کر ڈالا جیسے تو نے مجھے دن میں جلتے ہوئے چراغ کو شرمندہ کیا"

اس مثنوی میں ایک نو دریافت مرثیہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محمود کی شاعرانہ صلاحیتیں بے پناہ وسعت رکھتی تھیں۔

محمود گامی کی اس پہلی مثنوی کے فوراً بعد انکی دوسری شاندار مثنوی وجود میں آجاتی ہے اور وہ ہے قصۂ شیخ صنعان۔ یہ مثنوی انہوں نے مولانا عطار کی مثنوی منطق الطیر کی ایک حکایت سے ترجمہ کی ہے۔ لیکن انکا ترجمہ اتنا آزاد ہے کہ کہیں پر یہ گمان بھی نہیں گذرتا ہے کہ شاعر نے یہ حکایت ترجمہ کی ہے۔ قصۂ شیخ صنعان میں اگرچہ مثنوی کی خوبیاں نہیں ہیں۔ لیکن اگر اسے ایک مثنوی نما نظم کی صورت میں پڑھکر پرکھا جائے تو یہ ایک لازوال نظم ثابت ہو جاتی ہے۔ یہ اس نظم کی خوبیوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج بھی یہ نظم ہماری دیہاتی عورتوں کو ازبر یاد ہے اور اسے رؤف۔ گیتوں میں گاتی ہیں۔

یوسف زلیخا محمود کی تیسری مثنوی ہے۔ مقبولیت کے لحاظ سے پہلی مثنوی ہے۔ یہی وہ

مثنوی ہے جو مقبولیت کے لحاظ سے گلریز کی طرح کشمیر کے ہر گھر میں پڑھی جاتی ہے۔ اسی مثنوی کو یہ رتبہ بھی ملا ہے اسے مشہور جرمن مستشرق برکھارڈ نے ۱۸۸۴ء میں جرمن زبان میں ترجمہ کر کے اصل متن کے ساتھ شایع بھی کیا ہے۔ محمود گامی نے یہ مثنوی بھی فارسی زبان کے مشہور شاعر مولانا جامیؔ کی کتاب سے ترجمہ کی ہے لیکن محمودؔ کی یہ خوبی انکی مثنوی میں جلوہ گر ہے کہ وہ اصل مصنّف کا کہیں بھی تابع نہیں رہا ہے۔ یوسف زلیخا میں بھی محمودؔ نے شاعری کے مختلف تجربے کئے ہیں۔ مثنوی کی ابتدا ایک طویل بحر سے ہو جاتی ہے۔ جسمیں زلیخا کے حُسن کا بیان ہے اور اس بحر کو اپنی مثنوی کیلئے مناسب نہ سمجھ کر محمودؔ ایک ایک ہلکی پھلکی بحر کا استعمال کرتا ہے جہاں سے یوسفؑ کے احوال کا بیان ہو جاتا ہے۔ اصل میں یہیں سے وہ قصّہ شروع ہو جاتا ہے جیسے کلام اللہ میں احسن القصص کہا گیا ہے۔ کشمیری دیہات میں آج بھی ہزاروں افراد موجود ہیں جنہیں قصّہ شیخ صنعان کی طرح حضرت یوسفؑ کا قصّہ بھی محمودؔ کے اشعار میں از بریاد ہے۔ ہمارے ناقدوں کو کشمیری مثنویوں سے اکثر یہ شکایت رہی ہے کہ زبان ضرورت سے زیادہ فارسی آمیز رہی ہے لیکن محمودؔ گامی کی یوسفؑ زلیخا کھُلا ثبوت ہے کہ صاف اور شستہ کشمیری زبان میں بھی دلفریب مثنوی لکھی جا سکتی ہے۔

پھیرِ کھوٗہس یہِ اَنٛدی اَنٛدی   نیرِ پوشن گُرٕس گوٗندی
گبہِ کہوس دِہ دِس تہٕ نہُس   لوٗزٕ کران سہ روزِ دُدٕ ہمَس

یا یہ اشعار

تیوت لوسٕ نَس نیلٕ یَس تن   ہمپوشس گوٗزنگ سوسن
زارٕ دنان اوسُس وزٕ بایِن   کیتھٕ منو ہمسن چھوِدم لاین
متہٕ کرٕ مرتوم چھُس ناچلے   یکہٕ ناآدی توم تہُ وارٕ وارے
اوس رِوان رٕوان نائے   ہر تہٕ زن رامہٕ ہونٕ ین حوائے
دوٗرٕ بالٕ یٕ نتھٕ لوسے پھِہس   آو جبرِ ییل تس بادشاہس

اس مثنوی کے اکثر و بیشتر اشعار کشمیری زبان میں ضرب المثل کا درجہ اختیار کر گئے ہیں مثلاً

؎ شاہ یوسفؑ سوداگارن   مُلی ہیوٗ تُن کھہ ٹین ڈیارِن
صعون کنِتھ سوٗتلی ہیوٗ تکھ   لا داوا لیکھِت دِتُکھ

جان وَندے جِگرِ یتھم   ژھعو نجبہ اکے درشُن دِتم
کوچھِ بہتھ زِچھت ٹنوٗ لہم   مارِ سیاہ پچھُت ژوٗ لہم
زالٰی وانکن قُبلہ متھے   ما آلِ پچھر کرو کتھے

یوسفؑ زلیخا کی انہی بے پناہ شاعرانہ خوبیوں کی وجہ سے کشمیری زبان کے قدآور شعراء نے محمودؔ کو عقیدت کا خراج ادا کیا ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ بعد کے مثنوی نگار شعراء حضرات نے محمودؔ کی اس شستہ زبان کی روایت کو قایم نہیں رکھا بلکہ اپنی مثنویوں میں فارسیت کی وہ برمار کر دی کہ بیشتر مثنویاں پڑھکر انہیں کشمیری لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

محمودؔ کی ایک اور مثنوی "لیلیٰ مجنون" بھی انکی سبھی مثنویوں کی طرح فارسی ہی سے ترجمہ ہوئی ہے۔ اس مثنوی میں محمودؔ نے ایک انوکھا تجربہ یہ کیا ہے کہ اسمیں جا بجا کشمیری گیت بھر دئے ہیں۔ قصہ کو آگے لیجانے کیلئے اشعار لکھے ہیں لیکن اسکی اصل خوبی وہ گیت ہیں جو محمودؔ نے کشمیر کے لوگ گیتوں ونہٕ وُن اور روٗف کے طرز پر لکھے ہیں۔ نئی ترتیب شدہ کلیات محمودؔ گامی میں جو ترتیب لیلیٰ و مجنون مثنوی کو ملی ہے۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ محمودؔ نے اپنے گیتوں کو مناسب جگہ دینے کیلئے ہی یہ مثنوی لکھی ہے۔ مثنوی کو پڑھتے ہوئے ہم یہ بھی محسوس بھی نہیں کرتے ہیں کہ ہم عرب کا کوئی قصہ پڑھ رہے ہیں بلکہ جیسے اپنے ہی کشمیر کی کوئی داستان ہماری آنکھوں کے سامنے گذر رہی ہو۔ کشمیری ونہٕ وُن اور روٗف شادی بیاہ کے کشمیری طریقے، کشمیر کے پھول اور زیورات کا ذکر سن کر ہم اس مثنوی کو ایک ترجمہ شدہ داستان نہیں کہہ سکتے ہیں۔

محمودؔ گامی کی ایک اور مثنوی قصہ ہارون رشید ہے۔ اس مثنوی کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہوئی ہے کہ اسکا شائع شدہ نسخہ باقی تمام قلمی نسخوں سے مختلف ہے۔ قلمی مسودوں کی صورت میں جو مثنوی ہمارے سامنے موجود ہے۔ وہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اسمیں شائع شدہ نسخہ کی بہ نسبت اعلیٰ پایہ کی شاعری ملتی ہے۔ اور اس کی زبان زیادہ رسیلی اور منجھی ہوئی ہے۔ اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ جس طرح محمود کی لکھی ہوئی مثنویاں دیگر شاعروں کیلئے بھی طبع آزمائی کا موجب بنی ہیں قصہ ہارون رشید کا شائع شدہ نسخہ بھی ایسے ہی کسی شاعر کی تخلیق ہو اور محمودؔ کے نام پر چھپتا آیا ہو۔ بہرحال ہم نے مثنوی کی دونوں صورتوں کو کلیات محمودؔ میں یکجا کر دیا ہے۔ مثنوی کے دونوں نسخوں سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

طبع شدہ	قلمی
تادِ کِلدو دردمند د رُوزی تو	داد کِ لدو ہیُہ تہ ساتھا روزی تو
تازٕ تازے عشقہ کتھاہ بوزی تو	قصہ ئے فرزند ہورُون بوزی تو
در مصر اوس بادشاہا نامدار	بادشاہ ہورُون رشید اوس نامدر
ناو تس ہورون رشید بُر کامگار	دون اُچھن تس گاش اوسے اکھ

ان مثنویوں کے علاوہ محمودؔ گامی نے حکایت، بہلی نامہ، قصہ منصور وغیرہ چند اور مختصر مثنویاں تخلیق کی ہیں۔ مثنویوں کیلئے محمودؔ نے فارسی حکایات کا جو انتخاب کیا ہے اسکے اس امر کی، داد دینی چاہئے کہ بعد کے مثنوی گو شعراء نے بھی بار بار ان حکایات کو اپنی طبع آزمائی کا موضوع بنایا ہے۔ لیکن جو شہرت اور مقبولیت محمودؔ کی مثنویوں کو کشمیر میں ملی ہے کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ یوسف زلیخا، لیلےٰ مجنون، منصور نامہ، بہلی نامہ، کتنے ہی شعراء نے ان قصوں کو مثنویوں کا جامہ پہنایا ہے لیکن محمودؔ سے آگے کوئی جا نہ سکا۔

مثنویوں کے علاوہ محمودؔ گامی گیتوں اور غزلوں کے بھی پہلے رنایت ساز شاعر گذرے ہیں۔ وہ کشمیری زبان کے پہلے گو شاعر گذرے ہیں اسکے کئی گیتوں کو تو اب ابدیت کا درجہ بھی

ملا ہے۔ انکے گیت کشمیری زبان کی قدیم صنف 'وژن' کے فارم میں لکھے گئے ہیں۔ اگرچہ للہ عارفہ کے زمانے سے محمودؔ تک پہنچتے پہنچتے انکی صورت تبدیل ہو گئی تھی لیکن محمودؔ نے ان وژنوں کو ایسی زندگی بخشی کہ آج تک اس صنف میں شعر گوئی کا رواج عام ہے۔ حبّہ خاتون کی طرح محمودؔ گامی کے وژن بھی ایک رومانی کسک لئے ہوئے ہیں اور ان میں بھی محبت کا اظہار عورت سے مرد کی جانب رہا ہے اور ایسے لافانی نغمے جنم پا گئے ہیں۔

؎ کیتو چھک نُندہ بانے — وو لو ماشوقہ میا نے
ژھان میتے لوسہ اُچھی — ژیے کیاہ گئی منہ مُچھی
ییتم از زوسنہ پُچھی — زہ لو ماشوقہ میانے

یا ایسے خالص کشمیری الفاظ میں محبت کا جادو جگایا ہے۔

؎ گوسنگے کستورِ مُشکِ کو فوارتن نا دس تے
متھر و مینہم چھتھر لو نین ہوا وس تے
شتھرے گیلن منہ کرتم چھس بیکیس تے
گژھہ تے ولسیئے یارا نتن اُستے اُستے

وژنوں کے علاوہ محمودؔ گامی نے کشمیری زبان میں غزل کو پوری طرح فارسی شاعری کے لوازمات کے ساتھ پہلی دفعہ متعارف کرایا ہے۔ اگرچہ انکی غزلوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور انمیں وہ شعریت بھی باقی نہیں ہے جو محمودؔ کے گیتوں میں موجود ہے۔ لیکن انکے ایسے بوئے ہوئے بیج نے آگے چلکر ایک بلند قامت درخت کی صورت اختیار کی ہے جیسے ہم رسُلؔ میرؔ اور مہجورؔ کی غزلوں میں محسوس کرتے ہیں۔ محمودؔ گامی نے اپنے گیتوں میں اپنے خالص کشمیری محبوب کو یاد کیا ہے۔ وہ اسے کشمیر کے پہاڑوں آبشاروں ندی نالوں اور گاؤں گاؤں میں تلاش کر کے گلے لگاتا ہے۔ ہمیں کشمیری زبان کے دیگر شاعروں کی طرح محمودؔ کے محبوب میں اجنبیت نظر نہیں آتی ہے۔ وہ اسے خالص کشمیری ملبوسات میں آرائش دیتا ہے کشمیری زیور پہناتا ہے اور کشمیری پھولوں کے ہاروں سے آراستہ کرتا ہے

محمود گامی کو کشمیری زبان کے الفاظ پر جو قدرت حاصل رہی اور اس نے ان سے جو جادو جگایا ہے یہ فقط اُسی کا حصّہ ہے اسکے بعد آنے والے شعراء چاہے وہ مثنوی لکھتے ہوں یا غزل فارسیت سے اپنا دامن بچا نہیں سکے ہیں۔ حیرت اس بات کی ہے کہ وہ محمود کی روایات کو آگے بڑھا بھی نہیں سکے ہیں اور آج تک ہم محمود کے ایسے لافانی اشعار کو داد دینے سے قاصر رہے ہیں۔

سہ یکے اُسُن کتہ کرتم کوہ کالی ئے ہُکے مُکے پیرکی مئے تراوِ چھوکالی ئے
دُکلہِ کوُر نفس وُچھِتہ مرن چھِہ کالی ئے ہتے ویسیے متہ کرتم او ڈالی ئے

یا

مرُزا آوتھ نیو تم سوسنے اُبتہ کرہ ہس روہ لیس موہنے
گوم ترا آوِتھ رچن بیے کریئے درشُن دیے

یا

لشہ نارِ وِتھ لوُ تم پنو میے زاہہ عشرِ متیو مشم بنہ بتہ زانہہ
لشہ زن نارِ زو لتھس گنگے ژھار کھولوِ رنگے رنگے

محمود نے اپنی مثنویوں اور غزلوں میں محض محبت کے رسیلے گیت ہی نہیں گائے ہیں بلکہ انکی اکثر تخلیقات اُس چراغ کو جلائے ہوئے رکھتی ہیں جو صدیوں پہلے للہ عارفہ، نندہ ریشی اور کتنے ہی دوسرے عارفوں نے روشن کیا تھا۔ وہ کشمیری زبان کے پہلے صوفی شاعر بھی ہیں جنکی بنیاد پر سوچھ کرال، شمس فقیر اور رحمان ڈار جیسے بزرگوں نے زینت بخشی ہے۔

حُبہ عہ ستی جُمُعہ پھوک لوے حبالبس کیھو کہ عہ ستی میوُل بیہ آلبس عہ ستہ
مود کیاہ رُود کیاہ باقی حسالبس رِنہ چھک زندہ کتھہ آلبس عہ ستی
یا
دُمرجی فرق چھے شیرس تہ شالس انہ گٹہ دم دیاؤ دنس ہے

کنہ منزے دراوُلال

ضرورت اس امر کی ہے کہ محمود گامی کے کلام کا از سر نو جائزہ لیکر انکے مقام کا تعین کیا جائے۔ ★★

موتی لال ساقی

پرمانند

کشمیری زبان کے قدآور شعرا کا جب بھی اور جہاں بھی تذکرہ ہوگا پرمانند کا نام صفِ اوّل کے اِن مشاہیر کے ساتھ ضرور لیا جائے گا۔ کیونکہ کوئی بھی صاحبِ نظر ادبی مورخ یا نقّاد اس کی عظمت کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پرمانند نے جتنا کچھ بھی لکھا ہے اُس کی بدولت اس کا نام ہمیشہ درخشندہ اور تابندہ رہیگا، کیونکہ اُن کی تخلیقات میں تجلّیِ ذات اور عرفانِ حق کی روشنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ہمارے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ کشمیری میں نظم نگاری کی ابتدا بیسویں صدی میں ہوئی، مگر واقعہ یہ ہے کہ باقاعدہ موضوعی نظمیں لکھنے کی ابتدا پرمانند نے انیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں کی تھی اور اسطرح سے کشمیری میں باقاعدہ موضوعی نظمیں لکھنے کی تواریخ کم و بیش ۱۳۰ سال پرانی ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو اور انگریزی کے اثر سے پہلے ہی ہمارے یہاں نظم نگاری نے اپنی بنیادیں استوار کی تھیں۔ میرے خیال میں پرمانند کشمیری زبان کا پہلا شاعر ہے جس نے شعوری طور نظم کی وسعتوں کا اندازہ کیا تھا اور وہ "وژن" کے دائرے سے باہر آگیا تھا۔ مختلف موضوعات پر لکھی گئی ان کی نظموں میں سے "کرمہ بومِکا (عمل کی دھرتی) سہز وِتزار (سہج وچار) کُل تہٕ ژھاے (درخت اور چھایا) "امرناتھ یاترا" خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں اِن نظموں میں وحدتِ تاثر کے ساتھ ساتھ ڈرامائیت کا عنصر بھی کارفرما ہے۔

پرمانند کے تین طویل سنگیت روپک "سُدام ژرِیتر" (سُدا ما کی سوانح) رادھا سویمور (رادھا سویمبر) اور شِو لگن الگ سے توجہ چاہتے ہیں۔ یہ تینوں روپک مثنوی کی صنف سے مختلف ہیں۔ ہر ایک روپکٕ میں ہیئت کا ایک انوکھا تجربہ اپنایا گیا ہے۔ ان تجربوں کی روایت تو پرمانند

سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اُن کی وفات کے بعد راجانک کرشن رازدان کے سوا کوئی اور شاعر اِن تجربات سے فائدہ نہیں اُٹھا سکا۔ اِن تینوں روپکوں میں کہانی کا دھارا کامیابی کے ساتھ بہتا ہے۔ لگتا ہے کہ سب کچھ قاری کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ ڈرامائیت کے عنصر کے پیشِ نظر ہی میں نے اِن طویل نظموں کو سنگیت روپک کہا ہے۔ ساری داستاں کو پابند نظم کے روپ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور موقع اور محل کے اعتبار سے اس میں گیت اور رقص کے گیت بھی جوڑ دیئے گئے ہیں۔ تینوں منظوم کہانیوں کو معمولی رد و بدل اور کانٹ چھانٹ کے بعد اوپیرا کا روپ دیا جا سکتا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ طویل ترین نظموں کو ایک ہی ردیف اور قافیے میں اول سے آخر تک لکھا گیا ہے۔

اپنے تخلیقی سفر کے دوران ہیئت کے جو تجربے پرمانند نے کئے اُن کا ایک ہلکا سا خاکہ اس طرح ہے۔

رادھا سویمبر:۔

. . . .
. . . . ا
. . . .
. . . . ب
. . . .
. . . . ا
. . . .
. . . . ب

(کچھ گیتوں کو چھوڑ کر ۲۴۵ چھپے ہوئے صفحات پر پھیلی ہوئی اس طویل نظم کو بھی ایک ہی ردیف اور قافیے میں لکھا گیا ہے۔)

شِو لگن اور سُداما چرتر:۔

. . . .
. . . . ب
. . . .
. . . . ب
. . . .
. . . . ا
. . . .
. . . . ا

. . . . ج
. . . . ج
. . . . ا
. . . . ا

اِن طویل منظوم کہانیوں میں شاعر نے سنگیت کی لے تیز کرنے اور زوردار بنانے کیلئے Repair جیسے کشمیری میں "دوج" کہتے ہیں کا استعمال کیا ہے جسکی وجہ سے نظموں میں نغمگی پیدا ہوگئی ہے اور جمود و ٹھہراو کو جگہ نہیں مل سکی ہے۔ مختصر نظموں کی ضمن میں بھی پرمانند نے اُس وقت کچھ نئے تجربے کئے ہیں جب کشمیری کے اکثر و بیشتر شعراء غزل کے محدود احاطے میں مقید ہو کے رہ گئے تھے۔ نظموں میں ہیئت کے جو تجربے پرمانند نے کئے اُن کا انداز کچھ اسطرح ہے۔

. . . . ا
. . . . ا
. . . . ا
. . . . ب
. . . . ج
. . . . ج
. . . . ج
. . . . ب (امرناتھ یانزاور [illegible] وتراز)

پرمانند کی شاعری اس بات کی گواہ ہے کہ اُس نے پہلی بار فارسی کی روایت سے انحراف کیا، اُس روایت سے جس نے سلطان شہاب الدین کے زمانے سے کشمیر میں اپنا پرچم بلند کر رکھا تھا۔ روایت سے انحراف کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ روایت سے بغاوت کرنا اُن ہی لوگوں کے حصے میں آتا ہے جن کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے مگر مروجہ اسالیب اُنکے اظہار کیلئے ناکافی ہوں۔

دراصل پرمانند کو اپنے دور کے شعرائے کے تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ اُن کے زمانے کے تمام کشمیری شاعر یا تو زلف یار میں اسیر ہو کے رہ گئے تھے۔ ورنہ تصوف کے خارزاروں میں موتیوں کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھے۔ عام شاعر "وژن" اور پد کے صحرا میں کھو کے رہ گئے تھے۔ غزل کا مزاج پیدا ہی نہیں ہوا تھا چنانچہ آج بھی اس بات کا شکوہ ہو رہا ہے کہ کشمیری میں غزل کے نام پر "وژن" لکھے جاتے ہیں۔ دراصل روایت سے پرمانند کا بغاوت کرنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اُن کا تخیل گہرے تجربات کو اپنے اندر سمو چکا تھا۔

پرمانند بنیادی طور پر بھگتی بھاو کا شاعر ہے۔ اس سے بڑھ کر جو بات اُن کو اور لوگوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اُن کی شاعری گہرے مشاہدے اور سچے داخلی تجربات کا آئینہ خانہ ہے۔ ان کی شاعری ببانگ دہل اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ عرفان ذات کی بدولت ہی انسان کو عرفان حق ہو سکتا ہے۔ "حق" کو سمجھ کر وہ دوسروں کو بھی اپنے تجربے میں شریک بنا دینا چاہتے ہیں مگر اُن کو بھی آدِ شنکر آچاریہ کی طرح "نیتہ نیتہ" (یہ نہیں یہ نہیں) کا سہارا لینا پڑتا ہے ؎

گیانی لوگوں نے کہہ رکھا ہے
بیدار ذہن لوگوں نے اُسے پا لیا ہے۔
وہاں تک عقل و فراست کی رسائی نہیں
عرفان ذات سے ہی "اُسے" پایا جا سکتا ہے۔

جس کسی کو عرفان ذات ہوا وہ دنیا میں رہ کر بھی دنیا کی بندشوں سے آزاد ہے۔ وہ محبت کا ایک اتھاہ سمندر ہے۔ ایشور سروپ ہے۔ اُسے موت کا کوئی ڈر نہیں ؎

جب تمہارے اندر محبت کا الاؤ روشن ہو جائے گا
سبھی لوگ تمہیں آتم سروپ نظر آئیں گے
محبت کی خوشبو ہر طرف پھیل جائیگی
ایسے میں اگر ساری دنیا تم پر ہنستی ہے تو ہنسے
یہ آنا جانا اور جینا مرنا محض ایک سراب ہے

"امرناتھ یاترا" والی نظم میں جس کامیابی کے ساتھ پرمانند نے اشٹانگ یوگ کے مختلف مراحل اور ہر منزل پر حاصل ہونے والے تجربات کو شاعرانہ روپ دیا ہے وہ اُنکے مہایوگی ہونے کے ساتھ ساتھ اُنکے خلاقانہ ذہن کی روشن ترین مثال ہے۔ یہ نظم نہ صرف اُنکے یوگی ہونے کی تصدیق کرتی ہے بلکہ اس بات کا بھی قاری کو بھرپور اندازہ ہوجاتا ہے کہ شاعر کو یوگ شاستر پر بھرپور دسترس حاصل تھی حالانکہ یہ بات بھی اپنی جگہ پر مسلمہ ہے کہ روحانی تجربات کے دوران انسان کی رسائی اُن چیزوں تک ہوجاتی ہے جنکے بارے میں اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا ہے۔ شاید علامہ مشرق نے اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

مگر اسکے باوجود نظم میں استعمال کی گئی اصطلاحات اور بیان کئے گئے تجربات اس بات کی دلات کرتے ہیں کہ شاعر یوگ شاستر کے اسرار ورموز سے اچھی طرح واقف تھا ؎

ست چت آنند سروپ اسی کایا کے اندر ہے
وہ تو من کی راجدھانی کا سمراٹ ہے اُسکا کوئی شریک نہیں
لوگ اسے کیلاش کی چوٹی سے تعبیر کریں تو کریں
اپنے من کو قابو میں کر اور پربھو کی آرادھنا کر

پرمانند اگرچہ اپنی تخلیقات میں متعدد مقامات پر نرگن وادی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جیسا کہ اُنکی نظموں "امرناتھ ناتھ یاترا" اور "سہرو شرار" سے ظاہر ہے مگر اُن کی شاعری کا بیشتر حصہ ان کو سگن وادی وشنوی شاعر ثابت کرتا ہے۔ سگن واد میں بھی پرمانند رادھا کرشن بھگت شعراء کا ہمنوا رہا ہے۔ جنکو اصطلاحوں کی زبان میں "مدھر بھاؤ" کے شعراء کہا گیا ہے۔ کشمیر میں مدھر بھاؤ کی روح پرمانند کے ہاں ہی پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ اسکے بعد راجانک کرشن رازدان نے اس کی آبیاری کی مگر ان دو شعراء کے بعد یہ کلی اس طرح مرجھا گئی کہ اب تک بھی کوئی اسے شگفتہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

پرمانند کی شاعری کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ گہرے روحانی تجربات کا آئینہ ہونے کے باوجود اس میں سنگیت کا عنصر کافی نمایاں ہے۔

پرمانند کو عام طور پر یہ دوش دیا جاتا ہے کہ اُسکی شاعری میں سنسکرت الفاظ اور اصطلاحات کا بیجا استعمال ہوا ہے۔ مگر میرے خیال میں اس میں شاعر کا کوئی دوش نہیں۔ انہوں نے جن الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال کیا ہے وہ موقع اور محل کے اعتبار سے درست ہے۔ کیونکہ اُنکے متبادل کشمیری تو کیا ہندوستان کی کسی بھی علاقائی زبان میں موجود نہیں۔ انگریزی جیسی ترقی یافتہ زبان نے بھی ان اصطلاحات کو جوں کا توں قبول کیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ گھمبیر تجربات کو بیان کرنے کیلئے گھمبیر الفاظ کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔ ملٹن کو اس لئے انگریزی ادب کے دائرے سے اس بات کیلئے خارج نہیں کیا گیا کیونکہ انہوں نے "فردوس گم شدہ" میں کثرت سے لاطینی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اس بات سے شاید کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ خیال اور تجربہ جتنا اعلیٰ وارفع ہوگا اُسکی ادائیگی کی زبان روزمرہ سے اتنی ہی دور ہوگی۔ اس بات کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ پرمانند بھگتی بھاو کا شاعر ہے۔ بھگتی کی تشریح بھاگوت پوران میں موکھش پانے کے ایک ذریعے کے طور پر کی گئی ہے۔ موکھش پانے کے دوسرے ذریعے کرم یوگ، گیان یوگ اور راج یوگ قرار دئے گئے ہیں۔ وشنویوں نے بھگتی اور پراپتی (رضائے الٰہی) کو مکتی کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے۔ جبکہ کرم یوگ بھی بالآخر بھگتی کی ہی منزل پر پہنچا دیتا ہے۔

پرمانند کرشن بھگت شاعر ہے۔ یہ وہی کرشن ہے جسے اپنشدوں میں دیوکی پُتر اور رشی انگرا کا شش بتایا گیا ہے۔ یہی کرشن بھگوت گیتا جیسے نغمۂ خداوندی کا خالق ہے۔ مہابھارت میں یہی کرشن عمل پیہم کا درس دیتا ہے۔ اسی کرشن کے ایک ہزار نام وشنو سہسر نامے میں بھگتوں کے کلیان کیلئے گنائے گئے ہیں اور جین مت کے ماننے والوں نے اسی کرشن کو ترتھنکر کا درجہ دیا ہے۔

پرمانند کے مشہور غنائے "رادھا سویمور" کی کہانی کا ماخذ بھاگوت پوران تو نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کتاب میں کسی جگہ رادھا کا نام کُھل کر نہیں لیا گیا ہے۔ کرشن کے ساتھ رادھا کا ذکر پہلی بار ساتویں صدی میں بنگالی ادب میں کُھل کر سامنے آتا ہے۔ گیت گووند کے شہرہ آفاق خالق جے دیو کا زمانہ

بارھویں صدی ہے۔ جس وقت اُس نے گیت گووند لکھی اُس وقت رادھا کرشن بھگتی کا تصور جڑ پکڑ چکا تھا۔ نم بارکا اور رادھا کرشن مت کے دوسرے لوگوں نے بھی اس تصور کو جلا بخشنے میں خاصا کام کیا ہے۔ اندازہ یہی ہے کہ "رادھا سو یمور" کی کہانی کسی ایسی لوک روایت پر مبنی ہے جس کو قلم بند نہیں کیا گیا تھا۔ "رادھا سو یمور" کی سب سے بڑی خصوصیت اسکی ارضیت ہے۔ بنگال کے وشنوی شعرا کی طرح پرمانند نے کرشن کو پرم آتما جان کر بھی منش کے روپ میں اُسکی پوجا کی۔ اور اپنا تن من اور دھن بھگوان کرشن کے قدموں پر ڈال دیا۔ اس رویک میں بھگوان کرشن کے جن انسانی رشتوں کا بیان ہوا ہے۔ انہوں نے اس کی شخصیت کو زیادہ حسین اور دلکش بنا دیا ہے۔ بنگال میں ایک روایت ہے کہ کرشن کا نام لئے بغیر کوئی گیت تخلیق نہیں ہو سکتا، اسی طرح پرمانند کا کوئی ہی گیت ایسا ہو گا جس میں وشنو کا ذکر ایک نہ ایک روپ میں موجود ہو۔ اس رویک کو پڑھتے وقت گمان گزرتا ہے کہ قاری بندرا بن میں ہے اور رادھا اور کرشن اسکی آنکھوں کے سامنے چل پھر رہے ہیں۔ قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی اُن خوش نصیب لوگوں میں سے ہے جنہوں نے بھگوان کرشن کے درشن کئے ہیں۔ شاعری میں جس صداقت، خلوص اور داخلی احساس کی ضرورت ہوتی ہے وہ سبھی چیزیں اس طویل نظم میں موجود ہیں۔ بھگتی بھاو کے شعرا میں پرمانند کا درجہ نم بارکا، جے دیو، سور داس، میرا بائی اور گیانی شور سے اگر بلند نہیں تو بھی اُن کے برابر ضرور ہے۔

پرمانند نے جو بھجن لکھے ہیں فارم کے لحاظ سے یہ سبھی "وژن" کے دائرے میں آتے ہیں۔ "وژن" دراصل Lyric ہے جس میں سنگیت کی لے دھیمی ہوتی ہے اور الفاظ نرم اور دل میں اُتر جانے کی کیفیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے رقص کے گیت بھی لکھے ہیں جو کافی سُریلے اور دل گداز ہیں۔ تین طویل نظموں کے علاوہ انہوں نے پچاس سے زائد میٹھے اور دل لبھا دینے والے گیت لکھے ہیں جو بھگتوں کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔

پرمانند کا جنم سنہ ۱۷۹۲ء میں جیٹھ شکلہ سپتمی کے دن پنڈت کرشن جو کے ہاں مٹن کے نزدیک ایک گاؤں "سپر" میں ہوا۔ پیدا ہونے کے بعد اس نوزائیدہ بچے کا نام نندہ رام رکھا گیا مگر بعد میں انکا

قلمی نام "پرمانند" اس قدر مشہور ہوا کہ آج بھی کشمیری ادب سے دلچسپی رکھنے والے بہت سارے لوگ اُن کے اصلی نام سے ناواقف ہیں۔ پرمانند ذات کے پنڈت تھے اور اُن کا گوتر "سامعنہ بھاردولج" ہے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ اِن کا خاندان اپنے آپکو مشہور ویدک رشی بھاردواج کی اولاد سمجھتا ہے۔ اِن کے دادا پنڈت سہز رام، پتا پنڈت کرشن جو اور خود پرمانند جی بھی پٹواری تھے چنانچہ اسی بنا پر ان کے خاندان کا نام پٹواری عام ہو گیا اور آج بھی ان کے خاندان کے لوگ "پٹواری" کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ پرمانند کی ماتا کا نام سرسوتی دیوی تھا۔ ہندو دیو مالا میں سرسوتی فنونِ لطیفہ کی علامت ہے۔ حق تو یہ ہے کہ پرمانند نے اپنے آپکو سرسوتی کا صحیح بیٹا ثابت کر دکھایا۔ پرمانند نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے پتا جی تری کرشن پنڈت سے حاصل کی مگر ان کی شاعری کا مطالعہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ انہوں نے مروجہ تعلیم سے کچھ زیادہ ہی جانکاری حاصل کی تھی۔ اُن کو یوگ شاستر اور پرانوں کا بخوبی علم تھا وہ فارسی، ہندی اور ملی جلی زبان میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ اُن کی ریختہ شاعری کے کچھ نمونے "رادھا سویمبر" میں دیکھے جا سکتے ہیں البتہ اُن کا فارسی کلام تلف ہو گیا ہے۔

پرمانند کی شادی بچپنے میں ہی ایک پٹواری کی لڑکی مال دید کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ پٹواری جسکی لڑکی پرمانند بیاہ لایا تھا اُنکے پتا کا دوست تھا۔ مگر دو پٹواریوں کی یہ دوستی پرمانند کیلئے بہت مہنگی ثابت ہوئی کیونکہ دونوں کا عمر بھر نباہ نہیں ہو سکا۔ مال دید دنیاداری اور جاہ و حشمت کی طرف دار تھی جبکہ پرمانند بچپن سے ہی راہِ حق کا متلاشی تھا۔ وہ اپنے آپ میں غوطہ زن تھا۔ خارجی دنیا کے ساتھ اسکا تعلق عارضی سا تھا۔ چنانچہ زندگی کے متعلق نقطہ نظر کے اس تضاد نے دونوں کیلئے سُکھ شانتی کے دروازے ہمیشہ کیلئے بند کر دئیے تھے۔ یہ ایک ایسا خلا تھا جسے پُر کیا جانا کبھی ممکن نہیں ہو سکا۔ اپنے پتا کی وفات کے بعد عین نوجوانی میں آپنے پٹواری کا عہدہ سنبھالا۔ چند ایک سال تک وہ اس ذمہ داری کو نبھاتے رہے مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکا اور آخر کار انہوں نے اس کام سے علیحدگی اختیار کی۔ اپنی پٹوارگری کے دوران انہوں نے مٹن کے ذیلداروں کو اپنی نیک نیتی اور روحانی فضیلت سے کافی متاثر کیا تھا۔ چنانچہ پٹوارگری سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد اُن کے گھر کا سارا خرچہ صالح گنائی جو کہ اسوقت

کے ذیلدار تھے اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ چنانچہ صالح گنائی نے پرمانند کو "بیہر" سے لا کر مٹن میں آباد کیا اور اپنی وراثت میں سے ۲۹ر کنال اور ۷ر مرلے زمین اُسکے نام منتقل کروا دی۔ چنانچہ اس کا تذکرہ اب تک مٹن کے پٹوار ریکارڈ میں موجود ہے۔ زندگی بھر پرمانند کو مصیبتوں اور آفتوں نے گھیرے رکھا۔ اُس کے ہاں دو لڑکے پیدا ہوئے مگر دونوں عین شباب میں چل بسے۔ چنانچہ اِسکا تذکرہ انہوں نے خود ایک جگہ کیا ہے۔ ؎

میں ایک اکیلا آشاؤں کے راکھ کے ڈھیر پر بیٹھا ہوں
میرا کوئی لڑکا نہیں — اور اب آنکھوں کی روشنی بھی جواب دے چکی ہے

اب لے دے کے اُسکی دو لڑکیاں رہیں۔ ایک کی شادی اُس نے ایک گاؤں میں کی اور دوسری لڑکی پدمان دید کو گھر میں ہی رکھا اور بیجبہاڑہ کے گوپال راز دان کو گھر داماد بنا کر لایا۔ پہلی لڑکی کا ایک لڑکا بھی پرمانند نے گود لیا۔ چنانچہ اُن کی دونوں لڑکیوں کے بچے آج مٹن میں پرمانند کی وراثت پر آباد ہیں۔

تلاشِ حق اور زیر لب گنگنانا۔ یہ دونوں چیزیں پرمانند کی رگ رگ اور نس نس میں رسی بسی تھیں۔ چنانچہ بچپن ہی میں وہ سیہر کے سرسوتی کے چشمے پر جا کر گھنٹوں دیوی کے دھیان میں کھو جاتا تھا اور کُنجِ تنہائی میں بیٹھ کر زیر لب گنگناتا رہتا تھا۔ اسی گُنگناہٹ نے بعد میں ایک پہاڑی نالے کی طرح زور سے گیت گانا شروع کیا۔ بچپنے میں وہ غریب تخلص کرتے تھے مگر بعد میں اسے بدل کر پرمانند کر دیا۔ اُن کے ابتدائی دور کی شاعری اب ناپید ہے، ہو سکتا ہے کہ اسے شاعر نے خود ہی تلف کیا ہو یا کسی اور وجہ سے محفوظ نہ رہ سکی ہو۔

وقت گزرنے کے ساتھ ہی ان کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور دور و نزدیک سے اکثر لوگ اُن کے حلقہ شاگرداں میں شامل ہو گئے۔ اُنکے ششیوں میں صالح گنائی، لکھشمن رینہ بلبلؔ)، نارائن مرزگر، جایہ سمت رام، سہز رام اور دمہ پٹواری سرفہرست ہیں۔ بلبلؔ انکا عزیز ترین طالب تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن پرمانند جی کہیں گئے ہوئے تھے۔ بلبلؔ اُسوقت آ گیا اور

دیکھا۔ کہ پرمانند اُن دنوں رادھاسویمور لکھ رہے ہیں۔ بلبل نے قلم اٹھایا اور اسکا "موہنی روپ" لکھ دیا۔ جب پرمانند نے واپس آکر دیکھا تو انہوں نے اس حصے کو جوں کا توں اپنے روپک میں شامل کیا۔ اس حصے کی نشاندہی میں نے رادھا سویمور ترتیب دیتے وقت کی ہے۔ بلبل کی عقیدت بھی اپنے گرو کیلئے کچھ کم نہیں تھی اُن کے تمام بھجنوں میں آخری سطر میں پہلے پرمانند کا نام آتا ہے اور بعد میں بلبل کا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بلبل کے بہت سارے بھجن پرمانند کے کھاتے میں ڈالے جاتے ہیں۔

پرمانند کے کلام پر مُشتمل دو نسخے قابل اعتبار اور مستند مانے جاتے ہیں۔ ان میں سے بھی لکھشمن بلبل کے نسخے کو فوقیت حاصل ہے کیونکہ وہ کافی دیر تک اپنے گرو کے ساتھ رہے۔ کُلیات پرمانند ترتیب دیتے وقت میں نے بلبل کے نسخے کو ہی بُنیاد بنایا ہے۔ دوسرا نسخہ کسی نراین کول کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا مگر میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔

پرمانند کا انتقال سنہ ۱۹۳۶ بکرمی مطابق ۱۸۷۹ء کو مٹن میں ہوا۔ اس طرح انہوں نے پچاسی سال کے قریب عمر پائی۔ آپ کا شرادھ ہر سال بھادوں شکلہ پکھ سپتمی کو ہوتا ہے۔ آپ کا زائچہ وفات بلبل کے اس شعر سے نکلتا ہے۔

؎ بلبل کشید نالہ بہ دل گفت ہا زدم
یا ہوے ہاے ساز کہ "گلشن خزاں گرفت"

پرمانند کا پہلا گرو اُن کا اپنا پتا تھا، چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

ع میراست گرو اور باب شری کرشن ہے

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے بعد میں اپنے کُل برہمن سے بھی شکھشا لی تھی۔ مگر ایک زور دار روایت ہے کہ اُنکا گرو مٹن کے شمشان "ٹامہ ڈور" کا بھیرو ناتھ گنگا بھی تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بھیرو ناتھ کی شکھشا لینے کے بعد پرمانند کو متعدد زبانوں پر خود بخود دسترس حاصل ہوئی اور اُن کی داخلی دنیا میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوا۔

ڈاکٹر عبدالقادر سروری کا یہ دعویٰ باطل ہے کہ پرمانند نے اپنشدوں کا ترجمہ "اُپ نکھیت" کے نام سے فارسی میں کیا تھا۔ اپنشدوں کا ترجمہ دارا شکوہ نے کروایا تھا، جبکہ پرمانند پٹھان اور سکھ دور میں بقید حیات تھے۔ اسی طرح پروفیسر کول نے "Studies In Kashmiri" نامی کتاب میں ٹھاکر منشوٹی کے کچھ بھجن پرمانند کے نام سے چھاپ دئے ہیں جو ادبی تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ پرمانند جی کا کلام پہلی بار "گیان پرکاش" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں پرمانند کے علاوہ کچھ دوسرے شعراء کا مختصر کلام بھی شامل ہے۔ اس کے بعد ماسٹر زندہ کول نے آپکی شاعری کو دیوناگری خط میں انگریزی ترجمے کے ساتھ "پرمانند" کے نام سے تین الگ الگ حصوں میں شائع کیا۔ اس کے بعد پرتھوی ناتھ مدھوپ نے بھی ہندی میں آپ پر ایک مختصر کتاب لکھی۔ یہ کتاب کوی شری مالا سلسلے میں "پرمانند" کے نام سے راشٹر بھاشا پرچار سمتی وردھا نے شائع کی ہے۔ اس کتاب میں پرمانند کے کچھ بھجن شامل ہیں۔ پرتھوی ناتھ کول بامزئی نے "سوداِم چیتہ ترِ" کو الگ سے ترتیب دیا تھا اور اسے بڑے سائز (۲۰×۲۶/۸) پر غلام محمد نور محمد نے بہت پہلے شائع کیا تھا۔ اب کلچرل اکادمی نے انکا کلیات دو حصوں میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں ہر ممکن حد تک پرمانند جی کے تمام کلام کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نہیں تھیں۔ طالب علم اکثر اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں پر سبق پڑھتے تھے۔ یہ کتابیں پشت در پشت حاصل کی جاتی تھیں۔ بدقسمتی سے آپ اپنے بھائی کی رُکاوٹ کے باعث اپنی خواہش کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ادھر سے آپ کے بڑے بھائی نے حسد کی وجہ سے مقامی پنڈت اُستادوں سے آپکو مزید پڑھانے سے روک دیا۔ نتیجہ کے طور پر آپ کسی کے گھر جا کر تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ بعد میں آپکو کسی طرح سے یہاں علم حاصل کرنیکا کوئی ذریعہ نہ ملا۔ یہاں تک کہ ایسا محسوس ہوا کہ علم حاصل کرنے کے دروازے آپکے لئے بند ہو گئے۔ اس قدر ظلم ہونے کے باوجود آپنے اپنے دل کا دُکھ کسی کے سامنے ظاہر نہیں کیا۔ اور نہ ہمت ہاری۔ یہ محنتی اور جفاکش ہونے کے باعث آپنے تعلیم جاری رکھی۔ اپنی آرزوؤں کو پورا کرنے کے لئے آپ رینیاں تِلک چندر مُنشی نام کے ایک پنڈت کے پاس چلے گئے اور اُس سے التجا کی۔ تِلک چندر نے آپکا ادبی شوق و ذوق دیکھکر آپ کی مدد کرنے کا عہد کیا اور اُسنے اپنے گُرو شری کپل بھٹ بخشی کو آپ کو مزید پڑھانے کیلئے کہا۔ کپل بھٹ ایک سال تک ایشور کول کو پڑھا کر بعد میں فوت ہوئے۔ اس واقعہ سے رنجیدہ خاطر ہو کر آپ شش و پنج میں پڑ گئے۔ کچھ مُدت کے بعد آپنے جموں میں پڑھنے کا ارادہ کیا۔ اسی اثنا میں آپکے بڑے بھائی نے آپکی ترقی برداشت نہ کرتے ہوئے تھانے والوں کو رپورٹ دی کہ میرا بھائی گھر سے بھاگ گیا ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی پولیس والوں نے آپکے خلاف کاروائی کی اور آپکو راستے میں ہی راجوری میں گرفتار کر کے واپس سرینگر لایا۔ یہاں رہ کر آپکے دل میں سکون نہ رہا۔ آپ کو دوبارہ جموں جانیکا خیال آگیا۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے آپ ایک دن جموں کیلئے روانہ ہو گئے۔ جموں میں آپکا نہ کوئی رشتہ دار تھا اور نہ کوئی دوست۔ اس صورتحال میں وہاں رہنا آپ کیلئے ایک مسئلہ بن گیا۔ آخر آپ ایک بارسوخ آدمی کے پاس چلے گئے۔ اسکے ساتھ بات چیت کے دوران ایشور کول نے اُسے ہشاش بشاش پایا کیونکہ اسکو اُسوقت بیٹے کی پیدائش کی خبر ملی تھی۔ اس خوشی میں انہوں نے آپ کو ایک سوال پوچھا اس کا جواب دینے کیلئے آپ نے کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ گن کر لکھا نہیں جواب دیا کہ آپکے گھر میں ایک

بدری ناتھ کلّا

ایشور کول

ایشور کول کا نام کشمیر میں بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ آپکا نام اُن مُصنفین میں شُمار کیا جاتا ہے جنہیں سنسکرت زبان کے علاوہ دیگر زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ آپکی پیدائش سرینگر متصل عالی کدل بدھ گیر میں ۱۸۸۰ء بکرمی سموت میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام شری گنیش کول تھا جو اپنے دور کے بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ گنیش کول کے تین فرزند تھے۔ ان تین میں سے ایشور کول بہت ذہین اور چالاک تھے۔ آپ کے ابتدائی آثار سے پتہ چلتا تھا کہ آپ اپنی قابلیت کے جوہر ادبی میدان میں کسی نہ کسی رُوپ میں ضرور دکھا دیں گے۔ آخر میں ایسا ہی ہوا۔

ایشور کول دس سال کے ہی تھے کہ اس کے والد کا سایہ سر سے ہمیشہ کیلئے اُٹھ گیا۔ آپ کی والدہ محترمہ اس سے پہلے ہی اس وقت فوت ہوئی تھی جبکہ ایشور کول تین سال کے تھے۔ اسی لئے آپ کی پرورش آپکے بڑے بھائی نے ذمہ لی۔ یتیم ہونے کے باعث بھائی آپکو کافی لاڈ پیار کرتی تھی۔ چالاک اور ہوشیار ہونے کی وجہ سے بچپن میں آپ نے علم حاصل کرنے کی از حد کوشش کی۔ پڑھائی کے طریقے اُسوقت آج کل کی طرح تسلی بخش نہیں تھے۔ اس دوران آپکو بہت ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ کے بڑے بھائی نے اپنی پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کی۔ آپ بھائی کے اس طور طریقہ سے بہت ناراض ہوئے۔ بعد میں آپ نے اُس سے دور رہنے کا پختہ ارادہ کیا اور گھر چھوڑ دیا۔ مگر کسی صورت میں آپ نے پڑھائی ترک نہیں کی۔ اُسوقت کوئی سکول باقاعدہ نہیں چلتا تھا۔ طالب علم پنڈتوں یا مولویوں کے گھر جا کر کسی نہ کسی طریقہ سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اُس زمانے میں آج کی طرح چھپی ہوئی کتابیں دستیاب

نہیں تھیں۔ طالب علم اکثر اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں پر سبق پڑھتے تھے۔ یہ کتابیں پُشت در پُشت حاصل کی جاتی تھیں۔ بدقسمتی سے آپ اپنے بھائی کی رُکاوٹ کے باعث اپنی خواہش کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ادھر سے آپ کے بڑے بھائی نے حسد کی وجہ سے مقامی پنڈت اُستادوں سے آپکو مزید پڑھانے سے روک دیا۔ نتیجے کے طور پر آپ کسی کے گھر جاکر تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ بعد میں آپکو کسی طرح سے یہاں علم حاصل کرنیکا کوئی ذریعہ نہ ملا۔ یہاں تک کہ ایسا محسوس ہوا کہ علم حاصل کرنے کے دروازے آپکے لئے بند ہو گئے۔ اس قدر ظلم ہونے کے باوجود آپنے اپنے دل کا دُکھ کسی کے سامنے ظاہر نہیں کیا۔ اور نہ ہمت ہاری۔ یہ محنتی اور جفاکش ہونے کے باعث آپنے تعلیم جاری رکھی۔ اپنی آرزوؤں کو پورا کرنے کے لئے آپ رئیس تلک چندر منشی نام کے ایک پنڈت کے پاس چلے گئے اور اس سے التجا کی۔ تلک چندر نے آپکا ادبی شوق و ذوق دیکھکر آپ کی مدد کرنے کا عہد کیا اور اُسنے اپنے گُرو شری کپل بھٹ بخشی کو آپ کو مزید پڑھانے کیلئے کہا۔ کپل بھٹ ایک سال تک الیشور کول کو پڑھاکر بعد میں فوت ہوئے۔ اس واقعہ سے رنجیدہ خاطر ہو کر آپ شش و پنج میں پڑ گئے۔ کچھ مدت کے بعد آپنے جموں میں پڑھنے کا ارادہ کیا۔ اسی اثنا میں آپکے بڑے بھائی نے آپکی ترقی برداشت نہ کرتے ہوئے تھانے والوں کو رپورٹ دی کہ میرا بھائی گھر سے بھاگ گیا ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی پولیس والوں نے آپکے خلاف کاروائی کی اور آپکو راستے میں ہی راجوری میں گرفتار کر کے واپس سرینگر لایا۔ یہاں رہ کر آپکے دل میں سکون نہ رہا۔ آپ کو دوبارہ جموں جانیکا خیال آگیا۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے آپ ایک دن جموں کیلئے روانہ ہو گئے۔ جموں میں آپکا نہ کوئی رشتہ دار تھا اور نہ کوئی دوست اس صورتحال میں وہاں رہنا آپ کیلئے ایک مسئلہ بن گیا۔ آخر آپ ایک بارسوخ آدمی کے پاس چلے گئے۔ اسکے ساتھ بات چیت کے دوران الیشور کول نے اُسے ہشاش بشاش پایا کیونکہ اسکو اُسوقت بیٹے کی پیدائش کی خبر ملی تھی۔ اس خوشی میں انہوں نے آپ کو ایک سوال پوچھا اس کا جواب دینے کیلئے آپ نے کاغذ کے پرزے پر کچھ گن کر انہیں جواب دیا۔ آپکے گھر میں ایک

ڈکلبیدا ہوا۔ یہی آپکی قسمت بیدار ہونیکا سبب بن گیا۔ جس کی وجہ سے اُنہوں نے آپکے علم نجوم سے متاثر ہو کر آپکو مہاراجہ کے پاس لیا۔ الیشور کول کو سرکاری سرپرستی یا اپنی مشہوری کی خواہش نہیں تھی۔ صرف آپکو علم کی پیاس تھی۔ اس لئے آپ گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

ایک بار مہاراجہ رنبیر سنگھ کے پاس آپنے بہت ہی نرمی سے اپنے دل کی خواہش ظاہر کی۔ راجہ نے آپکی خواہش [illegible] آپ کیلئے ایک قابل اُستاد تعینات کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ بعد میں بڑی مشکل سے بنارس کا ایک قابل ترین اُستاد جس کا نام رائے دیو کرشن جیوتشی تھا، لگا دیا گیا۔ رائے دیو کرشن اپنا زیادہ وقت پوجا پاٹھ اور کھانا پکانے میں صرف کرتے تھے۔ اس لئے انکے لئے وقت نکال کر آپکو پڑھانا مُشکل ہوا۔ ادھر سے اسے راجہ کے حُکم کی تعمیل ضرور کرنی تھی۔ بہرحال انہوں نے وقت نکالکر آپ کو پڑھانا شروع کیا۔ آپ دن رات ایڑی چوٹی کا زور لگا کر علم حاصل کرنے میں مصروف رہے۔ آپ نے سخت محنت کی وجہ سے ساری جیوتش وِدیا اور سنسکرت زبان کا پورا گیان حاصل کیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کو اپنی پڑھائی کا پورا موقع نہیں ملا تھا۔ اس لئے وہ زیادہ خواندہ نہیں تھا۔ انہوں نے تھوڑی بہت تعلیم اپنے باپ گلاب سنگھ سے حاصل کی تھی۔ اس کے باوجود وہ عالموں کا قدر شناس تھا اس لئے وہ عالموں اور فاضلوں کو خاصکر کے پنڈتوں اور مولویوں کی یکسان عزت کرتا تھا۔ اپنے علم کی پیاس بجھانے کیلئے وہ عالموں کی محفلیں منعقد کرتا تھا جن میں مختلف علوم، مثلاً مذہب، ادب، فلسفہ و دیگر موضوعات پر وقتاً فوقتاً ادبی بحث ہوتی تھی۔ مہاراجہ اعلیٰ ترین عالموں کو ان کی قابلیت پر انعامات سے نوازتا تھا۔ اس طرح انکی ادبی محفل میں بہت سے عالم انعامات حاصل کرتے تھے ایک بار الیشور کول نے بھی اپنی قابلیت کا جوہر دکھا کر مہاراجہ سے انعام حاصل کیا۔ اس طرح آپکا مقام عالموں کی صف میں سب سے پہلے شمار کیا جانے لگا۔ ادبی محفلوں میں آپکے سنسکرت زبان کے لب و لہجہ کو سن کر اور اس زبان پر آپکا عبور دیکھکر سارے دنگ رہ جاتے تھے۔ آپکی حاضر جوابی سے سب متاثر ہوتے تھے۔ ان ادبی صلاحیتوں کی

وجہ سے آپ کی مشہوری سارے دیش میں پھیل گئی۔ مہاراجہ نے اسے اپنے دربار کا جیوتشی بنایا۔ بعد میں راجہ نے سوچا کہ صرف ادبی محفلوں سے عالموں کی زندگی کا معیار اونچا نہیں ہو سکے گا۔ اور نہ انکی اقتصادی حالات سدھر جائے گی۔ آخر میں انہوں نے اپنی ریاست میں تحقیق کا شعبہ قائم کیا۔ اس منصوبے کو سب عالموں نے سراہا۔ اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے مہاراجہ نے آپ کو اس شعبے کا انچارج بنا دیا۔ ان کی قیادت میں بہت سی تخلیقات ایک زبان سے دوسری زبانوں میں منتقل ہوئیں جو اس شعبے میں اسوقت بھی دستیاب ہیں۔ اس دور میں آپ نے مطبوعات کا صحیح طور سے مطالعہ کیا۔ نتیجہ کے طور پر آپکی ذہنی قوت بڑھ گئی۔ مختلف موضوعات پر ماہروں کی تخلیقات پڑھنے سے آپ کے علم میں بہت اضافہ ہوا۔ جس کی وجہ سے آپ کشمیری زبان کا گرامر لکھنے کے اہل بن گئے۔ بعد میں مہاراجہ پرتاب سنگھ نے تخت نشین ہو کر کچھ دنوں کے بعد ہی اس شعبے کو بند کر دیا۔ اس سے دوسرے علماء کی طرح آپکو بہت وقت تک بے کار رہنا پڑا۔ کچھ مہینوں کے بعد آپکو مہاراجہ کے دربار میں نوکری ملی۔ ایشور کول کو ریاضی میں بہت مہارت تھی۔ علم نجوم میں آپ کو سب پر فوقیت تھی اس بارے میں آپکا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ لاہور کا باشندہ ایشور پرساد ایم۔ اے ایشور کول کا قریبی رشتہ دار تھا۔ ایک بار وہ لاہور سے پنجاب کے حاکم کو ملنے کیلئے کشمیر آگیا۔ اپنے جانے پہچانے رشتہ دار کے پاس وہ کچھ دنوں تک ٹھہرا۔ ایک دن وہ دونوں ایک کمرے میں بیٹھ کر ایک موضوع پر بہت دیر تک بحث کرتے رہے۔ اس وقت ایشور کول نے ایشور پرساد کو حساب کا ایک معمولی سوال حل کرنے کیلئے دے دیا۔ ایشور پرساد دو تین گھنٹے تک اس سوال کو حل نہ کر سکا۔ شرم کے مارے وہ اپنا سر نیچا کر کے بیٹھا۔ مگر ایشور کول نے تھوڑے ہی وقت میں اس سوال کو حل کر دیا۔ اسی طرح آپ نے بہت سے سوالات حل کیے۔ ایشور پرساد بھی حساب میں آپکا کمال جانکر ہکا بکا رہ گیا۔ اور اس نے آپکو لاہور آنے کی دعوت دی۔ تا کہ آپ لاہور یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ ناساعد حالات کی وجہ سے آپ لاہور

نہ جا سکے۔

کچھ مدت کے بعد آپ نے کشمیری شبد امرت نام کی کتاب لکھی۔ آپکی مادری زبان کشمیری تھی۔ اس لئے اپنے مادری زبان کا گریمر سب سے پہلے ۱۹۳۲ء سموت میں سنسکرت زبان میں لکھا جسکا تذکرہ آپ نے کتاب لکھنے سے پہلے چند سنسکرت نظموں میں کیا ہے۔ آپنے یہ تخلیق اسوقت کے سیشن جج شری نیلامبر مکرجی کو بھینٹ کی جو سنسکرت زبان کے بڑے عالم تھے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے تخت نشین ہونے کے بعد بابو نیلامبر اپنا اعلیٰ عہدہ چھوڑ کر واپس کلکتہ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے یہ کتاب رائیل ایشیاٹک سوسائٹی کو چھپانے کیلئے دی جو ۱۸۹۸ء میں سر جارج گریرسن نے مرتب کر کے شائع کی۔ اس کے علاوہ آپنے کشمیری سنسکرت کوش (ڈکشنری) مرتب کیا تھا جو نامکمل ہونے کے باعث چھپ نہ سکا۔ اس کوش کے اندراج میں کشمیری الفاظ کے ساتھ سنسکرت کا مترادف دیا گیا تھا۔ اس کا خاکہ سر جارج گریرسن کی کشمیری ڈکشنری کے دیباچے میں درج ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے اندراج کئے گئے الفاظ کی تشریح سنسکرت میں دی تھی جو مندرجہ ذیل مثال سے واضح ہو سکتا ہے۔ یہ کوش آپنے دیوناگری رسم الخط میں لکھا تھا۔

①

پ

آنب ڈانب

④ بے پرہیزی

③ اپتھیہ سیونم

دو گتو او ستھایام یدپتھیہ سیونم ینین ہتر یہ

رُگا ڈھکیم جاتے تا درشم اپتھیہ سیونم

شلوک کا مطلب :- بیماری کی حالت میں بے احتیاط کھانا کے باعث آدمی زیادہ [illegible] ہاتا ہے

اسے بد پریوزی کہتے ہیں۔ یہ سنسکرت کے انشٹب چھند میں لکھا گیا ہے۔ 'پ' کا مطلب مذکر سے ہے۔ مہرشی پانینی نے جس طرح سب سے پہلے سنسکرت زبان کا گریمر سوتروں کی بنیاد پر لکھا ہے۔ اسی بنیاد پر ایشور کول نے بھی لکھا ہے۔ کشمیری شبد امرت میں سے چند سوتروں کی تشریح واضح کی جاتی ہے:-

"ہا دُورِ وِشادیوز اپشر تیہ بیسیئہ چو کارؔ"

"اس سوتر کے مطابق جب کسی کو دور سے بلانا ہو یا غم ظاہر کرنا ہو تو اس وقت سبجکٹ (فاعل) میں (کو) کی جگہ 'رو' بن جاتا ہے مثلاً۔ نارانو (اے ناران) ناکاکو (ارے کاکا)۔ اس میں Nominatuie Singular نارانا اور کاکا ہے اور Vocutive میں یہ 'رو' بن جاتا ہے۔"

"ہت ساہے پُورو ، وا وز دہمیشو"

"بزرگوں یا بوڑھوں کو بلانے کے وقت 'ہت سا' یا 'ہت باہے' لگانا چاہیئے مثلاً۔ ہت سا، سہزبا۔ 'ہت باہے رام با'۔" ارے سہز' ارے رام

"آپزتیہ یہ گنیشہ نیچیو' ہتا شبد پُوروِیچ"

"ان سوتروں کے مطابق چھوٹے کو یا نیچ کو بلانے کے وقت 'ہتا' لفظ پہلے (Prefix) استعمال کرنا چاہئے۔ مثلاً:- ہتا مانا۔ ہتا مانہ کولا۔ ہتا گُلیا۔"

"کینژ شبدو نتیہ بہُتو سے"

"یعنی 'کینژ' لفظ ہمیشہ جمع میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے کینژن (وہ چند) کینژو (ان چند) وغیرہ:

"کانژھاہ کینژھا شبدا و یکتو سے"

اس سوتر کے مطابق کانژھا (کوئی ایک) کینژھا (کچھ) لفظ واحد میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً کانژھاہ اور کینژھا۔"

"یوت تیوت یوٹ شبدانام اپتوم اپرتھنیک وچنے"

"اس کے مطابق یوت (اتما) تیوت (اتما) ان الفاظ میں (یو) گلا (ای) بن جاتا ہے Nominative Singular واحد فاعل کے بغیر مثلاً یتی اور تیتو۔"

"اُتر پد سھنسیہ پولو شبد سیہ لو وہ"

"اس شوتر سے مُرکب Compound میں 'پ' 'و' میں تبدیل ہوتا ہے۔ مثلاً گنگہ وونی (گنگا کا پانی) ویتھہ وونی، شیشہ وونی، ڈُگہ وونی، مار وونی، کیتری وونی، رود وونی، ناگہ وونی، دسہری زونی۔ جب یہ الفاظ مرکب میں نہ ہوں تو اُس وقت 'پ' 'و' میں تبدیل نہیں ہوتا ہے۔ جیسے ویتھہ ہند پانہ سیتھن۔ اس جُملے میں 'پانہ' (پانی) کا 'پ' 'و' میں تبدیل نہیں ہوتا ہے۔"

"پولو و پد ستھے نیہ سیہ انسوارہ"

"اس سے مرکب میں 'پانی' لفظ کو انسوار (Nasalisation) بنتا ہے۔ جیسے پاں نوٹ (پانی کا مٹکا) مرکب کے بغیر اس کا روپ اس طرح بن جاتا ہے مثلاً پانیک تجھ۔ پانی کا ایک کلو

"دانہ شبد سیتھا پیہ"

مُرکب میں جب 'دانہ' لفظ پہلے ہو تو اُس وقت نیہ کو انسوار ہوتا ہے مثلاً داں کھاہ (ایک خرد از دھان) داں پھوت (دھان کی ٹوکری) 'اپہ' لفظ سے مُرکد دوسرے مرکب میں بھی یہ قاعدہ حاوی ہوتا ہے مثلاً واں کھار

"انا درا بتیار تھے ادھم شبد یبھیہ کُنٹھ"

اگر بچے کو شرارت یا تحقیر کرنا مطلوب ہو تو اس وقت نیچ الفاظ کے پیچھے 'کُنٹھ' کا استعمال ہوتا ہے جیسے زور کنٹھ، بوگہ کنٹھ، دلیپ کنٹھ، کوہ کنٹھ ایمانے تھ نیہ وغیرہ الفاظ کے آگے تشبیہ دینے کے وقت 'تھ' Suffix لگتا ہے جیسے تیتھ

(ولیما) یُتھ (الیسا)"

"پنچمیتاد دِگرتھے کینہ"

Ablative (ابلیٹو) کے آگے جب طرف کا مطلب ہو تو کینہ Suffix لگتا ہے۔ مثلاً تتہ کنِہ (اُدھر سے) یتہ کنِہ (اِدھر سے) کتہ کنِہ (کدھر سے) ہتہ کنِہ (وہاں سے) وغیرہ

"سشیا دِپتام پھلو"

تھوڑے سے اناج کے متعلق جس وقت کچھ بتانا ہو تو پھلہ Suffix لگتا ہے مثلاً تومُلہ پھول (چاول کا دانہ) مٹر پھول (مٹر کا دانہ) مونگہ پھول۔ آر لفظ کا مطلب وغیرہ ہے جیسے ترِیہ پھول، بٹھی پھول، میٹر پھول وغیرہ

"دار شبد سیہ سنانستھانے وسیہ یہ"

اس سوتر کے مطابق نہانے کی جگہ 'دار' لفظ کے 'و' کو 'ی' بنجاتا ہے مثلاً سنسکرت کے 'دارِبل' سے 'یارِبل'، اسی طرح سنسکرت کا ناو (کشتی) لفظ 'ی' میں تبدیل ہوتا ہے۔ ناؤ سے نایہ وغیرہ

"کاو ناگ وونٹ بھیشچیہ"

یعنی کاو (کوا) ناگ (چشمہ) وونٹ (اُونٹ) ان الفاظ کے پیچھے 'ا، ر' Suffix لگتا ہے جیسے کاوِنی، ناگِنی، وونٹِنی وغیرہ

"اننیہ تو پیہ لپشہ جاتے"

حیوانوں میں بھی اس Prefix کا استعمال ہوتا ہے مثلاً گُرِنی وغیرہ

"داندرادِ بھیو رِن"

اس سے داندر، کاندر وغیرہ الفاظ کے آگے مونث میں 'رِنی' Suffix لگتا ہے۔ جیسے داندرینز، کاندرینز وغیرہ۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ ایشور کول کا مطالعہ کتنا گہرا تھا۔ کس قدر انہوں نے اس تحقیق

تخلیق کے ذریعہ گاگر میں ساگر بھرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تعریف میں سر جارج گریرسن اپنے خیالات کا اظہار اس طرح "کشمیری شبدامرتم" کے پیش لفظ میں کرتے ہیں:۔

ICVARA-KAULA'S WORK IS A GRAMMAR OF THE KASHMIRI LANGUAGE WRITTEN IN SANSKRIT, ON THE MODEL OF AN ORDINARY VYAKARNA. IT IS AN EXCELLENT WORK, AND MIGHT HAVE BEEN COMPOSED BY HEMACHANDRA HIMSELF. KASHMIRI IS A LANGUAGE WHICH IS VERY LITTLE KNOWN, BUT WHICH IS OF GREAT IMPORTANCE FOR THE PURPOSE OF COMPARATIVE PHILOLOGY. Existing GRAMMARS OF IT HAVE BEEN MADE BY FOREIGNERS, AND ARE IMPERFECT. THEY ALL SUFFER FROM AT LEAST ONE GRAVE FAULT, VIZ, THAT THEY ARE BASED ON THE REPRESENTATION OF THE LANGUAGE WHICH IS QUITE, UNABLE TO EXPRESS THE MANY BROKEN VOWEL SOUNDS IN THE LANGUAGE. ICVARA-KOULA'S ADOPTED THE DEVANĀGRI CHARACTER, INGENIOUSLY MODIFIED TO SUIT HIS PURPOSE.

اس کے علاوہ انہوں نے کشمیری ڈکشن بجا شود سے نام کی ڈکشنری دس زبانوں میں لکھی ہے۔ دیوناگری رسم الخط میں لکھی گئی اس ڈکشنری کے دو جلد ریسرچ ڈپارٹمنٹ میں،

اس وقت محفوظ ہیں۔ یہ ڈکشنری انہوں نے سنسکرت نظموں میں لکھی ہے۔ جس کا نمونہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

"اخروٹ، اکشوٹ والنٹ چہ جوز ہنگاک تتہ پرم
چار مغز اپیچہ چار مغز، ڈونُو تہ گاسترگا کرما دمی"

اس شلوک میں اخروٹ کے نام دس زبانوں میں ہیں۔ ہندوستانی میں اخروٹ، اکشوٹ سنسکرت زبان میں۔ والنٹ انگریزی میں، جوز عربی میں، ہنگاک ترکی میں، چار مغز فارسی اور پشتو میں، ڈوُن کشمیری میں، ترگا لامی اور بلتی زبانوں میں کہتے ہیں۔

فارسی اور عربی میں مہارت ہونے کی وجہ سے انہوں نے قانون طب اور ابو نصر فراہی کی کتاب نصاب الصبیان کا سنسکرت میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے "زُربھ کشٹہ تارو ریاست" سنسکرت نظموں میں لکھی ہے جس میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد کے قحط کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔

ایشور کول نے سنہ ۱۸۹۳ء میں وفات پائی۔

کتابیات

1. A DICTIONARY OF THE KASHMIRI LANGUAGES, BY SIR GEORGE GRIERSON.
2. وشو سنسکرت شتابدی گرنتھ جموں وکشمیر راجیہ بھاگ
3. KASHMIRI SHABDAMRATAM BY ISHVAR KAUL, EDITED BY GEORGE GRIERSON.
4. کشمیری دش بھاشو دے از ایشور کول۔

مشعل سلطانپوری

مہجور

مہجور کا زمانہ کشمیری زبان و ادب کی شاہراہ کا ایک اہم موڑ ہے۔ برسوں کیا صدیوں کی مسلسل غلامی نے کشمیری قوم کے ذہنی قویٰ اسقدر مضمحل کر دئے تھے اور انہیں اس حد تک احساس کمتری کا شکار کر دیا تھا کہ وہ اپنی ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے، معاشرت، تہذیب و تمدن، افکار و عادات غرض کشمیری زندگی کا ہر شعبہ ان کو گھٹیا دکھائی دے رہا تھا۔

بیسویں صدی اپنی تمام ہما ہمیوں اور حشر سامانیوں کے باوجود دنیا کی مختلف قوموں کیلئے ایک نئے زمانے کی بشارت لیکر آئی۔ مختلف ملکوں میں سیاسی بیداری کے آثار دکھائی دینے لگے اور اقوام عالم میں سے اکثر و بیشتر ایک نئی صبح کے آثار پا کر آنکھیں ملنے لگے۔ نئے ولولے، تازہ امنگیں اور مچلتے ارمان سینوں میں ہلچل ڈالنے لگے مہجور کا زمانہ، یہی زمانہ تھا۔

مہجور کشمیر کا پہلا شاعر نہیں۔ اس سے پہلے کشمیری زبان نے مختلف ادوار میں بہت سے شعراء پیدا کئے ہیں لیکن اپنی خصوصیات کی بنا پر وہ سب مہجور سے مختلف رہے ہیں۔ ایک زمانے میں کشمیری زبان و ادب کے چمنستان کی بہار دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کشمیری شاعری نے جس موضوع کیطرف آنکھ بھر دیکھا اسے گلستان بنا کے چھوڑا۔ تصوف، رزم، بزم، حمد و نعت، عشق و محبت کونسا میدان ہے جہاں اس کی گلکاریاں نہیں ملتیں۔ لیکن اب زمانے کا تقاضا کچھ اور تھا نئے موضوعات کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت تھی "اور بھی غم تھے زمانے میں محبت کے سوا" اب تک صرف عوام کے دلوں میں کشمیری شاعری کی جگہ تھی اب اسے خواص کی محفلوں میں بھی لانا تھا۔ اب تک متصوفانہ شاعری اور رزمیہ مثنویاں، احساس کمتری سے چور دلوں کی تسکین کا سامان تھی اب اس نے

جنون انگیزی اور ولولہ آفرینی کا کام لینا تھا۔ مہجور نے سب سے پہلے کھلے بندوں اسے شاعرے میں لایا، حکام کے کانوں تک پہنچایا، اس سے انقلاب آفرینی کا کام لیا اور تحریک آزادی کا نقیب بنادیا

پیرزادہ غلام احمد مہجور کا تعلق معنوی طور پر ہی نہیں صوری طور پر بھی کشمیر کے تینوں اضلاع سے رہا ہے۔ ابتداء میں انکے آباواجداد کمراز سے تعلق رکھتے تھے۔ انکے ابوالآباء میر احمد صاحب سوپور سے سرینگر گئے تھے اور حضرت شیخ یعقوب صرفی کے خاندان میں شادی کی تھی۔ کئی پشتوں کے بعد اس سلسلے کا ایک شخص غلام محی الدین نوبوگ بڈگام میں سکونت پذیر ہوا۔ جس کے تیسرے فرزند پیر عبداللہ شاہ صاحب کی شادی متریگام (پلوامہ) کی ایک خاتون سعیدہ بیگم سے ہوئی جنکے نانا حضور اللہ کا خاندان علم و فضل میں خاص امتیاز رکھتا تھا۔ اسی خاندان کے ایک شخص محمد اشرف دیبری نے مشہور فارسی شاعر نظامی گنجوی کے خمسہ کا جواب فارسی میں لکھا ہے۔

غلام احمد اسی سعیدہ بیگم کے بطن سے بروز پیروار ۱۲ شوال ۱۳۰۵ھ پیدا ہوئے۔ ان کے والد صاحب تو رواج زمانہ کے مطابق پڑھے لکھے تھے ہی، والدہ بھی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوش نویسی میں ممتاز تھی۔ غلام احمد ابھی دو برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ والدہ داغ مفارقت دے گئیں۔ ذرا بڑے ہونے پر رواج زمانہ کے مطابق ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب سے گھر پر حاصل کرنے لگے۔ تھوڑے عرصہ میں قرآن شریف کا تہائی حصہ حفظ کرلیا۔ اس کے بعد ترال کے ایک عالم آخون عبدالعلی گنائی (عاشق ترالی) کے مکتب میں تعلیم پانے لگے اور فارسی کی کئی کتابیں پڑھ لیں۔ آخون صاحب کشمیری زبان کے ایک اچھے شاعر ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شعر کی طرف مہجور کی طبیعت مائل کرنے میں اس استاد کا کافی حصہ ہے۔ تین برس اس مکتب میں تعلیم پانے کے بعد وہ فارسی زبان میں فارغ التحصیل سمجھے گئے۔ اسکے بعد غلام احمد کو اردو کی تعلیم دلوانے کیلئے سرینگر کے مدرسہ نصرۃ الاسلام میں داخل کیا گیا جہاں وہ اردو کے ساتھ ساتھ مولانا سید محمدؒ سعید اندرابی صاحب سے دینیات اور تفسیر کلام اللہ کا درس پانے لگے۔ کچھ عرصہ بعد یہ سلسلہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر منقطع ہوا۔ انہی دنوں سید غلام محی الدین صاحب پنجاب سے کشمیر آئے جن کا مہجور کے آباواجداد سے

قدیمی تعلق تھا۔ انکے بیٹے سید عبداللہ شاہ صاحب کے مہجور سے دوستانہ مراسم پیدا ہوئے اور انہوں نے مہجور کو پنجاب آنیکی دعوت دی۔ حصول علم کے شوق نے مہجور کو بے تاب کر دیا لیکن باپ کے اکلوتے بیٹے ہونے کیوجہ سے اجازت نہ مل سکی۔ اسلئے بلا اجازت ہی موقع پاکر امرتسر چلے گئے۔ وہاں باقاعدہ طور مروجہ تعلیم پانے میں مشکلات پیدا ہوئے تو پرائیوٹ طور پر ادبیات کا مطالعہ کرنے کیساتھ ساتھ ایک مشہور خوشنویس غلام علی سے اس فن کا اکتساب کرنے لگے۔ اسی دوران مولوی عبداللہ صاحب بسمل سے جو خواجہ حسن کول شہری قلاش پوری کے شاگرد اور اردو فارسی کے مشہور ناظم و ناثر تھے، ملاقات ہوئی اور ان کی کوششوں سے قادیان کے ایک اخبار سے بحیثیت کاتب وابستہ ہوئے۔ یہاں بھی مطالعہ کا خوب موقع ملا۔ انہی دنوں منشی محمد دین فوق نے لاہور سے ایک ماہوار رسالہ کشمیری میگزین جاری کیا۔ غلام احمد یہ پرچہ دیکھتے ہی فوق صاحب سے ملنے لاہور چلے گئے اور وہاں قیام کیا۔

؁۱۹۰۸ء میں غلام احمد صاحب کشمیر واپس آئے۔ اور روزگار کی تلاش میں منہمک ہو گئے انکے والد صاحب انہیں اپنے موروثی پیشہ پیری مریدی کے اختیار کرنے کی ترغیب دے رہے تھے اس سے اچھی خاصی آمدنی بھی متوقع تھی۔ انکے بغیر کوئی دوسرا بیٹا بھی اس پیشے کا سلسلہ قائم رکھنے کیلئے نہ تھا لیکن مہجور کی طبیعت اس طرف مائل نہ ہو سکی۔ انہوں نے اسے ایک استحصال سمجھا اور ذاتی محنت و مشقت سے گزر اوقات کرنے کی ٹھانی۔ اس مسئلے پر بڑی کشمکش ہوئی آخر اس زمانے کے ایک مشہور قلندر شاہ عبدالرحیم صفاپوری کے مشورہ سے انہوں نے اپنا ارادہ قائم رکھا۔

اسی زمانے میں بلتستان کے افسر بندوبست مشہور اردو شاعر چودھری خوشی محمد ناظر لداخ سے سرینگر آئے جنہوں نے لداخ میں شجرہ کش اسامیاں پُر کرنیکا اشتہار دیا۔ مہجور نے بھی درخواست دیدی اور شجرہ کش کی حیثیت سے تقرری کا حکم ملا۔ تنخواہ معمولی تھی لیکن مہجور راضی خوشی لداخ کی طرف چل پڑے وہاں بندوبست کا کام اچھی طرح سے سیکھا اور نوکری کی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے دن گذارنے

لگے۔ دو برس بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ انکے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ غلام احمد رخصت پر کشمیر چلے آئے۔ اب گھر کی تمام ذمہ داریوں کا احساس ہوا اسلئے ڈیوٹی پر نہ جا سکے۔ رخصت بڑھاتے رہے لیکن آخر محکمہ نے نوکری سے الگ کر دیا۔ آبائی پیشہ سے پہلے ہی قطع تعلق کر لیا تھا۔ زمین جائیداد ایک جدیوں کے قبضے میں آ گئی تھی۔ اسلئے مالی مشکلات کا شکار رہے۔ کافی جدوجہد کے بعد پھر کشمیر کے محکمۂ بندوبست میں ملازم ہو گئے۔ اور سری نگر کے محلہ ٹنکی پورہ میں ایک چھوٹا سا مکان بنا کر رہنے لگے۔ عمر بھر پٹواری کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور آخر اسی عہدہ سے پنشن پائی۔ انکے فرزند محمد امین صاحب اب تک اسی مکان میں سکونت پذیر ہیں۔

سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں مہجور کو کشمیر کے مختلف مقامات پر رہنے کا اتفاق ہوا عہدہ پٹوار کی نوعیت ہی کچھ اس قسم کی تھی کہ انہیں کشمیر کے عامۃ الناس سے روبرو واسطہ پڑا۔ کاشتکاروں، کسانوں اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کی زندگی اور طرز بود و ماند کے مشاہدہ کا خوب موقع ملا۔ بارہمولہ، ہندوارہ، سوناواری (کھراز) اسلام آباد، بیروہ، بڈگام غرضیکہ مختلف جگہوں کے قدرتی حسن، لوگوں کے رہن سہن، کامرانیوں اور ناکامیوں، انکی جفاکشی محنت و مشقت اور دوسرے معاملات پر غور کرنیکا وقت پایا۔ اس پیشے سے انہیں طبعی مناسبت اور انکے شاعرانہ مزاج کو ہم آہنگی تھی یا نہیں لیکن آزادی، فراغت اور عام لوگوں سے رابطہ رکھنے کے مواقع حاصل ہونے کی بنا پر وہ نوکری کے سلسلے میں کسی ترقی کیلئے جدوجہد کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوئے۔

۱۹۴۴ء کے لگ بھگ مہجور پٹواری کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ آٹھ روپے ماہانہ مشاہرہ سے شروع کر کے آخر پر بیس روپے کی معمولی تنخواہ پاتے تھے۔ پنشن پانے کے بعد اپنے آبائی گاؤں متر گام تشریف لے گئے اور شہر کے ہنگاموں سے دور دن گزارنے لگے۔ کبھی کبھار سری نگر آ جاتے تھے۔ سات آٹھ برس قریب قریب گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے کے بعد ۱۹۵۲ء کی آٹھ اپریل کو گھوڑے پر سوار ہو کر پنشن لینے پلوامہ گئے تھے، شام کو لوٹنے کے وقت طبیعت ناساز ہو گئی اور گھوڑے پر سوار نہ ہو سکے۔ چند دوستوں نے سہارا دیکر اپنے گاؤں پہنچا دیا اور ۹ اپریل کی

صبح کو اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کی۔ گاؤں والوں نے انکو اپنے مقامی قبرستان میں سپرد خاک کیا۔ یہ خبر دیر سے سرینگر پہنچی۔ اسوقت کے نائب وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد متری گام گئے اور لوگوں کو بصد مشکل اسباب پر آمادہ کر دیا کہ انکی نعش کو یہاں سے نکال کر سری نگر لیا جائے جہاں سرکاری اعزاز سے سر نو جنازہ پڑھ کر حبہ خاتون کے مزار (اتھواجن) سرینگر میں دفنایا جائے اور اسکا نام مزار شعراء رکھا جائے۔ ۱۱ اپریل صبح کو جنازہ خانقاہ معلی کے صحن میں تھا۔ ہزاروں لوگوں نے اپنے محبوب شاعر کا آخری دیدار کیا اور ۲ بجے کے قریب نماز جنازہ ادا کرنیکے بعد جنازہ کو جلوس کی صورت میں امیرا کدل پہنچایا گیا۔ ملیشیا، پولیس کے دستے، قومی کلچرل کانگریس کے کارکن، کابینہ کے وزراء، آئین ساز اسمبلی کے ممبران اور حکام وقت جنازہ کے ساتھ تھے۔ امیرا کدل سے جنازہ پھولوں سے آراستہ ایک گاڑی میں اتھواجن پہنچایا گیا۔ جہاں بخشی غلام محمد صاحب نے اپنے ہاتھوں میت کو سپرد مرقد کر دیا اور اکیس توپوں کی سلامی دے دی گئی۔ اس طرح کشمیر کا یہ مشہور و مقبول شاعر ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔

غلام احمد کو حسن اتفاق سے بچپن سے علم و فضل کا ماحول ملا ہی تھا، شاعرانہ ماحول بھی میسر آیا ترال کے عبد العلی آخون (عاشق ترالی) کی صحبت، اور اسکے بعد امرتسر میں بسمل امرتسری، مولانا شبلی نعمانی، منشی محمد الدین فوق اور دوسرے شعراء کے ہم نشینی نے انکی شاعرانہ طبیعت کو انگخیت کیا۔ مہجور کی شعر گوئی کے آغاز سے متعلق عبد الاحد آزاد نے واقعہ بیان کیا ہے کہ انہیں ایک دوست کو خط لکھنے کی ضرورت پڑی جو علم و فضل میں اپنا مقام رکھتا تھا، مہجور نے چاہا کہ منظوم خط لکھا جائے چنانچہ فارسی میں پچیس اشعار کا خط لکھدیا جس کا آخری شعر یہ تھا۔ ؎

شنو نام من جمع کن یاد دار ◦ یک اندر دو چار و چہل با چہار "احمد"

اس طرح تخلص نہ ہونے کی وجہ سے معمہ کی صورت میں اپنا نام ظاہر کر دیا تھا۔ اس خط سے مہجور کو شعر گوئی کی اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا اور سات برس تک فارسی میں شعر کہتے رہے۔ نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یا مرگ گل دہ بلبل دیوانہ را　　لذت سوزشش دل پروانہ را
گرچہ مہجورم ز مہجوری چہ غم　　بلبلی از بوستان شاہدم

"نالۂ مہجور"

گر گلے پژمردہ گردد از تموز آفتاب　　باغباں اورا کند سیراب از خون جگر
گرد آلودہ شود گر چہرۂ گل ناگہاں　　مے کند سرشعرے از آب دیدہ زودتر

"گل ویرانہ"

ان اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مہجور کو فارسی زبان میں شعر کہنے پر کس درجہ قدرت تھی تخلص مہجور بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ فارسی زبان نے انکا دل موہ لیا تھا اور وہ اسی زبان میں شعر کہنا چاہتے تھے۔ ہئیت کے اعتبار سے یہ اشعار مثنوی اور قصیدہ کے اصناف میں کہے گئے ہیں اور معنی کی رو سے نظموں کے ذیل میں آتے ہیں۔ عبدالاحد آزاد کے بقول مہجور نے تخلص کسی کی دیکھا دیکھی سے نہیں اپنایا۔ اگرچہ ان سے پہلے اس تخلص کے دو اردو شاعر شیو پرشاد کاک مہجور اور پیارے لال اوکھلو مہجور ہو گزرے تھے اور ملتان میں بھی تاج الدین مہجور ایک شاعر موجود تھا لیکن یہ بات مہجور کے علم میں نہ تھی۔ امرتسر میں مولانا شبلی نعمانی سے ملاقات ہونے پر جب انہوں نے یہ تخلص اختیار کرنے کی وجہ پوچھی تو عرض کی کہ اپنے وطن سے دور ہوں۔ جب انہوں نے پوچھا کہ وطن لوٹ کر کیا اسے بدل دو گے۔ جواب دیا نہیں وہاں آپ سے دور ہوں گا۔

سفر پنجاب جہاں انکے حصول علم میں مددگار اور نتیجہ خیز ثابت ہوا وہاں ایک اور تبدیلی کا باعث بھی بنا وہ یہ کہ اب انکی طبیعت اردو میں شعر کہنے پر مائل ہوئی۔ اسکی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اب فارسی کا مذاق برصغیر میں کم ہوتا جا رہا تھا اور اردو کا طوطی بول رہا تھا۔ دوسری یہ کہ پنجاب میں اردو مشاعرے سننے کا اتفاق ہوا۔ آوت لدھیانوی کی سرپرستی میں انجمن بزم ادب کے ایک مشاعرے میں آپ کو بھی اس مصرع کی طرح ؎ طائر دل کے پھنسانے کو یہ دام اچھا ہے طبع آزمائی کرنیکی دعوت دی گئی۔ مہجور نے اس مشاعرہ میں نو اشعار کی ایک غزل سنائی جسکا ایک

شعر یہ تھا۔ اُجڑے غاروں میں رہا کرتے ہیں رہزن چھپ کے
دل مضطر ہی میں دلبر کا قیام اچھا ہے

یہ ۱۹۱۴ء کا واقعہ ہے جب مہجورؔ لداخ میں ملازمت کے دوران ایک بار موسم سرما میں پھر پنجاب گئے تھے۔ اس کے بعد فارسی میں کبھی کبھار اور اردو میں اکثر شعر کہتے رہے۔ مہجورؔ کا یہ سارا اردو اور فارسی کلام اب تک مدون نہ ہو سکا۔ ہاں اسکا کچھ حصہ اس زمانے میں اخبار و رسائل میں شائع ہو چکا ہے۔ نمونے کیلئے ایک نظم کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

ہر روز رنج و سوز سے رہتا ہے دل فگار   ہر شب میں شمع کی طرح روتا ہوں زار زار
ہر آن میری جان ہے مصائب کے زیر بار   ہر شام مثل شام میں ہوں تیرہ روزگار
ہر صبح مثل صبح گریباں دریدہ ہوں

اردو زبان میں شعر کہنے کا یہ سلسلہ کئی برس جاری رہا۔ بقول عبدالاحد آزادؔ ۱۹۲۴ء تک اور بقول سری نواس لاہوتی ۱۹۲۰ء تک۔ اس کے بعد وہ کشمیری میں شعر کہنے پر مائل ہوئے اس تبدیلی کی وجہ بعض لوگوں کے خیال میں یہ ہے کہ پٹواری کی حیثیت سے دیہاتی عوام کے ساتھ واسطہ پڑتا تھا جو انکی شاعری سمجھ نہ سکتے تھے اس لئے شاعر کی حیثیت سے انکے دلوں میں مہجورؔ کی کوئی قدر نہ تھی لیکن مہجورؔ خود اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ:-

”جب قومی اور وطنی ذہنیت میرے اندر پختہ ہو گئی تو میں نے اپنی مادری زبان کو بے بسی کی حالت میں پایا، میرے ضمیر نے مجھ پر ملامت کی کہ میں اپنی مادری زبان کو ترک کر کے دوسری زبان کی خدمت کر رہا ہوں۔ عہد ماضی کے تاریخی واقعات نے میری آنکھیں کھول دیں کہ آج کی پسماندہ کشمیری زبان نے صدیوں پہلے بڑے بڑے اہل کمال پیدا کئے تھے مگر آج نہ صرف اس زبان سے غیروں کو بلکہ خود اہل کشمیر کو نفرت ہے اور اسی کے بعد سے میں نے عہد کیا کہ اب میں اپنی مادری زبان کی خدمت کرونگا اور پھر اسے دوبارہ زندہ جاوید بنا کر چھوڑوں گا

> میں نے عہد رفتہ کے عوامی شاعر رسول میر اور حبہ خاتون کی طرز پر غزلیں کہنی شروع کیں"[1]

اس کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ غیر زبان میں شاعر اس خوبی سے اپنا مافی الضمیر ادا نہیں کر سکتا جتنا اپنی مادری زبان میں۔ اس بات کا احساس کئی لوگوں کو عمر گنوانے کے بعد ہوتا ہے۔ اچھا ہوا کہ مہجور کو یہ احساس بہت پہلے ہوا۔

۱۹۲۶ء تک مہجور نے صرف دو تین غزلیں کشمیری زبان میں کہی تھیں اس کے بعد وہ باقاعدہ کشمیری زبان میں شعر کہنے لگے۔ ابتدائی غزلوں میں سے ایک غزل اس مطلع کی ہے۔

نیرہا سنیاس لاگتھ یارٕ سُند پے ژھاڈہا   پھیرہا شہرن تہ گامن بال تس پتہ لارہا

سکھی جوگ رما کر محبوب کا اتا پتا معلوم کرنے چلوں، گاؤں گاؤں شہر شہر گھوموں اور اسکے پیچھے پیچھے پھروں"

مہجور کی کشمیری شاعری کا ذکر چھیڑنے سے پہلے کشمیری شاعری کی روایات کی طرف اجمالی اشارہ کرنا مناسب ہوگا۔ اصناف کے اعتبار سے کشمیری شاعری میں اب تک، واکھ، اشلوک، گیت (وژن جو ہندوستانی گیتوں سے مختلف ہے) اور مثنوی متداول رہتے آئے تھے اور موضوعات کے اعتبار سے یہ تصوف، نعت، عشق و محبت، رزم نگاری وغیرہ کیلئے وقف تھی عشقیہ شاعری کیلئے مثنوی کے علاوہ غزل کم اور وژن (گیت) زیادہ موزون سمجھے جاتے تھے۔ غزل لکھنے کا آغاز محمود گامی سے ہوا۔ اظہار عشق عموماً عورت کی طرف سے ہوتا تھا جو ہندوستانی عشقیہ شاعری کی عام خصوصیت رہی ہے۔ مرد شاعر کو بھی عورت کی زبان سے اظہار عشق کرنا پڑتا تھا۔ یہ بات اگرچہ اسے غیر فطری بنا دیتی تھی لیکن دلی واردات کا بیان شدت اور تاثیر میں اضافہ کر دیتا تھا۔

مہجور نے ۱۹۲۶ء میں ایک روز صبح کے وقت نالہ دودھ گنگا کے کنارے جنگل سے لکڑیاں

---

[1] ماہنامہ تعمیر، مہجور نمبر

لانے والی چند دیہاتی عورتوں کی زبانی حبہ خاتون، گیت "پوشے متہ جانانو" (میرے پھولوں کے رسیا محبوبا) سنا۔ انکی سریلی آواز اور دلکش طرز ادا سے گیت کے بول زیادہ ہی پر اثر لگے تو اسی بحر اور اسی تتبع میں ایک گیت لکھا[1]۔ یہیں سے مہجور کی کشمیری شاعری کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ انہوں نے کشمیری شاعری کے اصناف میں سے گیت (وژن) اور غزل ہی کو اختیار کیا، نظموں کیلئے بھی اور غزلوں کیلئے بھی ہر قسم کے موضوع کو اسی سانچے میں ڈھالا۔ تصوف، عشق و محبت نالہ و فریاد، منظر کشی، حب الوطن سیاست، مساوات، پند و نصائح، لذت و مناقب تمام موضوعات کو۔ عبدالاحد آزاد انکی غزلوں گیتوں اور نظموں میں فرق نہ کر سکے۔ کہیں کہیں نظم کو غزل اور غزل کو نظم قرار دے گئے ہیں۔ مہجور نے جو گیت حبہ خاتون کے گیت سے متاثر ہو کر لکھا اس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ حبہ خاتون کیلئے نسوانی جذبات کا بیان کوئی غیر معمولی بات نہ تھی کیونکہ وہ خود مصائب کی ماری عورت تھی۔ مہجور نے مرد ہو کر جس طرح نسوانی جذبات کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے اور جسطرح اسے شدت تاثیر سے بھر دیا ہے اسے پڑھکر قاری عش عش کرنے لگتا ہے۔

۱۹۲۷ء میں پروفیسر دیویندر ستیارتھی ڈائریکٹر آل انڈیا فوک سانگس کشمیر تشریف لائے۔ ویری ناگ کے ایک جنگل میں گھومتے یہ گیت سنا اور رومن خط میں لکھ لیا۔ سری نگر پہنچکر اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور واپس ہندوستان لوٹ کر ایک انگریزی پرچہ "ماڈرن ریویو" میں شائع کرایا۔ ۱۹۳۴ء میں وہ پھر کشمیر آئے اور پنڈت آنند کول بامزئی کی وساطت سے مہجور سے ملاقات کی اور انکا کچھ کلام ترجمہ کیلئے چن لیا۔ بلراج ساہنی کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے ۱۹۳۴ء میں مہجور سے ملاقات کی اور سب سے پہلے انہوں نے ہی ان کے کلام کے بارے میں شانتی نکیتن کے سہ ماہی رسالے میں مضامین لکھے۔ پروفیسر دیویندر ستیارتھی نے مہجور کا جو کلام ترجمے کیلئے چن لیا تھا۔ اس میں ترانۂ وطن اور وبتھ (وتستا) نظمیں بھی شامل تھیں۔ یہ دونوں نظمیں ہیئت کے اعتبار سے گیت کہلائے جا سکتے ہیں۔ وتستا نظم کا ایک بند یہ ہے ؎

پکان آہستہ گیہ ڈلہ ڈلہ
پری زن سرو کلوے تلے

---

[1] کشمیری زبان اور شاعری - حصہ دوم - عبدالاحد آزاد

گژھے نٔژ پاٹھۍ گژھہ روپوش پہ لاگے پوشن دامانس

(کبھی دھیرے دھیرے چلتی ہے اور کبھی تیز، سرو کے درختوں میں سے پری کی طرح، کبھی نمودار ہوتی ہے اور کبھی چھپ جاتی ہے، آ میں تیرے دامن کو پھولوں سے بھر دوں)

۱۹۳۴ء میں سرینگر کی نمائش کمیٹی کے اہتمام سے ایک ملا جلا مشاعرہ ہوا جس میں مہجور کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی لیکن وہ صرف اسی شرط پر شریک ہوئے کہ انہیں کشمیری نظم پڑھنے کی اجازت دی جائیگی۔ یہ مشاعرہ چودھری خوشی محمد ناظر کی زیر صدارت ہوا اور مہجور نے محمود شہری سے "باغ نشاطک گلو" ترجمہ "اے نشاط باغ کے پھول" عنوان سے اپنی نظم پڑھوائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کشمیری نظم نے مشاعرہ میں جگہ پائی۔ دوسرے روز یہ نظم بچے بچے کی زبان پر تھی۔ مقامی اخبارات نے اسکی مقبولیت کی داد دی۔ اسے کشمیری اور غیر کشمیری فنکاروں نے سینما ہالوں میں گایا اور ۱۹۳۶ء میں مہجور ابتدا میں اپنے پیشرو کشمیری شعراء و شاعرات جیسے حبہ خاتون، محمود گامی، رسول میر، ارنہ مال وغیرہ کے تتبع میں کشمیری زبان میں شعر کہنے لگے جس کا نتیجہ یہ رہا کہ برجستگی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں انکا کلام آورد کا شکار ہو گیا جیسے:۔ ع

تیغ باز ئس، رزم ساز ئس، ترکتاز ئس کو رحم چھا

(تیغ باز، رزم ساز اور ترکتاز کو رحم کہاں) والی غزل۔ وہ عمر بھر غزل اور گیت دونوں اصناف کو ساتھ ساتھ استعمال میں لاتے رہے اس لئے ہیئت سے صرف نظر کر کے موضوعات کے اعتبار سے انکے کلام پر نظر ڈالنا مفید رہیگا۔

مہجور کے بیشتر کلام کا موضوع عشق و محبت ہے۔ اس موضوع کو منصۂ اظہار میں لاتے لاتے وہ کہیں کہیں روایت پرستی سے دھندلا گئے ہیں اور انکی شاعری رسمی ہو کر رہ گئی ہے لیکن مجموعی طور سے جدت اور تازگی کی قبا بخشی ہے۔ اب تک کشمیری شاعری میں عاشق کی بیچارگی بے بسی اور کسمپرسی کے ساتھ ساتھ معشوق کی خون آشامی، تغافل شعاری، کبر و نخوت، جفا جوئی،

عاشق پر ظلم، ستم وغیرہ جیسے تصورات عام تھے۔ معاشرہ میں مخصوص روایات کی بنا پر محبوب محبت کے احساس سے عاری تھا اور عاشق مجبور۔ مہجور نے اسکا اظہار یوں کیا ؎

بیدرد جفاکارو بے ہار ستمگارو   لوٗت پھیرو دل آزارو مو کرٕ زٕ دل آزاری

(اے ظالم، جفاجو، بے رحم محبوب، مڑ کے تو دیکھ، کسی کا دل دکھانا خوب نہیں)

؎ ژٕ یارن ستیٖ ژھوٗرہ ماران بہ تنہا خون دل ہاران
نہ ہیمس گوٗت نیرِتھ ژھیس تماران وان ژھارکھ رٕتے لوٗبرو

(تو دوستوں کے جھرمٹ میں داد عیش دے رہا ہے اور میں خون کے آنسو روتی ہوں
دن کی روشنی میں نکلتے ہوئے شرماتی ہوں اب رات کو ہی تلاش کروں گی میرے بھنورے"

یا

؎ زٕ درہ یارٕ سند چھُم وُہر ماران   بچھ بچھ آب زن تراواں چھس
ٹکہ پایہ بدنس زٕد کرناوان   پوشن مالہ کرناوان چھس

(محبوب کی جدائی رلواتی ہے، آنکھوں سے آنسوؤں کے جلو نکلتے ہیں، لوگوں کے
طعنے بدن کو چھیدتے ہیں اور پھولوں کے ہار پرو کر رکھواتی ہوں)

ان تصورات میں مہجور نے کیا اضافہ کیا؟ ایک یہ کہ دوست کی سنگدلی کے باوجود وہ عشق کا دامن ہاتھ سے جانے دینے پر آمادہ نہیں کیونکہ یہ جوہر حیات ہے۔ دوم یہ کہ اس نے عشق کو معصوم ہونے کیساتھ ساتھ دلیر، بے چارہ ہونے کیساتھ ساتھ خوددار، غمزدہ ہونیکے ساتھ ساتھ حیات آفریں ہونا سکھایا۔ ایسے محرومی اور ناامیدی کی تاریکیوں سے رجائیت کے اجالے میں لایا۔ اسکے اظہار میں اثر انگیزی اور دلکشی پیدا کی۔ اسے مردانگی کی تعلیم دی۔

؎ الہٰ نادان ژھایہ تھاون ناہٕ ژٕ کر ترامن یہ لول
پوشہ کھوتہٕ چھُم جاد آوِل جانہٕ کھوتے ژٕ مو لول

(تُو اسے گلفام، میکو چھپی چھپاؤں دنیا کی نظروں سے بچا کر رکھوں اور کبھی

نہ چھوڑوں، میری محبت پھول سے زیادہ کومل اور جان سے زیادہ پیاری ہے

؎ یم زیر باہم رلن اد کوہ الن سنگر ڈلن   درد یہ تیم میانی آلو سازے تے ساوان چولن
(میرے دردناک نالے اور تیرا سوز و ساز دونوں میں اگر ہم آہنگی ہو تو پہاڑ ہل جائیں
اور چوٹیاں ٹل جائیں۔۔) ،

محبت کا جذبہ صرف عاشق کے ہی دل میں ہے نہیں معشوق کے دل میں بھی رقصاں ہوتا ہے اور دونوں اظہار محبت پر مجبور ہوتے ہیں اس جذبہ سے کوئی چیز خالی نہیں ؎

پوشہ ٹوٹیوی مُشکہ بریتھکھ   رس رس غنچہ گنڈ ترٔ کِتھکھ
اسیہ وینہ دہانہ کری تھکھ   آواز وار وارے
غنچوں میں تو نے خوشبو بھر دی اور پھر آہستہ آہستہ انکی گرہیں کھول دیں۔ ہنستے مسکراتے
لبوں سے تو نے انہیں پریشان کر دیا۔ آہستہ آہستہ اے جذبۂ محبت)

محمود گامی کے زمانے میں "پیروی فارسی" عام تھی۔ انکا اکثر کشمیری کلام اسی تتبع میں ہے۔ رسول میر نے غیر مرئی اور فوق فطری محبوب کے بجائے ارضی محبوب سے راز و نیاز کا سلسلہ شروع کیا اور یہ محبوب ارضی تو تھا۔ گوشت پوست کا لیکن مکمل طور پر کشمیری نہ تھا۔ مہجور کی عشقیہ شاعری کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں کشمیری محبوب کی جلوہ گری ہے۔ اس طرح اسکی شاعری اصلیت اور واقعیت کے زیادہ قریب آجاتی ہے اور اسکی دلکشی اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے

؎ بوزم ژیری وسہ نیری لوکٹش وچھان
کا یہ ون ژھایہ پان تھاوان چھس
وگنین ستی چھس شُھسہ زنہ ماران
(سنا گیا کہ دن ڈھلے جنگلی پھولوں کا نظارہ کرتے ہوئے آ رہا ہوگا اس لئے میں کائرہ
ون (ایک جنگل) میں چھپ جاتی ہوں اور پریوں کے ساتھ اسکی آمد پر گیت گاتی ہوں)

؎ نولہ چانہ راتس گوٗمتہ بیدآری   لوسمی آو نگ ژالہ کرز آری اے

زۆنہ نیرو ُچھنے مینۍ گُلگآری   کاژہ روٗنی لوٗز مینۍ زآری ۓ

(تیری محبت میں رات بھر جاگتی رہی اور زعفران کے پھول چنتے چنتے تھک ہار گئی ،
چاندنی میں مری گلکاریاں تو دیکھ، اے گھٹتے چاند میری فریاد سُن)

؎ زآلی دانکن تل کنہ وآلی   تھدِ شانکی یم خانہ مآلی
للہ زان چھکھ بنگآلہ واے   پایہ بڈہ مہشانزیاون راۓ

(گندھے بالوں کی اوٹ میں تیرے جھوگے، اعلیٰ پایہ کے لاڈلے، جنھیں بنگال کی
مائیں پالتی ہیں، اے میرے نوآوید محبوب!)

مہجور نے عشق و محبت کے جذبات کا اظہار بڑی فنکاری سے کیا ہے ۔ اور اس جذبے کی جزئیات کے بیان میں بڑی نزاکت سے کام لیا ہے ۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا کہ مہجور کے زمانے تک متصوفانہ شاعری کا بول بالا تھا۔ مہجور کو اس سے اگرچہ کوئی طبعی مناسبت نہ تھی پھر بھی یہ بھرم قائم رکھنے کیلئے کہ میرے اشعار کو محض مجاز پر محمول نہ کیا جائے، کہیں کہیں ایسے اشارات سے کام لیا ہے جن سے قاری کشمکش میں پڑ سکتا ہے ؎

زندہ سپنکھ زندگی حآصل بنی
ہوشہ کہ نو خونہ برتن پرون دل

(تو زندہ بن کے زندگی پائے گا، پرانے دل میں ہوش کا نیا خون بھرے)

؎ شیشہ دلہ کیس رچھن لوگ سے چھ شاہ   ۓ چھ کآمل جام جم یمۍ زون دل

(وہی بادشاہ ہے جس نے دل کا شیشہ محفوظ رکھا اور جو اسے جام جم سمجھا وہی کامل شخص ہے)

ان دنوں اقبال کی نظم "دل" شائع ہو چکی تھی بڑی بات نہیں کہ یہ اشعار اس سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہوں

؎ اس کو اپنا ہے جنون اور مجھے سودا اپنا
دل کسی اور کا دیوانہ میں دیوانۂ دل

ـــ

رنگس چھ عاشق بوالہوس
کیتنہ دوہ بہارک شوق تس
پرِ چھُس یارِ گُلن تاکار گل

(بوالہوس رنگ پر عاشق ہے اور بہار کیلئے چند روز ترستا ہے۔ صرف مطلب پانے تک پھول کا دوست ہے)

بعض مقامات پہ یہ اشارہ وضاحت بن کر خطابت اختیار کرتا ہے ـــ

چھُنہ تاریف سو رمس تہ سازس
ییٚنہ مہجورِ لار کھ مجازس
بُلہ راوی ییٚنہ بُلہ ماے
پایہ بڈ میانہ یاون رائے

(میں بناؤ سنگھار کی تعریف نہیں کرتا، مہجور مجاز پر فریفتہ نہ ہونا ایسا نہ ہو کہ تجھے کسی کی بن ٹھن بھٹکا دے۔ اے میرے اعلیٰ پلے کے محبوب ـــ

یہ کوشش انہیں کسی دقیق فلسفہ کے قریب لاتی ہے۔ جیسے اس شعر میں

روئے مصحف زلف کافر روبرو   ونتہ ولسی کو رکُن لاگون دل

(چہرہ مصحف ہے اور زلف کافر، دونوں آمنے سامنے، بتا میری ہم جولی اب کس سے دل لگائیں)

اور کبھی پند و نصائح کے حامل اشعار کہلواتی ہے ـــ

جان بن جان چھے ییٚنہ نے پان   جان چھکھ تہ جان چھے سورے جہان
ساری خوش تھاوکھ صاحبِ خانہ بن   جان بن جان بن جانانہ بن

(نیک بن، تیرا وجود نیک ہے، تو نیک ہوگا تو سارے لوگ تیرے لئے نیک ہیں۔ ہر کسی کو خوش رکھ صاحب خانہ کی طرح، نیک بن ہر کسی کا محبوب)

مہجور کے زمانے میں دنیا کی اکثر قوموں کے دلوں میں قومیت کا احساس جاگ اٹھا تھا۔ سیاسی آزادی کیلئے حب الوطن کا جذبہ بیدار کرنا پہلی منزل تھی۔ قومیت کا یہ گہرا تصور پیدا کرنے کے لئے مغربی اقوام کی طرف سے پہل ہوئی اور دوسری قوموں پر انکے تسلط نے ردعمل کے طور پر انکے دلوں میں اس جذبہ کو تحریک دی۔ اردو میں سر سید تحریک کے دوران حالی اور آزاد نے اسکی ابتدا کی۔ چکبست اقبال اور دوسرے شعرا نے اسے آگے بڑھایا۔ مہجور بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اسکے علاوہ کشمیریوں کے دلوں میں بھی ایسے احساسات پیدا ہو چکے تھے انکی ترجمانی مہجور کے حصے میں آئی۔ اسکے دل میں کشمیر کے چپے چپے سے محبت ہونیکا ثبوت اُنکی مشہور نظم "ترانۂ وطن" ہے اس نظم میں انہوں نے کشمیر کے مختلف مقامات کی تصویر کشی کی ہے اور منظر نگاری کا حق خوبی سے ادا کیا ہے ؎

گلمرگ آئہ پتھرے   نیلہ ناگ گوگجہ پتھرے
مخمل بہارو وتھرے   گلشن وطن چھُ سونے

(گلمرگ، ایلہ پتھر، نیلہ ناگ اور گوگجہ پتھر میں بہار نے فرشِ مخمل بچھا دیا ہے
ہمارا وطن گلستان ہے)

؎ سوکھہ ناگ توسہ میدان   نتہ وُچھ مئے پانہ بگوان
بھگتن چھُہ جلوہ دان   گلشن وطن چھُ سونے

سوکھہ ناگ اور توسہ میدان میں میں نے خود خدا کو دیکھا جو اپنے بندوں کو جلوہ دکھاتا ہے۔ ہمارا وطن گلستان ہے۔

اسی طرح نالۂ کشمیر میں فرماتے ہیں ؎

تنبہ لاوان پوشہ نولن بلبلن گلزار مینی   سنبہ لاوان راوکہ متی دل آبشار سبزار مینی

(میرے چمنستان پوشہ نول (ایک پرندہ) اور بلبل کے دلوں کو لبھاتے ہیں اور
بے قرار دلوں کو میرے سبزہ زار اور آبشار سکون بخشتے ہیں)

حُبِ وطن کے اسی گہرے احساس نے مہجور کو اپنی قوم کی زبوں حالی پر خون کے آنسو رونے پر مجبور کیا ؎

عالمکی بیمار گر سیون آئے والیس گے بُلتھ   ترٛلشہ تہٕ یمتی تن پیٹھ زُو دوان بیمار مینی

(دنیا بھر کے بیمار میرے ہاں آئے اور صحت مند ہو کر لوٹے لیکن خود میرے مریض سر راہ پانی کو ترستے رہتے ہیں۔)

مہجور پہلے کشمیری شاعر ہیں جو کشمیری لوگوں کی بدنصیبی پر رو دھو کے ہی نہیں بیٹھے بلکہ انہیں ایک خوش آیند مستقبل کی بشارت دیتے ہیں۔ انہیں جد و جہد کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، عمل پر ابھارتے ہیں اور مایوس ہونے سے بچنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ ایک نئے انقلاب کے نقیب بنکر سامنے آتے ہیں اور دوسروں کو ہمت اور حوصلے سے مردانہ وار مصائب کا مقابلہ کرنیکا درس دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں انکی نظم "سنگرمالن ہیو پراگاش" (اُفق پر اُجالا پھیلنے لگا) کیطرف اشارہ کرنا کافی ہوگا جو انہوں نے شخصی حکومت کے زمانے میں آئینگر وزارت کے دوران تحریک آزادی چلانے والے نیشنل کانفرنسی لیڈروں کی گرفتاری کے بعد رہائی کے وقت لکھی تھی ؎

باغے کُرِ ریزل وارلین گالن   بلبلہ غم تراو کڈ پھکن داش
بیٛتہ لیور چھنے مذہب گالن   سنگرمالن ہیو پراگاش
ہر دک طوفان پوشہ ترٛزالن   سونتہ ییہ دوہ اکہ تُلہ پرخاش
سُہ پھوہ لہ تن کُیس دیہ جنجالن   سنگرمالن ہیو پراگاش
بونہ بیٹھ گانڈہ ہُند اولہ تیٛلہ ڈالن   بُلبلن یار گژھہ لسہ رنج آش
پوشن ین ہموشہ تے دم سنبالن   سنگرمالن ہیو پراگاش

(باغ کے شکاری بازوں کا صفایا کریں گے۔ اے بُلبل پر جھاڑ اور اُداس نہ ہو۔ اب تیری پیروی کریں گے۔ چوٹیوں پر اُجالا پھیلا یا۔ پھلواڑیاں خزاں کے جبر سے برداشت کریں گی بہار ایک دن آئے گی اور مداوا کرے گی۔ وہ پھر پھلے پھولے گا جو مصائب

کا مقابلہ کرے۔ چوٹیوں پر اُجالا پھیلا۔ جب چنار سے چیل کا گھونسلا اتارا جائے۔ بلبل زندہ رہنے کی آس پائیں گے۔ پھول ہوش میں آکر سہارا لیں گے۔ چوٹیوں پر اُجالا پھیلا) ؎

دلولہ جوشا حبابا اضطرابا ہمتا
پاد دیا مسہ گژھہ دِلن اندر تہ یئے گو انقلاب

(ولولہ اور جنون، ہمت و حوصلہ جب دلوں میں پیدا ہوگا انقلاب کہلائے گا)

اس جذبہ سے سرشار ہو کر مہجورؔ کے اشعار بعض اوقات نعرہ بازی ہو کر رہ جاتے ہیں کیونکہ نفسِ مضمون کی تیغشمشیر کا دم سینۂ شمشیر سے باہر آجاتا ہے۔ یہ براہ راست منظوم پیغام تو بن پاتا ہے شعر نہیں اگرانے کچھ اس قسم کے اشعار اتنے مقبول ہوئے کہ ہمارے لیڈروں نے انہی اشعار کی ترتیل سے مدت تک لوگوں کے دلوں کو گرمایا۔ میں نے خود کئی بار شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی زبانی سریلی آواز میں مہجورؔ کی لکھی ایک نظم سُنی ہے جسے وہ تقریر کے آغاز میں پڑھا کرتے تھے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ولو ہا باغوانو نوبہارک شان پیدا کر   پھولن گل گتھ کرن بلبل تیتھی سامان پیدا کر
اگر وزناوُن چھے بستی گُلن منز، ترلو زیر و بم   بُنیل کر واو کر گگرایہ کر طوفان پیدا کر

(اے باغبان آ اور نوبہار کی شان دکھا۔ تاکہ پھول کھلیں اور بلبل منڈلائیں۔ ایسے سامان بنا، اگر پھولوں کی بستی کو بیدار کرنا چاہئے ہو تو طاؤس و رباب کی بات چھوڑ، زلزلہ ڈال دے، آندھی لا، گرج اور طوفان پیدا کر)

مہجورؔ دنیا کے باقی حصوں میں پیش آنیوالے واقعات اور قیامت خیز تبدیلیوں سے کبھی آنکھیں موندے ہوئے نہ تھے۔ وہ بھی "بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار" سے بھی آگاہ تھے اور سرمایہ و محبت کی کشمکش کو بھی سمجھتے تھے۔ امیروں کے مقابل غریبوں کی مفلوک الحالی پر کڑھتے تھے۔ اس کا اظہار ایک جگہ "گرِیسِہ کوٗر" (کسان لڑکی) نظم میں ملتا ہے ؎

ژٕ بتہٕ خوجہ باین چھا برابر کرے   ژے گلن ستین دلبر گوے

خوجہ بایہ ترٚو پرٚتھ دارِ تہٕ برٚگے   گرٚہسی کوٗرٕ نازنین سُندری ے

(امیر زادیوں کی تجھ سے کیا مشابہت، تجھے پھولوں سے پیار اور وہ محلوں کی زینت اے کسان لڑکی، اے نازنین) اور پھر دوسری نظموں میں۔ جیسے ؎

فاقہِ پھرِ شونگہ متہِ مزدٗرو ترٚاد غفلت گژھ ہُشیار
ووٚنہ سیٚن استادِ ظلمن ژھُکھہٕ ژٕ کوٚرُمت نابکار

(اے بھوکے ننگے سوئے ہوئے مزدور، اٹھ بیدار ہو، تجھے ظلم و ستم نے برباد کیا ہی)

مہجور سمجھتے تھے کہ کشمیریوں کی کامیابی و خوشحالی کا راز انکے باہمی اتحاد اور یگانگت میں ہے اسی لئے وہ ہندو مسلمانوں کو مل جل کر رہنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ ؎

ہیٚندُ چھُ شکر دۄد چھُ مُسلم صاف صاف
دۄد تہٕ چینیہ شکر ملاوٕ لیو پانہٕ وانٕی

(ہندو شکر ہے اور مسلم دودھ، آپس میں شیر و شکر ہو کر رہو تو اچھا)

مہجور کے آخری دور کی نظمیں زیادہ تر سیاسی نوعیت کی ہیں۔ شخصی حکومت کے خاتمہ کے بعد وہ صرف دو چار سال زندہ رہ سکے یہ زمانہ سیاسی لحاظ سے ایک عبوری دور کہلایا جا سکتا ہے۔ اسی دوران مہجور کے حساس اور نازک دل کو کئی بار ٹھیس لگی۔ ذوق تلخ کامی نہ ہونیکی وجہ سے جھنجھلا اُٹھے اور اس کرب کا اظہار اپنی کئی نظموں میں کیا۔ ان میں "اقوام متحدہ کی جنرل کونسل سے" "آزادی" "گُل لالہ" وغیرہ نظمیں قابل ذکر ہیں۔

عبدالاحد آزاد نے کشمیری ادب میں مہجور کے کنٹری بیوشن سے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے "مرصع نگاری اور ریختہ گوئی کی اوٹ سے نکالکر کشمیری شاعری کو عوام سے قریب کر دیا۔ عام فہم اور سلیس و سادہ زبان استعمال کی۔ اسے فارسی کی پیروی سے آزاد کر کے مزاج اور رنگ و روپ ہر طرح کشمیریت کا پیکر بنا دیا۔ الفت و محبت کے جذبات کی مُنہ بولتی تصویر پیش کی، غزل کی زبان میں سادگی، صفائی، برجستگی، روانی اور سوز گداز لاکر اسکا مقام

متعین کر دیا۔ میرے خیال میں اسکے علاوہ مہجور کا رجائیانہ انداز بیان بھی یاد رکھنے کے قابل ہے عاشق کو خودداری سکھانے کا انداز بھی نرالا ہے اور کشمیری شاعری میں حب الوطن سیاست اور دوسرے موضوعات سمونا بھی امتیاز ہے۔ انہوں نے اسے غم جاناں ہی نہیں غم دوراں کا پیکر بھی بنا دیا۔ اور زندگی کے دوسرے مسائل کی طرف توجہ دے کر اسکو وسعت بھی بخشی انہوں نے صحیح کشمیری روزمرہ اور محاورہ کے استعمال سے اس میں جان ڈال دی، اسے انبساط و سرور کی کیفیت بخشی۔ انکے اشعار فصیح و بلیغ بھی ہیں اور برجستہ و نادر بھی وہ سادگی اور حُسن بیان سے سہل مُمتنع کے بڑے اچھے نمونے پیش کرتے ہیں ؎

واو صبحُک سُلہٕ اوس لاران　　تنہٕ لیمت کُس تال ژھاران
خندٕ پوشو کرس جایہ جایہ　　پایہ بُٹہٕ مسیانہٕ یاون رٲئے

(صبح کی ہوا سویرے سویرے بھاگ دوڑ کر رہی تھی اور سراسیمہ ہو کر کسی کی تلاش میں تھی، پھول اس پر طنزیہ ہنسی ہنسے، اے میرے محبوب)

؎ لولہٕ نارٕ پانس گونڈُم ہیر لوٗن　　امہٕ نارٕ سٕتۍ بلہٕ سینہٕ متوٗن
ولبہٕ کیاہ آسم ولبہٕ رٲدن　　چارٕ سنہٕ دار دتہٕ لاگ مبوٗن پان

(محبت کی آگ میں سراپا سوزاں ہوا اس سے میں کندن بن گئی۔ ہمجولیاں کیوں ڈرا رہی تھیں مجھے، اے محبوب مجھے صحیح راہ پر لگا)

مہجور کو سراپا نگاری میں جو کمال حاصل تھا اسکی شہادت انکی مشہور نظم "گرٕیسی کورٕ" یعنی کسان لڑکی سے ملتی ہے۔ "لوکہ چار" اس کے کلام کی برجستگی کا نمونہ ہے۔ انکے کلام میں خالص کشمیری تشبیہات اور استعارات نظر آتے ہیں۔ اسکے علاوہ دوسرے صنائع بدائع سے بھی انکا کلام خالی نہیں لیکن صرف زیورات کی حد تک۔ جس سے کلام کا اصلی حُسن دبتا نہیں اس میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ہاں جہاں انہوں نے محض صنائع بدائع استعمال کرنے پر قدرت دکھانے کی شعوری کوشش کی ہے اور اشعار کا مفہوم اس کا متحمل نہیں ہو سکا ہے یہ کوشش سند

چڑاتی ہے۔

آخر پر اس بات کا اعتراف نہ کرنا حقیقت پسندی نہ ہوگی کہ بعد کے شعرا مہجور سے کافی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ کشمیری شاعری کے دو مختلف دھاروں کا سنگم ہے اور اس شاہراہ کا ایک اہم اور ناقابل فراموش موڑ کشمیری ادب اس کے بار احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

* * *

شیرازہ
(افسانہ نمبر)

جموں و کشمیر کی کشمیری، اُردو، پنجابی اور ڈوگری
کہانیوں کی دیپ مالا ــــ یہ نمبر جموں و کشمیر میں
افسانے کی رفتار کا ایک مکمل نقش پیش کرتا ہے

(ناشر)
جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

سید نبیہ احمد شہید

سید میرک شاہ اندرابیؒ

مولینا سید میرک شاہ اندرابیؒ کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے ان کے خاندان کا بقدرِ ضرورت تعارف بھی ضروری ہے ان کے جدِ اعلیٰ پیکرِ علم و عرفان حضرت سید احمد اندرابی رحمۃ اللہ علیہ نے کب، کس طرح اور کن حالات میں اپنے عزیز وطن اندراب[1] کو چھوڑ کر کشمیر کی سرزمین کو ہی اپنا وطن بنا لیا اور پھر کشمیر ہی کے ہو کر رہ گئے۔ مولانا سید میرک شاہ اندرابی کے اسلافِ کرام کی کشمیر میں آمد کا گہرا تعلق حضرت امیر کبیر شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی صفات اور کشمیر میں انکی تشریف آوری سے بھی ہے اس لئے ان اہم امور کے متعلق کچھ مختصر باتیں سپردِ قلم کی جاتی ہیں۔

---

[1] "اندراب" افغانستان کے ایک سرسبز و شاداب اور مردم خیز شہر کا نام ہے۔ اس کی آب و ہوا بڑی خوشگوار ہے اور باشندے نہایت شریف، بہادر اور سخی ہیں۔ ان کی زبان فارسی ہے۔ علمی چرچا بہت زیادہ ہے۔ علماء کی بڑی کثرت ہے۔ مساجد کے ساتھ علمی مراکز بھی جا بجا موجود ہیں۔ جن میں تشنگانِ علوم اپنی علمی پیاس بجھاتے ہیں۔ اس شہر کے لوگ کذب بیانی کو خاص طور پر ناقابلِ عفو گناہ سمجھتے ہیں۔ بالخصوص نسب کے بارے میں جھوٹا دعویٰ کرنا ان کے نزدیک بہت بڑا سنگین جرم ہے۔

حضرت امیر کبیرؒ کی کشمیر میں تشریف آوری

سرزمین کشمیر اپنی آب و ہوا کی نفاست، مناظرِ قدرت کی عالم گیر شہرت اور دیگر بے پناہ محاسن کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور بھی ہے اور جاذب توجہ بھی۔ اس کی تاریخ بڑی شان دار ہے اس کا ماضی علمی و اخلاقی لحاظ سے بڑا پُر وقار ہے اس کا حال ایک پر سکون فضا میں اپنے تابناک مستقبل پر نظر رکھے ہوئے ہے اور مستقبل تو خدا کرے کہ روشن و تابناک ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اخلاق اور سُلجھی ہوئی انسانیت کا آئینہ دار ہو۔

یہ سرسبز و شاداب وادی پہلے بھی علوم و معارف کا گہوارہ رہی ہے اور اس پر ہمیشہ ہی خدا پرست مقدس انسانوں کی نظر کرم بھی رہی ہے۔ چنانچہ کوئی چھ سو سال پہلے کی تاریخ ملاحظہ کیجئے تو آپکو صاف طور پر معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں جبکہ یہاں کے لوگوں کو کچھ اخلاقی پستی اور روحانی گراوٹ بے راہ روی اور غیر انسانی اطوار کی طرف مائل کئے ہوئے تھی تو جس لاثانی مقدس ہستی نے اس سرزمین کی کایا پلٹ کر رکھدی وہ رہبر منازل خدادانی سیدنا علی بن شہاب الدین ہمدانی رحمۃ اللہ علیہما کی ہی ذات ستودہ صفات ہے۔ اس فرشتہ کردار انسان نے پہلی مرتبہ سنہ ۷۷۴ھ میں بڑا دور دراز و دشوار گذار سفر سینکڑوں دوستان خدا کی ہمراہی میں طے کر کے سرزمین کشمیر کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں خدا ناشناسی کی تاریکیوں میں کھوئی ہوئی انسانیت ایک ہمہ گیر اور حیات بخش باران رحمت کو ترستی تھی۔ حضرت امیرؒ نے اہل کشمیر کو اخلاقی اور روحانی پستیوں سے نکالکر خوش بختی اور سعادت کے بام عروج پر پہونچایا۔ سارا کشمیر انوارِ ہدایت سے جگمگا اٹھا اور اعلیٰ انسانی قدروں کی تابناکیوں سے ہر طرف روشنی ہی روشنی نظر آنے لگی۔

اعزّالدین میر سید احمد اندرابی رحمۃ اللہ علیہ

شہر اندراب میں حضرت سید الشہداء سیدنا امام حسین علیہ السلام کی اولاد میں ایک جوہر آبدار پیدا ہوئے۔ نام نامی حضرت سید احمد اندرابیؒ تھا۔ ان کے حقیقی ماموں جان حضرت امیر کبیر رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جب حضرت امیرؒ نے سفرِ کشمیر کا ارادہ فرمایا تو اپنے اس برخوردار اور گرامی اطوار بھانجے پر انکی نظر

انتخاب پڑی اور ان کو اس سفر میں اپنا خاص ساتھی بنا لیا۔ چنانچہ تعمیل ارشاد کرتے ہوئے سید احمد اندرابیؒ نے شاہ ہمدانؒ ہی کی معیت میں سرزمین کشمیر کو اپنے ورودِ مسعود سے رونق بخشی اور ہمیشہ یہاں کے لوگوں کو علمی و روحانی فیوض سے مالا مال کیا اور پھر مستقل طور پر کشمیر کے ہی ہو کر رہ گئے۔ آپکا تذکرہ کشمیر کی تاریخوں میں نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔ مشہور مؤرخِ کشمیر شیخ عبدالوہاب شائقؔ نے آپکا تعارف اپنی تاریخ میں اس طرح کیا ہے۔

حسینیؑ[1] نسب سید احمدؒ بنام
کہ بوداست از اولیائے کرام

زیاران میر کبیرؒ است او
بزہد و ورع بے نظیر است او

حسینیؑ[2] نسب بود آں پاک تن
حسب داشتش چوں امام حسنؑ

زسید چہ گویم کہ چوں بودہ است
کمالاتش از حد بیروں بودہ است

حضرت سید احمد اندرابیؒ یہاں اپنے واجب الاحترام ماموں جانؒ کے ساتھ انکے دوش بدوش تبلیغ حق اور اصلاحِ خلق کے اہم کام میں ہمہ تن مصروف رہے اور سماج کی برائیوں اور بے راہ رویوں سے جہالت کی جو مسموم فضا پائی جاتی تھی اسکو آپ نے کبھی مواعظ حسنہ اور اخلاقِ جمیلہ سے دور فرمایا اور لوگ آپکے صدقے کج روی اور پستیٔ اخلاقی کے اندھیرے غاروں سے نکل کر روشنی کے اعلیٰ میناروں پر چمک اٹھے اور پھر دوسروں کو بھی روشن کرتے رہے یہی کشمیر میں سادات اندرابیہ کی مختصر تاریخ ہے جب حضرت علی ثانیؒ نے اپنا فرضِ منصبی ابلاغِ عام اور خلوصِ تام سے پورا کیکے واپسی کا ارادہ

---

[1] یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد میں سید احمدؒ نامی بزرگ اولیاء کرام میں سے تھے۔ وہ حضرت امیر کبیر رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں میں سے تھے۔ دنیوی لذات سے کنارہ کشی اور پارسائی میں لاثانی تھے۔ نسباً تو وہ حسینیؑ تھے اور دینی شرف اور بزرگی میں سیدنا امام حسن علیہ السلام جیسے معلوم ہوتے تھے۔ میں سید موصوف کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں کہ وہ کیسے تھے۔ ہاں مختصراً اتنا کہہ دیتا ہوں کہ ان کے کمالات کی کوئی انتہا نہیں تھی۔

فرمایا تو دوسرے خدا پرست بزرگوں کے ساتھ اپنے خواہر زادے سید احمد اندرابیؒ کو بھی خاص طور پر اپنے پاکیزہ مشن اور صالح سماج کی تکمیل و تعمیر کیلئے کشمیر ہی میں مستقل سکونت کی تلقین فرمائی۔ چنانچہ برخوردار اور سعادت آثار بھانجے نے سر آنکھوں سے آپکے ارشاد کی تعمیل کی اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ میرہ محلہ ملارٹہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ کے مسلم علم و فضل اور ولایت کے اعلیٰ مقام کے پیش نظر سلطان سکندر نے آپکے لیے اسی محلے میں ایک خانقاہ تعمیر کرائی جو تاریخوں میں خانقاہ اندرابیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس میں تب سے آجتک میرہ محلہ اور آس پاس کے مسلمان برابر نماز پنجگانہ ادا کرتے آئے ہیں۔

میر سید احمد اندرابیؒ کی اولاد

حضرت میر سید احمد اندرابیؒ کے فرزند حضرت میر سید محمد ان کے فرزند حضرت سید بدالدین ابراہیم ان کے فرزند حضرت میر سید شمس الدین اور ان کے فرزند حضرت میر سید محمد میرک اندرابی رحمہم اللہ ایک دوسرے کے بعد اپنے جد امجد میر سید احمدؒ کے خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ حضرت سید محمد میرک اندرابیؒ کی اولاد میں حضرت فخر المجاہدین حاجی میر سید عتیق اللہ[1] شہید اندرابی رحمۃ اللہ علیہ کی دردناک شہادت کے بعد صرف حضرت میر سید کمال الدین اندرابیؒ (اوّل) میرہ محلہ میں مقیم رہے۔ باقی اس المناک شہادت اور غارت گری کا حال دیکھ کر یہاں سے ہجرت کر گئے اور ریاست کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے۔

میر سید احمد اندرابیؒ مزار سلاطین یعنی مقبرہ سلطان زین العابدین بڈشاہ کی صف اوّل میں دفن کئے گئے ہیں۔ میر سید محمدؒ اور میر سید بدالدین ابراہیمؒ مزار سلطان قطب الدین متصل زیارت حضرت میر حاجی محمد صاحبؒ (صراف کدل) میں مدفون ہیں اور میر سید شمس الدین کا مزار پر انوار کوہ ماران کے جنوب میں قلعہ ناگر نگر اور مسجد اخوند ملا شاد کے درمیان واقع ہے۔ ان کے فرزند میر سید محمد میرک اندرابیؒ کا مزار

---

[1] اس مجاہد اعظم کی شہادت کی نوعیت اور اسکی وجوہات کی درد بھری کہانی بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اس کے لئے ایک مستقل تحریر کی ضرورت ہے۔

مُشکبار میرہ محلہ میں خانقاہ اندرابیہ کے جنوب میں واقع ہے سید موصوف کے بڑے فرزند میر سید محمدؒ میرہ محلہ میں دوسرے فرزند میر سید محمد یوسفؒ کوہ سلیمان کے دامن میں اور تیسرے فرزند میر سید احمد قاسمؒ موضع پوچھل میں مدفون ہیں۔ ان سب کی اولاد میرہ محلہ، پوچھل، رتنی پورہ، کانٹھ پورہ، جڈ دورہ اور تریال وغیرہ میں آباد ہے۔ ان حضرات نے اپنے نئے وطن کشمیر میں علمی، دینی، روحانی اور سیاسی میدانوں میں بڑے بڑے کارنامے انجام دئے ہیں جن کا اجمالی تذکرہ کشمیر کی تاریخوں میں موجود ہے۔

ان ہی حضرت سید احمد اندرابی رحمۃ اللہ علیہ کی سترھویں پشت سے علامہ مولانا سید میرک شاہ اندرابی رہ پیدا ہوئے۔ حضرت سید میرک شاہ اندرابی کی فاضل اجل ہستی برصغیر ہند و پاکستان کے علماء میں شمار ہوتی ہے۔ انکی ساری زندگی علمی، تبلیغی اور اصلاحی مشاغل میں پورے انہماک کے ساتھ گذری اور سیاسی کاموں میں تو غیر معمولی سرگرمی کے ساتھ آپ نے قائدانہ رول ادا کیا۔ آپ نے عمر کے آخری تیس سال کلی طور پر وطن سے باہر خصوصاً پاکستان میں گذارے اور زیادہ تر وقت علمی اور دینی کاموں کیلئے وقف کیا کشمیر میں اب بھی انکے جاننے والوں میں کچھ بزرگ بقید حیات ہیں۔ مولانا کی زندگی کو مندرجہ ذیل سات دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے تاکہ سہولیت کے ساتھ حالات زندگی کا مطالعہ ہو سکے۔

۱۔ ولادت، نام و نسب۔ ابتدائی اور درمیانی درجہ کی تعلیم،

۲۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر۔

۳۔ علمی، اصلاحی اور روحانی زندگی۔

۴۔ سیاسی زندگی

۵۔ علمی زندگی کی طرف عود اور پاکستان میں قیام

۶۔ تصانیف

۷۔ وفات اور متعلقات

(۱) ولادت

مولینا سید میرک شاہ اندرابی ماہ صفر المظفر سنہ ۱۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ اسی مہینے کی پانچ تاریخ کو آپ کے جد امجد سید العارفین حضرت شیخ و سید محمد میرک اندرابی رحمۃ اللہ علیہ کا یوم وصال بھی ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے اسوقت کے بزرگان خاندان نے تیمناً آپکا نام میرک شاہ رکھدیا تھا۔ میرک محدث شہیر صاحب تصانیف کثیرہ حضرت علی ابن سلطان محمد القاری رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے ایک جلیل القدر محدث کا بھی نام تھا چنانچہ حضرت قاری نے مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح میں متعدد مقامات پر قال میرک کے الفاظ میں ان کی علمی تحقیقات کا حوالہ دیا ہے۔

نسب

مولانا سید میرک شاہ اندرابی مرحوم سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے والد ماجد سید شاہ مصطفیٰ اپنے وقت کے مشائخ کرام میں شمار ہوتے تھے حضرت امام عالی مقام تک ان کے اسلاف کرام سب ہی حضرات بزرگان دین میں شمار ہوتے ہیں۔

ابتدائی اور درمیانی درجہ کی تعلیم

سنہ ۱۳۲۲ھ میں مولانا نے پورا قرآن مجید حفظ کیا اس سے پہلے سنہ ۱۳۲۱ھ میں بعمر پندرہ سولہ سال ان کی شادی اپنے ہی خاندان کے ایک خدا دوست بزرگ میر سید محمد مقبول اندرابی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ حفظ کلام اللہ سے فراغت پانے تک آپ نے کوئی اردو، فارسی یا عربی رسالہ نہیں پڑھا بلکہ ہمہ تن اسی کار محمود میں مشغول رہے۔ جب اس سے اچھی طرح فارغ ہوئے تو اپنے بزرگ بہنوئی مولانا سید احمد سعید اندرابی سے علم صرف میں صرف ہوائی اور علم فقہ میں خلاصۂ کیدانی اور اپنے والد ماجد سے کریما اور نام حق پڑھی۔

درمیانی درجہ کی تعلیم میں آپ نے مولانا سید احمد سعید اندرابی مذکور مولانا مفتی محی الدین صاحب فتحکدلی اور مولانا محمد حسین صاحب وفائی سے صرف، نحو، منطق، فلسفہ، فقہ، اصول فقہ، حدیث و تفسیر اور معانی بیان کی کچھ بنیادی کتابیں کمال شوق سے پڑھیں۔ اپنے ان اساتذہ کرام سے آپکو بڑی محبت

اور شفقت سے پڑھایا۔ اور آپ نے بھی کمال اشتیاق اور محبت سے پڑھکر درمیانی درجہ کی تعلیم میں امتیازی درجہ حاصل کیا۔ اسکے بعد ماہی بے آب کی طرح اعلیٰ تعلیم کی تلاش میں تڑپتے رہے۔

شیخ الحدیث علامہ محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات

بمصداق من جدَّ وجدَ حسن اتفاق سے حضرت شیخ الحدیث علامہ بے نظیر مولانا محمد انور شاہؒ دارالعلوم دیوبند سے اپنے آبائی گاؤں وَدْنو (وادیٔ لولاب) کچھ مدت کیلئے تشریف لائے۔ مولانا سید میرک شاہ اندرابیؒ فوراً انکی خدمت میں جا پہنچے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے انکی صلاحیت اور امتیازی علمی استعداد کو بھانپ لیا اور دارالعلوم دیوبند حاضر ہونے اور اعلیٰ علوم و فنون حاصل کرنے کا مشورہ دیا

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سرینگر سے باہر قدم رکھنا ایک بڑا مشکل کام ہوتا تھا۔ مگر علمی ذوق و شوق نے یہ دور دراز سفر آپکے لئے آسان بنا دیا اور نہایت مستعدی کے ساتھ اس کی تیاری میں لگ گئے۔ اگرچہ بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سفر میں ان کے ساتھی مرحوم میر واعظ مولانا یوسف شاہ صاحب بھی تھے۔ چنانچہ دونوں دارالعلوم دیوبند جا پہنچے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ کی خاص توجہات اور دوسری منفرد شخصیتوں کے مالک اساتذہ کرام کی نظر کیمیا اثر سے آپ نے کم و بیش سات سال تک اس ممتاز درسگاہ میں کوثر علم کے جام لنڈھائے۔ مولانا عبدالکبیر صاحب رینہ سابق پرنسپل مدینۃ العلوم خضر تبل بھی اسی زمانے میں دارالعلوم کے طالب علموں میں شامل تھے۔ مولانا مرحوم نے بیان کیا ہے کہ مولانا سید میرک شاہؒ ہم سے اگلی جماعت کے ممتاز طالب علم تھے۔ چنانچہ مولاناؒ نے دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد اعلیٰ امتیاز کے ساتھ علوم منقولہ و معقولہ میں خاص پوزیشن کے ساتھ فراغت کی سند حاصل کی۔ اسی دوران اساتذہ کرام کے مشورہ سے پنجاب یونیورسٹی کے امتحان مولوی فاضل (آنرز ان عربک) سنہ ۱۹۱۹ء میں شمولیت کی اور یونیورسٹی بھر میں اول آئے جس کے نتیجے میں یونیورسٹی نے اعزاز کے طور پر ایک سونے کا میڈل دیا اور دو سال کے لئے تیس روپے کا ماہوار وظیفہ بھی جاری کر دیا۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں منشی فاضل (آنرز ان پرشین) کے امتحان میں شامل ہوئے مگر خدا کا کرنا تھا کہ امتحان کے پہلے ہی دن والد محترم کے انتقال پُرملال کی خبر تار کے ذریعہ ملی۔ اس جانگداز سانحہ رنج و غم اور بے اطمینانی

کی حالت میں برابر امتحان دیتے رہے اور کامیاب بھی ہوئے۔

(۳۳) علمی زندگی

۱۹۲۰ء سے ہی افادہ کی صورت میں آپ کی علمی زندگی کا آغاز ہوا تھا چنانچہ اپنے موقر اساتذۂ کرام اور دار العلوم کے ارباب اہتمام کی تجویز سے دار العلوم دیوبند میں ہی مدرس اور نائب مفتی کی حیثیت سے نادر علمی خدمات انجام دیں۔ جامعۂ امدادیہ مراد آباد میں تدریسی خدمات کے علاوہ صدر مفتی کے طور پر بھی کام کیا اور افتاء کے عظیم منصب کو چار چاند لگائے۔ مراد آباد میں ہی اپنی رہائش گاہ کے قریب مفتی ٹولہ کی عالی شان مسجد میں روزانہ آپکا درس قرآن ایسے علمی حقائق و معارف پر مشتمل ہوتا تھا کہ بڑے بڑے فضلاء۔ اہل علم اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات بڑے شوق کیساتھ حلقۂ درس میں شامل ہوکر فیضیاب ہوکر جاتے تھے۔

تبلیغ کالج کرنال میں صدر اسلامیات کے منصب پر فائز ہوئے۔ اور دینی خدمات کا فرض انجام دیا۔

دار العلوم مئو (اعظم گڈھ) جامعہ مدینہ لاہور، حیدرآباد (سندھ) وغیرہ مقامات پر کہیں صدر المدرسین کہیں شیخ الحدیث اور اعلیٰ معیاری علمی مجالس کے صدر و ناظم کی حیثیت سے علمی اور دینی خدمات کو کمال حسن و خوبی اور انہماک کے ساتھ مثمر نتائج کا حامل بنا دیا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ فرقہ پرست جماعتوں نے راجپوتانہ میں ایک طوفان برپا کرکے یکطرفہ طور پر منظم طریقہ سے مذہب کی تبدیلی کا زوردار پرچار اجتماعی صورت میں کیا۔ اس سے کشیدگی اور منافرت کے زہریلے اثرات کا پیدا ہونا اور وسیع پیمانے پر پھیلنا ایک ناگزیر امر تھا۔ اس تحریک سے مسلمان ہی عموماً متاثر بھی ہوتے تھے اور ان ہی کے جذبات کو ٹھیس لگتی تھی۔ انگریزوں کا دور حکومت تھا۔۔ مسلمانوں نے بکمال دانشمندی سے ملک کے گوشے گوشے سے علماء و فضلاء کی جماعتیں اس فتنہ کی روک تھام کیلئے بھیجیں۔ دار العلوم دیوبند اور جمعیۃ علمائے ہند نے بھی ایک بڑا مشترک وفد جو علماء [illegible] مشتمل تھا وہاں روانہ کیا اس وفد کی قیادت مولانا سید میرک شاہ اندرابی کے سپرد ہوئی۔

امیر وفد کی حیثیت سے آپ نے اس میدان میں بھی کمال دانشمندی سے نہایت کامیاب رول ادا کیا اور مدت تک وہاں مقیم رہے اور مخلوق خدا کی صحیح رہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے۔ اس حکیمانہ دفاع سے سارے ملک میں منافرت کی پھیلنے والی وبا دور ہو گئی اور سب لوگ باہم دوبارہ شیر و شکر ہو کر زندگی کے دن خوشگواری کے ساتھ گذارنے لگے۔

علاقۂ گریز میں اصلاحی کارنامہ

اپنے وطن میں علاقۂ گریز کی پس ماندہ مسلم آبادی پر عیسائی مشنریوں نے لالچ اور دوسرے نامناسب ذرائع سے ارتداد کا جال بچھا کر علاقہ بلکہ ریاست بھر کے خرمن امن کو آگ لگانیکی ایک مکروہ سازش کی تھی اس میں غالباً "رابرٹ سن" نام پادری کی مسلسل خفیہ مساعی کو سب سے زیادہ دخل تھا۔ اس شخص نے لوگوں کو بجائے پند و نصیحت اور تبلیغ و ترغیب کے لالچ وغیرہ مکروہ ذرائع کی آڑ میں سبز باغ دکھا کر نہایت رازداری سے بپتسمہ دیا تھا۔ مرکوٹ کے گاؤں میں ایک پرائمری اسکول بھی قائم کیا تھا جس میں سلام الدین نام کا ایک مدرس بھی مقرر کر رکھا تھا۔ اور مشنری کے فنڈ سے ہی اسکی تنخواہ دی جاتی تھی۔ دراصل یہ غربت زدہ مسلم آبادی کی پس ماندگی کا ناجائز استحصال تھا اسکو تبلیغ کا نام دینا ایک ناجائز ہتھکنڈے کے استعمال سے بھی زیادہ برا ہے۔ بہرحال یہ خفیہ سازشیں منظر عام پر آگئیں تو امن و امان کی برہمی اور افراتفری کی فراوانی ناگزیر تھی کیونکہ علاقہ اور اس کا سارا ماحول مسلم آبادی پر مشتمل تھا۔ لیکن اس نازک ترین موقع پر اصلاح و تبلیغ کا ابتدائی کام تو جناب پیر غلام احمد صاحب علوی مرحوم نے کمال دانشمندی اور اخلاق کریمانہ سے سازشی کردار سے بالاتر ہو کر انجام دیا اور فوراً مولانا مرحوم سے بھی رابطہ قائم کر کے انکو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ پھر دونو بزرگوں نے مل کر وہ تاریخی کارنامہ انجام دیا کہ مشنری اور پادری کی سالہا سال کی خفیہ کارستانیوں پر پانی پھر گیا اسکول بچوں سمیت ایک دینی درسگاہ میں تبدیل ہو گیا اور ارتداد کے جال میں پھنسے ہوئے تمام لوگ تائب ہو کر اپنے محبوب مسلک کی آغوش رحمت میں واپس آ گئے۔ مولانا مرحوم کی کوشش سے درسگاہ کے مصارف کے لئے جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام انبالہ شہر سے مالی امداد بھی فراہم ہو گئی اور اب

درسگاہ کے علاوہ بڈوناں میں بھی ایک مکتب جاری ہوگیا اس سے بھی تعلیمی اور اخلاقی پسماندگی کو دور کرنے میں بڑی مدد ملی۔ اب تو مولینا اور علوی صاحب دونوں بزرگ اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں غالباً مرکوٹ کا مدرسہ پہلے ہی سرکاری تحویل میں لیا گیا ہے اور بڈوناں کے مکتب کا بھی یہی حال ہوگا۔ مگر سازشوں پر مبنی ارتداد کی وبا ہمیشہ کیلئے علاقہ سے رخصت ہوگئی ہے۔ اور باہمی منافرت کے خدشات بھی جو ہمہ گیر جھگڑوں کی صورت اختیار کر سکتے تھے کلی طور پر دور ہوگئے ہیں۔

موضع زکورہ تحصیل خاص میں کچھ ایسے لوگ بھی آباد تھے جن سے عام لوگ کوئی میل جول نہیں رکھتے تھے۔ ان کے لئے ایک مہذب سماج میں کوئی مقام نہیں تھا۔ اور کسی مذہبی برادری میں بھی باضابطہ شامل نہیں تھے انکو کشمیری زبان میں "ژھینژھ" کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ عام طور پر بلیوں کو اپنے پالتو کتوں کے ذریعہ مارتے تھے اور ان کی کھالیں اتار کر فروخت کرتے تھے۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ یہ لوگ [illegible] مردہ مرغوں کو بھی کھالیا کرتے تھے۔

مولانا مرحوم ایک مرتبہ سعیدہ پورہ بھی تشریف لے گئے تھے۔ ایک دن [illegible] کی سیر کرتے کرتے ذکورہ میں انکی بستی کی طرف بھی نکل گئے انکے ہاں ایک آدمی بیمار تھا۔ ان لوگوں نے مولیناسے اپنے بیمار کا ملاحظہ کرنے اور کچھ علاج تجویز کرنے کی استدعا کی۔ مولینا فوراً انکے ہاں گئے بیمار کی نبض دیکھی حال پوچھا اور علاج[1] تجویز کیا انکے حالات سنکر اور بچشم خود دیکھ کر مولینا ان کی اخلاقی پستی اور ان کے تئیں سماج کی بے اعتنائی سے بہت رنجیدہ اور متاثر ہوئے ان سے ہمدردی کا اظہار کیا اور نہایت حکیمانہ انداز میں ان کے سامنے اسلام کا نظریہ پیش کیا۔ مولانا کی ایک ہی تقریر سُن کر ان لوگوں نے اس پرخلوص پیشکش کو متفقہ طور پر دل کی گہرائیوں سے قبول کیا جسکے نتیجے سے یہ مختصر بستی اسلام کے آغوش رحمت میں آگئی۔ مولانا مرحوم نے ان کے لئے ایک چھوٹی سی مسجد بھی بنوائی اور ایک دینی درسگاہ بھی قائم کی جو مدت تک چلتی رہی۔ اسی درسگاہ میں ان لوگوں نے دینی

---

[1] مولینا سید میرک شاہ اندرابی علم طب میں بھی مہارت رکھتے تھے اسکا ذکر آگے تفصیلاً آئیگا۔

احکام سے واقفیت بہم پہونچائی۔ مدرّس کی تنخواہ تبلیغی فنڈ سے مولینا ماہ بماہ ادا کرتے تھے۔ یہ لوگ اب سماج میں وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ انکے نامعقول ذرائع معاش اب معدوم ہیں۔ وہ اچھے کسانوں کی طرح زمینی پیداوار پر گذارہ کرتے ہیں باغات بھی لگائے ہیں اور محنت کی کمائی کھاتے ہیں۔ مسلمانوں کی دینی برادری میں مساوات کے زرّیں اصول کے تحت تمام انسانی تعلقات میں اپنی زندگی کے لمحات نہایت خوشگواری کے ساتھ گذار رہے ہیں اور سماج میں انہوں نے اپنا واجبی مقام حاصل کر لیا ہے۔

مولینا مرحوم کو فن طب میں اُستادانہ مہارت تامہ حاصل تھی۔ علمی اور عملی دونوں صورتوں میں کامل دستگاہ رکھتے تھے آپ کے شاگردوں میں اچھے اچھے کامیاب اطباء گذرے ہیں اور اب بھی کچھ شاگرد موجود ہیں۔ علم طب کی تمام کتابیں بہت آسانی سے پڑھایا کرتے تھے۔ قانون شیخ الرئیس بو علی سینا اس فن میں ایک بڑی مشہور اور مغلق کتاب ہے۔ سوپور کے زمانۂ قیام میں آپکا قانون شیخ الرئیس کا درس بڑا معرکۃ الآراء ہوتا تھا۔ آپکے تلامذہ[1] کا بیان ہے کہ اس حلقۂ درس میں سوپور اور اسکے آس پاس کے پرانے کہنہ مشق اور ماہر بزرگ اطباء بھی کمال اشتیاق سے حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ہم نے پہلے بھی قانون شیخ کو درساً پڑھا ہے مگر مولینا کا درس تو کچھ اور ہی ہے اس سے تو فن طب کے حقائق و معارف کی ایسی نشاندہی ہوتی ہے۔ جو کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئی ہے۔ علاج معالجہ میں یہ کمال حاصل تھا کہ آپ کے لکھے ہوئے نسخے اثر میں تیر بہدف اور قیمت میں بہت سستے ہوا کرتے تھے۔

مولانا مرحوم ڈوگرہ حکومت کی قانونی پابندیوں سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ انجمن سازی اور تنظیموں کا قیام ریاست بھر میں ممنوع اور جرم عظیم تھا۔ تبلیغی پروگراموں کو پرامن اور قانونی حدود

---

[1] ہماری معلومات کے مطابق جناب حکیم غلام رسول شاہ صاحب سوپوری علم طب میں آپکے خاص شاگرد ہیں اور آپکا مطب بھی قصبہ بھر میں مشہور ہے۔ سوپور کے ہی مفتی غلام حسن صاحب جو کہ وہاں کے مفتی ہیں مولینا کے ہی شاگرد ہیں

کے اندر آگے بڑھانے میں انہوں نے ہمیشہ خداداد ذہانت و فراست سے کام لیا۔ ایک تبلیغی تنظیم کا نام "دفتر محافظت اسلام" رکھا۔ اس نام میں "انجمن" کا لفظ آیا ہی نہیں البتہ اسی تنظیم کے تحت علاقہ گمریز کا فتنۂ ارتداد نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ دبایا گیا اور بہت سارے تبلیغی اور اصلاحی کارنامے انجام دیئے گئے۔

دور دراز دیہاتوں میں فریضۂ نماز کی تبلیغ کے لئے ایک خاص تنظیم کی ضرورت تھی اسکا نام مولانا نے "**پیام انجمن تحفظ نماز و ستر مستورات**" تجویز کیا۔ گویا یہ تنظیم کوئی "انجمن" نہیں تھی بلکہ اس وجود میں آنے والی انجمن کا صرف "پیغام" تھا۔ اس تنظیم کو چلانے کا کام آپ نے اپنے ایک مخلص دوست مولانا آزاد قریشی مرحوم کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے دیہاتوں کا دورہ کیا اور عوام کو نماز کی اہمیت سمجھائی۔ اس زمانے میں دیہاتی عورتیں عام طور پر پاجامہ نہیں پہنتی تھیں اس تنظیم کے ذریعہ انکو پاجاموں کے استعمال کی ضرورت سے آگاہ کیا گیا۔ جس سے نماز اور ستر مستورات کا جگہ جگہ چرچا ہو گیا اور لوگ اس طرف مائل ہو گئے اور رفتہ رفتہ اس پر عامل بھی ہوتے گئے۔

سوپور میں مولانا کے علمی و سماجی کارنامے

مولٰنا مرحوم کے علمی کارنامے بہت اعلیٰ معیار کے تھے سنہ ۱۹۲۰ء سے ہی اپنی علمی زندگی میں انکا مستقل اور پسندیدہ خاطر مشغلہ علوم حدیث، تفسیر، فقہ، منطق، فلسفہ و ہیئت وغیرہ کی تدریس و تعلیم کا رہا انکی خواہش اپنے وطن میں بھی ایک دار العلوم قائم کرنے کی تھی۔ کیونکہ یہاں کے علمی انحطاط سے انکو بڑی تشویش اور پریشانی ہوتی تھی۔ چنانچہ بہت غور و فکر کے بعد انکو اس اہم ترین کام کیلئے سوپور کی سرزمین زرخیز نظر آئی اور انہوں نے وہاں کے مخیر اور علم دوست افراد کے تعاون سے "**انجمن معین الاسلام**" کی بنیاد ڈالی اور بہت سارے تشنگان علوم کی ایسی علمی پیاس بجھائی کہ اب تک بھی وہاں ان کے علمی افادات کے جیتے جاگتے نمونے موجود ہیں۔ مولانا کا ارادہ سوپور میں ایک معیاری دار العلوم قائم کرنیکا تھا مگر ان کی زندگی میں ان کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی البتہ ابتدائی ڈھانچہ تیار ہو گیا تھا۔ پھر دوسری اہم ذاتی اور قومی مصروفیات کی وجہ سے وہ خود

بھی اس طرف پوری توجہ نہیں دے سکے پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ اراکین انجمن کی مساعی جمیلہ سے انجمن کے تحت جدید مروجہ تعلیم کے کئی ادارے قوم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اور قوم کے ہونہار بچے اس انجمن کے تعلیمی اداروں میں اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو رہے ہیں۔

قیام سوپور کے ایام میں ایک دفعہ قصبہ کے ایک حصے میں ایسی ہولناک آگ لگی کہ کسی کو اپنے مکان کے حدود اربعہ کی شناخت بھی نہیں رہی۔ عدالتوں کے اندر مقدمات کی بھرمار ناگزیر تھی چنانچہ یہ سلسلہ ابتدائی منزلوں میں شروع بھی ہونے لگا تھا اب یہ بات یقینی طور پر سامنے آنے والی تھی کہ مقدمہ بازیوں میں برسوں لگ جاتے اور آتش زدگان کی مصیبتوں میں روز افزوں اضافہ ہو جاتا تمام مصیبت زدوں کے باہمی تعلقات بھی بری طرح بگڑ جاتے مگر مولانا مرحوم نے اس نازک ترین موقع پر "شرعی دار التحکیم" کے قیام کا اعلان فرمایا۔ اس اعلان کا تمام لوگوں نے خیر مقدم کیا اور مولینا کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کو یقین دلایا کہ شریعت کے فیصلوں کے سامنے ہم ہر حالت میں سر تسلیم خم کریں گے۔ چنانچہ "دار التحکیم" میں دعاوی پیش ہو گئے۔ مولانا نے دوسرے اہل علم کے تعاون سے ہر مدعی کے دلائل سنے اور ہر مدعا علیہ کو اپنے حق میں دلائل و شہادات پیش کرنیکا موقع دیا۔ ضرورت پڑنے پر خود بھی جائے واردات پر تشریف لے جاتے۔ اس طرح روپیہ کی بربادی کے بغیر تھوڑے دنوں میں ہر مقدمے کا فیصلہ صادر کیا۔ تعجب ہے کہ کسی کے دماغ میں بھی اپنے لئے ناانصافی یا ظلم و تعدی کا تصور بھی نہیں آیا۔ کسی کو ناکامی کا احساس بھی نہیں ہوا بلکہ باہمی ہمدردی اور مروت کے ساتھ جدید تعمیرات کا کام شروع ہوا اور متاثرین پھر اپنے اپنے گھروں میں آباد ہو گئے اور اپنا کاروبار چلانے لگے۔ یہ سب کچھ مولینا کی دوررس فقاہت اور حسنِ تدبر کا نتیجہ تھا۔

سوپور کی جامع مسجد اور عیدگاہ بھی مولانا مرحوم ہی کی زندہ یادگاریں ہیں۔ جامع مسجد کو اب سوپور کے مخیر مسلمانوں نے بڑی وسعت دی ہے اور دے رہے ہیں مگر اس کی پہلی تعمیر کا سہرا مولینا ہی کے سر ہے۔

مولینا مرحوم نے کچھ مدت بارہ مولہ میں بھی گذاری اور علمی و تبلیغی افادات سے وہاں کے لوگوں

کو بھی مالا مال فرمایا۔

شعر و سخن میں طبع آزمائی

مولینا مرحوم شعر و سخن میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ آپ کے عربی قصائد ہند و پاک کے علمی رسالوں میں چھپ بھی چکے ہیں۔ ان میں نعتیہ قصائد بھی شامل ہیں اور اپنے بزرگوں اور اساتذہ کرام کے مراثی بھی۔ ایک نعتیہ قصیدے کا ایک شعر یاد آتا ہے اسکو لکھ رہا ہوں۔

فِدًی لکَ نَفْسِی ثُمَّ اُمِّی وَوَالدِی
وَوُلدِی وَوَجْهِی ثُمَّ مَا اَتَجَمَّلُ

اپنے گرامی قدر استاد حضرت شاہ صاحب رح کا مرثیہ بھی عربی میں لکھا ہے جو نفحۃ العنبر میں چھپ بھی چکا ہے۔

فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ لاہور میں ایک مرتبہ کرفیو نافذ تھا اور ادھر ادھر چلنا پھرنا بہت دنوں تک مشکل ہو گیا تھا۔ اسی زمانے میں ایک طویل نظم "شب" کے عنوان سے فارسی میں لکھی ہے۔ انشاء اللہ ارادہ ہے کہ اس نظم کو ترجمہ و تشریح کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ کیا جائے گا۔

روحانی زندگی

مولانا مرحوم نے اپنے والد ماجد شیخ المشائخ میر سید شاہ مصطفیٰ اندرابی رح سے روحانی تربیت حاصل کی سلسلۂ قادریہ میں ان ہی سے بیعت ہوئے اور ان ہی کے خلفاء میں سے تھے۔ روحانی طور پر آپ سے بھی بہت لوگوں نے استفادہ کیا۔ سلسلۂ قادریہ کے علاوہ سلسلۂ کبرویہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ میں بھی اپنے ہی شیخ بزرگوار سے مستفید تھے۔ مشائخ ہند میں حضرت شاہ صاحب رح اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہما اللہ سے خاص طور پر سلسلۂ چشتیہ میں استفادہ کیا۔ مگر ہر دو بزرگوں نے پہلی ہی بیعت و خلافت کو کافی سمجھا اور تجدید کی ضرورت پر اتفاق نہیں کیا۔

(۴) سیاسی زندگی

مولانا مرحوم سیاست کے میدان میں بھی طالب علمی اور قیام ہند کے زمانے میں ہی کافی دلچسپی

لیتے تھے۔ اور چوٹی کے سیاسی رہنماؤں سے میل جول اور رابطہ قائم رکھتے تھے۔ دراصل متحدہ ہندوستان میں ہی آزادی کی تحریک چلی تھی اور اسکا بنیادی منبع بھی دار العلوم دیوبند ہی تھا بلکہ آزادیٔ ہند کی تحریک ابتداء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ شیخ الحدیث کی پیداوار ہے جس کی پاداش میں انگریزوں نے شیخ الہند اور انکے رفقائے کار خصوصاً مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد اور مولانا عزیز گل کو مدت تک مالٹا[1] جیل میں نظر بند رکھا تھا۔ اس لئے فضلائے دار العلوم کا سیاسی میدانوں میں کام کرنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی ہاں تحریکوں کی نوعیت ضرور مختلف ہوتی ہے مگر مقصد عموماً ایک ہوتا ہے۔ اور وہ لفظ "آزادی" میں ہی مضمر ہے اور آزادی کا مفہوم ہر سلیم الفطرت انسان کی روحانی غذا ہے کیونکہ آزادی بنی نوع انسان کا پیدائشی حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا سید میرک شاہ بھی مادر وطن کشمیر کے عوام کی غلامانہ زندگی سے بہت رنجیدہ اور مغموم رہتے تھے۔ غیر منقسم ہندوستان میں جب خلافت کی تحریک شروع ہوئی تو اس میں مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی وغیرہ سرکردہ رہنماؤں نے حصہ لیا۔ مولانا سید میرک شاہؒ نے بھی اس تحریک کو کشمیر میں شروع کیا اور اس کی قیادت بھی فرمائی۔ اس تحریک میں آپ کو مرحوم میرواعظ مولانا محمد یوسف شاہ صاحب کا سرگرم تعاون بھی حاصل رہا۔

یہ تحریک حریت کشمیر (۱۹۳۱ء) سے کوئی سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ اس تحریک میں آپ نے عوام کو اس جمود سے نکالنے کی کامیاب کوشش کی جو انکے دماغوں پر صدیوں سے مسلط تھا۔ عام اجتماعات میں تقریریں ہوئیں اور لوگ تحریک خلافت سے وابستہ ہونے لگے ان میں بیداری اور بیدار مغزی پیدا ہوئی۔ یہی اس تحریک کی عام مقبولیت کا اصلی راز تھا۔ اس بیداری اور شعور کی

---

[1] حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مالٹا جیل میں ہی قرآن مجید کا ترجمہ مکمل کیا اور چار یا پانچ پاروں کے حواشی بھی لکھے۔ باقی حواشی کی تکمیل ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے فرمائی۔ میں نے سنا ہے کہ مولانا حسین احمدؒ نے بھی اسی جیل میں قرآن شریف حفظ کیا ہے۔

بدولت ریاست کے لوگوں میں اس غلامی سے چھٹکارا پانے کی ہمت اور صلاحیت پیدا ہوئی جس میں وہ سینکڑوں برس سے مبتلا تھے گویا تحریک خلافت تحریک حریت (۱۹۳۱ء) کے لئے ایک اچھی ابتدا اور تمہید تھی۔ پھر جب ۱۹۳۱ء میں آزادیٔ کشمیر کی تحریک باضابطہ طور پر سامنے آئی تو مولانا مرحوم نے اس میں بھی قائدانہ رول ادا کیا اور دوسرے قائدین تحریک کے دوش بدوش اپنی علمی اور ذاتی مصروفیتوں کے باوجود ہر نازک موقع پر آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مصروف رہے تحریک چلانے والے اراکین خصوصاً شیر کشمیر اکثر مولانا کے پاس تشریف لاتے تھے اور ان سے مہمات تحریک کے بارے میں صلاح مشورہ کرتے تھے۔ تحریک آزادی زوروں پر تھی ڈوگرہ حکومت کی بوکھلاہٹ بھی نمایاں طور پر سامنے آرہی تھی چنانچہ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ آزادی کی تحریک نے انقلابی کروٹ لی۔ شمع آزادی کے پروانے دلیرانہ وار رہنمایان قوم کی ہدایات پر ہر قربانی دینے کے لئے بے تاب نظر آنے لگے اس سے لازمی طور پر تحریک حریت میں غیر معمولی سرگرمی پیدا ہوئی۔ ڈوگرہ حکومت تشدد پر اتر آئی اور شیر کشمیر اور دوسرے اہم کارکنوں کو قلعہ میں بند کر دیا۔ عوام پر ایسے مظالم روا رکھے کہ تحریک کی رفتار سست پڑنے لگی اور کوئی فرد بشر عوام کی ہمت افزائی کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ جو بھی والنٹیر سٹیج پر جانے کا ارادہ کرتا تھا اسکو وہاں پہونچنے سے پہلے ہی گرفتار کیا جاتا تھا۔ آزادی کی تڑپ اور مایوسی کے ملے جلے جذبات نے آزادی کے دلدادوں کو بے چین بنا دیا تھا۔ ایسے نازک ترین وقت میں مولانا سید میرک شاہؒ نے بچے کھچے کارکنوں سے مشورہ کر کے اعلان کرایا کہ "کل شاہی مسجد میں میرا وعظ ہوگا لوگ مقررہ وقت پر تشریف لائیں" اس اعلان سے لوگوں کی جان میں جان آئی اور شاہی مسجد کے وسیع صحن میں جوق در جوق کافی تعداد میں جمع ہو گئے۔ مولانا مرحوم نے کھڑے ہو کر خطبۂ مسنونہ کے بعد مذہبی رنگ میں ایسی برجستہ ولولہ انگیز تقریر فرمائی کہ سامعین کے دلوں میں سیاسی شعور نے ایسی انگڑائی لی کہ تمام پژمردہ دل جوش اور ولولہ سے لبریز ہو گئے۔ ان میں رہنماؤں کی گرفتاری اور ظلم و تشدد سے جو خوف و ہراس پیدا ہو گیا تھا مولانا کی ایک ہی تقریر سے ختم ہو گیا۔ اختتام تقریر پر آپ نے

اعلان کیا کہ کل بھی اسی وقت اسی مقام پر وعظ کی مجلس ہوگی چنانچہ دوسرے دن بھی عوام غیر معمولی جوش وخروش کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے اور مولانا کی تقریر ہمہ تن گوش ہوکر سنتے رہے۔ مولینا کی تقریروں کا سلسلہ پندرہ بیس دن تک جاری رہا۔ مولانا کی ان تقریروں سے لوگ اعلیٰ سیاسی بیداری کے انمول موتیوں سے مالامال ہوتے رہے۔ ان کے دلوں میں ایمانی جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ کچھ مدت کے بعد حکومت نے شیر کشمیر اور انکے رفقاء کو قلعہ کی جیل سے رہا کر دیا جب وہ قوم کے سامنے آگئے تو قوم کو زندہ دل۔ باشعور اور ہر قربانی کیلئے تیار پایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آزادی کی تحریک بالکل شباب پر ہے اس میں کوئی سستی نام کو بھی نہیں آئی ہے۔

شیر کشمیر وغیرہ کی یہ گرفتاری آزادی کی تاریخ کا ایک بڑا مایوس کن المیہ تھا جو مولانا مرحوم کی مخلصانہ اور دانشمندانہ قیادت سے آزادی کے دلدادوں کے لئے بجائے حوصلہ شکن مایوسی کے ایک حوصلہ افزا جذبۂ حریت بن کر سامنے آیا۔ اور شیر کشمیر کی قیادت میں لوگ پھر آزادی کی عملی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔

ڈوگرہ حکومت کی طرف سے مولانا مرحوم کے رہائشی مکان کا کئی مرتبہ محاصرہ کیا گیا اور بڑے پیمانے پر تلاشی لی گئی۔ سی، آئی، ڈی کے عملہ کی رپورٹوں میں مولانا مرحوم کی "زرد پیٹی" کا خاص طور پر تذکرہ ہوتا تھا اور اس "زرد پیٹی" کا سراغ لگانے میں متعلقہ عملہ سرگرداں رہتا تھا۔ اسی "زرد پیٹی" میں وہ اہم کاغذات ہوتے تھے جو مولانا کے قلم سے آزادیٔ کشمیر، اسکے طریقوں اور پروگراموں کے بارے میں زیب قرطاس ہوکر کارکنوں کے لئے دستور العمل اور رہبری کا کام دیتے تھے۔ مولینا مرحوم خرابیٔ صحت کے ایام میں بھی سیاسی میٹنگوں میں برابر شامل ہوتے تھے اور انکا ذاتی ملازم دوائی وغیرہ ساتھ رکھتا تھا اور صحت کے دنوں میں دن کے آرام اور رات کی نیند کا اکثر حصہ بھی تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں پوری لگن کے ساتھ صرف کرتے تھے۔

مولانا نے اپنی زندگی میں جو نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں برصغیر پاک وہند میں ان کے جاننے والے اب بھی موجود ہیں جو ان کے علمی تبحر اور سیاسی میدان میں

ان کی مخلصانہ بے لوث اور کامیاب جد و جہد سے واقف ہیں۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے وقت حضرت مولانا پاکستان میں ہی تشریف فرما تھے۔ اب آپ سیاست سے کنارہ کش ہو کر علمی مصروفیات میں دوبارہ منہمک ہوئے آپ اورینٹل کالج لاہور میں ایک ممتاز پروفیسر کی حیثیت سے مسند تدریس پر متمکن ہو گئے تھے لہذا لاہور میں ہی تشنگان علوم کو مستفید کرتے رہے اور وہیں قیام بھی فرمایا پاکستان کو ایک خالص اسلامی مملکت بنانے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ مرحوم خان لیاقت علی خان اور الحاج خواجہ ناظم الدین صاحب سے بھی ملے جنہوں نے آپکے سامنے اچھے اچھے اعلیٰ مناصب پر متمکن ہو کر کام کرنے کی پیشکش کی مگر آپ نے کوئی پیشکش قبول نہیں کی اور صاف کہدیا کہ خالص اسلامی مملکت میں ہی مجھے ایک ادنیٰ ملازم کی حیثیت سے بھی کام کرنے میں فخر محسوس ہوتا۔

آخری منصب شیخ الحدیث

عمر کے آخری دور میں آپ کی صحت بھی خراب ہونے لگی لہذا اورینٹل کالج کی خدمات کو ترک کر دیا اور سکھر (سندھ) میں احباب کے اصرار پر کوئی ڈیڑھ دو سال تک شیخ الحدیث کی حیثیت سے خالص دینی خدمات انجام دیتے رہے۔

صدر اوقاف بورڈ پنجاب

پاک پنجاب کی حکومت نے آپکو اوقاف بورڈ کا صدر بھی منتخب کیا یہاں بھی آپ نے نہایت خلوص اور دیانت داری سے کام کیا۔ آخر میں صحت بالکل خراب ہو گئی اور صاحب فراش ہو گئے اس حالت میں بھی علمی اور سیاسی حلقوں کو اپنے مفید مشوروں سے مستفید فرماتے رہے اور ضروری ہدایات دیتے رہے۔ بستری علالت بڑی طویل اور صبر آزما تھی آپ نے اس آزمائش کو بھی نہایت صبر و استقلال سے بمصداق ؎

ہر چہ از دوست میرسد نیکو است

خندہ پیشانی اور صبر و رضا کے ساتھ برداشت کیا۔

تصنیفات

مولانا مرحوم غیر منقسم اور منقسم ہندوستان میں بہت سے علمی اداروں کے اندر ممتاز مناصب پر کام کرتے رہے اس لیے سفر کے اکثر و بیشتر مواقع پر سامان کا لانا لیجانا ایک مشکل کام تھا خاص طور پر قیام پاکستان کے زمانے میں جو کہ آپ کی عمر کا آخری دور تھا اور لازمی طور پر صحت آہستہ آہستہ بگڑتی گئی اس لیے تصنیفات کی ترتیب کا نظام کبھی ٹھیک نہیں رہا۔ آپ نے خود اپنے قلم سے کچھ تصنیفات کی نشاندہی کی ہے۔ جو درج ذیل ہیں۔

نمبر شمار	نام کتاب	فن	زبان	کیفیت
۱	شرح موطاء امام مالکؒ	حدیث	عربی	
۲	ترجمۂ اسفار اربعہ سبزواریہ	فلسفہ	اردو	اس کتاب کے معتد بہ حصہ کا ترجمہ مرحوم نظام حیدرآباد (دکن) کی تجویز سے کیا گیا تھا اور چھپ چکا ہے۔
۳	عقیدۃ المحدثین فی حیوٰۃ النبیین	حدیث	اردو	
۴	شرح سبع معلقہ	ادب	عربی	
۵	ترجمہ اکفار الملحدین	کلام	اردو	
۶	نفع القاری والسامع	فقہ	اردو	یہ ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے اخبار میں چھپا تھا اسکے بعد اسکو کتابی شکل دی گئی۔
۷	شرح سلم العلوم	منطق	اردو	
۸	حاشیۂ محیط الدائرہ	عروض	عربی	
۹	اھنأ النجع	فقہ	اردو	
۱۰	رسالہ در تحقیق تعدد جمعہ	فقہ	اردو	
۱۱	رسالہ در حکم جماعت مرزائیہ	فقہ	عربی	
۱۲	رسالہ در تحقیق کدعہ	حدیث	عربی	
۱۳	رسالہ در تحقیق تناسخ	کلام	اردو	
۱۴	رسالہ در تحقیق سیادت انبیاءؑ	فقہ	عربی	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	زبان	کیفیت
۱۵	لغات جدیدہ	لغت	اردو عربی	
۱۶	رسالہ در تحقیق تثلیث۔	کلام	اردو	
۱۷	رسالہ در تحقیق طلاق	فقہ	اردو	
۱۸	شرح چہل کاف	ادب	عربی، اردو، فارسی	
۱۹	تحقیق تلفظ ضاد	فقہ و تجوید	اردو	
۲۰	شرح قصیدۂ بانت سعاد	ادب	فارسی	
۲۱	شرح قصیدۂ غوثیہ	ادب	فارسی	
۲۲	رسالہ در تحقیق حکم مفقود	فقہ	اردو	انکے علاوہ بھی کئی چھوٹے بڑے رسائل ہیں جنمیں کچھ چھپ چکے ہیں۔ اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔
۲۳	ترجمۂ کشف الاسرار	تصوف	اردو	
۲۴	ترجمۂ کشف المحجوب	تصوف	اردو	

آخری تصنیف

حضرت مولانا کی آخری تصنیف قرآن مجید کا کشمیری زبان میں ترجمہ[1] اور اسکے ساتھ اردو میں کچھ حواشی بھی ہیں۔ ترجمہ پہلو سیتوں سے دستیاب ہو چکا ہے آخری دو پاروں کا ترجمہ ابھی نہیں ملا ہے غالباً بوجہ علالت یہ دو پارے ترجمے رہ گئے ہیں۔ اردو حواشی بھی پورے نہیں مگر انہوں نے ایک مقام پر اپنے قلم سے لکھا ہے کہ تکمیل ترجمہ کے بعد حواشی لکھنے کا کام ہاتھ میں لونگا چونکہ تندرستی جواب دے چکی تھی اور عمر مستعار کے ایام ختم ہو رہے تھے اس لئے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ ہاں ستائیس پاروں کا ترجمہ دستیاب ہے۔ میں نے اپنی بے بضاعتی کے باوجود فی الحال الٓمٓ کا ترجمہ اور حواشی لکھنے کا کام ہاتھ میں لیا ہے۔ اللہ تعالے اسو مولینا مرحوم کے اس دینی کارنامے اور اپنی مادری زبان کشمیری"

---

[1] خاندان اندرابیہ میں پہلے بھی حضرت استاد العلماء علامہ میر سید سعید اندرابی رحمۃ اللہ علیہ قرآن مجید کی تفسیر بطرز جلالین عربی میں اور "ترجمۃ القادریہ" کے نام سے ۱۲۶۶ھ میں فارسی میں قرآن مجید کا ترجمہ لکھ چکے ہیں۔

کی بہ بلیش بہار خدمت اتمام کو پہونچائے۔

وطن آنے کا شوق اور وفات وغیرہ

مولینا مرحوم کو ہمیشہ اپنے وطن آنے کا خیال رہتا تھا (گو عارضی طور پر ہی سہی) مگر وقتی حکومتوں نے کبھی انکے لئے وطن آنے کی کوئی سہولت بہم نہیں پہونچائی اور عمر کے آخری ایام میں بھی مولانا کو اپنے وطن عزیز کو دیکھنے اور اسی میں عمر کے آخری لمحات گذارنے کا بہت شوق تھا۔ انتقال پرملال سے ایک دن پہلے آپ نے فرمایا کہ سواری لاؤ عرض کیا گیا کہ کہاں تشریف لیجا رہے ہیں! فرمایا کشمیر" بہر حال تقریباً چار سال تک بلڈ پریشر اور شوگر کے عارضہ سے صاحب فراش رہ کر جمعہ ۲۴ جمادی الثانی ۱۳۹۳ھ ۲۷ جولائی ۱۹۷۳ء ۹ بجے شب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مکان کے پڑوسیوں کا بیان ہے کہ وفات حسرت آیات کی رات کو ہمیں سفید وردی میں ملبوس انسان مکان کے ارد گرد اور صحن میں نظر آئے ہیں تعجب بھی ہوا اور ڈر بھی لگا ہم گھر سے باہر نکلنے کی ہمت کبھی نہ کر سکے۔

جنازہ

جنازے پر رواں تبصرہ لاہور ریڈیو سے بھی نشر ہوا اور جنازے میں مرکزی و صوبائی وزراء کے علاوہ اہل علم حضرات کی کافی تعداد بھی موجود تھی اور نماز جنازہ آپ کے مخلص و ہم وطن دوست حضرت مولانا بہاؤالحق صاحب قاسمی کشمیری نے پڑھائی۔ اور ماڈل ٹاون کے وسیع قبرستان میں علم و فضل کا یہ انمول خزانہ سپرد خاک کیا گیا ہے قبر کے ارد گرد مضبوط چار دیواری ہے مگر قبر مولینا ہی کی وصیت کے مطابق کچی بنائی گئی ہے۔ اور اسی کچی قبر میں پر وقار طریقہ سے محو آرام ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً کاملۃً عامۃً

تاریخ وفات

جناب خواجہ محمد امین صاحب دراب نے مع سال ولادت وفات اور عمر گرامی کی نشاندہی ایک ہی شعر میں کی ہے۔

۱۳۰۶ ۱۳۹۳
خاص خدائے زادہ و مردہ چراغ بزم علم
۸۷
زیست وفا دشد بریں ختم حیات مستعار

اور بھی دوسرے شعراء نے اپنے فکر طبع سے تاریخیں لکھی ہیں مگر بوجہ عدم گنجائش یہاں درج نہیں کی گئیں۔

★★★

مؤرخین

ڈاکٹر عبدالمجید متو

ملک حیدر چاڈورہ

پورے برصغیر ہند و پاک میں کشمیر کو اس بات کا فخر حاصل رہا ہے کہ یہاں زمانۂ قدیم سے فن تاریخ نویسی رائج تھا۔ کشمیر کی چھ ہزار سالہ مرقوم تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔ کلہن نے راج ترنگنی تصنیف کرنے سے اس فن کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ اس سلسلے کو شری ور کے علاوہ سوکھ پنڈت اور جونراج نے قائم رکھا اگرچہ اس زمانے میں اسلام کا دور دورہ ہو چکا تھا۔ مسلم مورخین نے اس فن کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اور بھی وسعت بخشی۔ تاہم بہت ساری تالیف کردہ تواریخ آج ہمیں میسّر نہیں ہیں۔ مگر سید علی، ملک حیدر اور بہارستان شاہی کے مؤلف اور محمد اعظم کے علاوہ زمانہ حاضر کے مشہور و معروف مؤرخ پیر حسن شاہ نے بھی اُن میں کئی ایک نسخوں کا استفادہ کیا ہے۔ تاریخ کشمیر ملک حیدر چاڈورہ کئی ایک کمزوریوں کے باوجود فارسی تواریخ میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اور اسی کتاب کی وجہ سے ملک حیدر آج بھی بحیثیت مورخ ہم میں زندہ ہیں نہ کہ بطور رئیس الملک وغیرہ۔

ملک حیدر کا آبائی مسکن موضع چاڈورہ تھا۔ آپکے والد کا نام ملک حسن تھا۔ اس خاندان کے افراد کو ہندو دور حکومت سے لیکر مغلیہ دور کے اواخر تک ملکی۔ سیاسی اور انتظامی امور میں بالواسطہ اور بلاواسطہ وابستگی رہی۔

ملک حیدر کا جد لام چندر راجہ سہہ دیو کا کمانڈر انچیف تھا۔ اس کی وفات سے لیکر ہمارے مُورخ کے زمانے تک ہمیشہ ملک اپنے کردار کو نمایاں طور سنبھالتے رہے۔ ملک حیدر کا دادا ملک محمد ناجی چک حکمرانوں کا مشیر خاص تھا۔ اگرچہ ملک حیدر نے اپنے دادا کے کارناموں کو

بیان کرتے وقت مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے[۱]۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک محمد ناجی ایک با اثر شخصیت کے مالک تھے۔ اور ان کی بالغ نظری اور جوانمردی کی وجہ سے بہت ساری اندرونی بغاوتوں کو فرد کیا گیا۔

ملک حیدر کا چھوٹا بھائی ملک علی ایک تجربہ کار جرنیل تھا۔ اس نے کئی کامیاب مہموں میں بھی حصہ لیا تھا۔ آپ نے بھی جلاوطنی میں اپنے بھائی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ علاوہ ازیں وہ ایک اعلیٰ پایہ کا انجینئر بھی تھا۔ مغل دور میں آپ نے پونچھ کشمیر راستے کو اپنی نگرانی میں تیار کروایا تھا[۲]۔ کشمیر کی مشہور و معروف مسجد پتھر مسجد بھی اسی کی زیر نگرانی تعمیر ہوئی تھی۔

ملک حیدر یوسف شاہ چک کا مشیر خاص تصور کیا جاتا تھا۔ اس نے یوسف شاہ چک کیساتھ زمانروائی کے دوران اور جلاوطنی کے ایام میں شانہ بشانہ کام کیا۔ پورے چوبیس ۲۴ سال تک آپ نے یوسف شاہ کا ساتھ دیا۔ اور مغلیہ سلطنت کی وسعتوں کی سیاحت کا بھی موقع میسر ہوا۔

اکبر کی موت کے بعد یوسف شاہ کو صوبہ بنگال میں ایک جاگیر عطا کی گئی تھی۔ وہیں پر ملک حیدر نے بھی بود و باش اختیار کیا تھا۔ اسی زمانے میں جہانگیر نے بنگال کے گورنر شیر افگن کی سرکوبی کے لئے قطب الدین خان کو روانہ کیا۔ ایک مختصر سی لڑائی میں شیر افگن کو قتل کیا گیا۔ اس واقعے کے ہوتے ہی ملک حیدر نے شیر افگن کی اہلیہ مہر النساء کو تحفظ دیا[۳]۔ مہر النساء جب شاہی حرم میں داخل ہوئی تو ملک حیدر کو اسکی وساطت سے چغتائی اور رئیس الملک کے خطابات سے نوازا گیا۔ اور کشمیر لوٹنے کی اجازت کے ساتھ یہاں کی زمینداری بھی عطا کی گئی[۴]۔ اس طرح ملک حیدر جلاوطن فرمانروا کی

---

[۱] MOHIBBUL HASAN, 'KASHMIR UNDER THE SULTANS' P.8

〃 ملک حیدر چاڈورہ، تاریخ کشمیر فولیو ۲۲۱ ۵ ب

[۲] ابو الحسن، جہانگیر نامہ صفحہ ۱۴۴

[۳، ۴] ملک حیدر چاڈورہ، تاریخ کشمیر، فولیو ۲۲۲ ب

موت کے بعد مغلوں کے زیر اثر آیا۔

اس منصب کے حاصل ہونے کے بعد ملک حیدر کو صوبہ کشمیر کے انتظامی امورات میں دخل اندازی کا موقع بھی میسر ہوا۔ مغل صوبیدار ملک حیدر کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے انکو وقتاً فوقتاً طرح طرح کی رعائتیں بھی دیتے رہتے تھے۔ کشتواڑ اور پونچھ کو زیرنگیں لانے کی مہموں میں ملک حیدر اور ملک علی نے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔[۱]

۱۶۲۲ء میں سرینگر کا ایک بہت بڑا علاقہ نذر آتش ہوا۔ اُس وقت مغل بادشاہ جہانگیر کشمیر میں خود بھی موجود تھا۔ اس نے شاہی سقوں کو ملک حیدر کی زیرنگرانی آگ بجھانے کیلئے روانہ کیا۔ آگ پر تو قابو کر لیا گیا۔ مگر اس آگ میں جامع مسجد بھی نذر آتش ہوئی۔ عوام میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ جامع مسجد ملک حیدر کی جان بوجھ کوتاہیوں کی وجہ سے نذر آتش ہوئی۔ جس وجہ سے عوام میں اسکے خلاف نفرت پیدا ہوئی۔ جہانگیر نے حالات کی نزاکت سمجھکر ملک حیدر کو فوراً جامع مسجد کو سرنو تعمیر کرنیکا حکم صادر کیا۔[۲]

مختصر ملک حیدر نے چک حکمرانوں کے عروج وزوال کے زمانے کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ جلاوطنی کے زمانے میں اسکو ہندوستان کی وسیع مغلیہ سلطنت کی پہنائیوں کی سیاحت کا موقع میسر بھی ہوا۔ طویل عرصہ وطن سے باہر رہنے کے بعد جب ملک اپنے وطن لوٹا تو یہاں اسکو ایک نئی سوسائیٹی دیکھنے کو ملی۔ یہاں کی سیاسی۔ سماجی اور انتظامی حالات بدل چکے تھے۔ کشمیر کی جنگجو اور سپاہیانہ صلاحیتیں رکھنے والے اقوام کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ پورا ملک ایک نئی سمت قدم بڑھانے لگا تھا۔ منظم قسم کے جاگیردارانہ نظام کی بنیادیں استوار ہورہی تھیں۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں ملک حیدر نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر تاریخ کشمیر

---

[۱] ملک حیدر چاڈورہ 'تاریخ کشمیر' فولیو ، ۱۴ ، ۱۲۱ ، ۱۵ ، ۲ ، ب

[۲] جامع مسجد کے جنوبی دروازے پر ایک کتبہ بھی اس واقع کی تصدیق کرتا ہے۔

تصنیف کی۔ ملک حیدر نے اس کام کو ۱۶۱۸ء میں شروع کیا اور کوئی دو سال سے زیادہ وقت صرف کر کے ۱۶۲۱ء میں مکمل کیا۔

تاریخ مذکورہ کو تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ حصہ اول قریب قریب راج ترنگی مصنفہ کلہن پنڈت کا فارسی ترجمہ ہے۔ جیسا کہ ملک حیدر نے اپنے ابتدائیہ میں اس بات کی وضاحت بھی کی ہے۔

دوسرا حصہ شاہ میری سلاطین کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ اس حصے کو مرتب کرتے وقت مؤرخ نے سنسکرت، فارسی اور مقامی روایات سے بخوبی استفادہ کیا ہے۔ اسی زمانے کی دو اہم تواریخ بہارستان شاہی اور تاریخ کشمیر مصنفہ حسن بن علی بھی ہمیں میسّر ہیں۔ ان دو ہم عصر نسخوں کے مطالعہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک حیدر کو بھی وہی ماخذ میسّر تھے جن سے متذکرہ صدر مؤرخین نے استفادہ کیا تھا۔ لیکن ملک حیدر نے اپنی میسّر خاندانی روایات سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ جیسے کہ پہلے ذکر آ چکا ہے ملک حیدر کے خاندان کا تعلق امراء سے تھا۔ اسلئے انکے خاندان میں عیاں طور کچھ Traditions بھی مروجہ تھیں۔ جن کی افادیت کی وجہ سے ملک حیدر شاہ میری خاندان کے واقعات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ علی الخصوص زین العابدین کے فرزندوں کی جانشینی کی جنگ اور مرزا حیدر دوغلت کی کارستانیوں کا مورخانہ تجزیہ کیا ہے

تیسرا اور اہم حصہ چک خاندان کا دور حکومت ہے، ملک حیدر بجائے خود اسی دور کے پیداوار ہیں۔ ملک کی زندگی اس خاندان کے عروج و زوال میں پروان چڑھی۔ اور حقیقت میں ملک حیدر بجائے خود اسی کا ایک حصہ ہے۔ لازمی طور ملک حیدر نے اس زمانے کے سیاسی سماجی، ملکی اور اقتصادی حالات کا ادیبانہ تجزیہ کیا۔ اس حصہ کے تجزیہ کے بعد آج کے تاریخ کے طالب علم کو ملک حیدر کی دوربین نظر۔ دور اندیشی۔ حب الوطنی اور پختہ کار مؤرخ ماننے ہیں ذرا بھر تامل نہیں ہوتا۔

اگرچہ ملک حیدر شیعہ مسلک کا پیرو کار تھا اور آپکے خاندان کی مالی اور سیاسی پشت پناہی

کی بدولت شیعہ مسلک عروج پا چکا تھا۔ مگر واقعات کو قلمبند کرتے وقت مؤرخ نے کسی قسم کی کمزوری کو حائل نہیں ہونے دیا۔

ملک حیدر نے بلا جھجک چک حکمرانوں کو عموماً اور یعقوب خان چک کو خاص طور کشمیر کی غلامی کا ذمہ وار ٹھہرایا ہے۔ اس نے ان کے تعصب اور مذہبی تنگ نظری کو حقارت کی نظر سے دیکھا ہے۔ مؤرخ نے یعقوب خان کو اس خاندان کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

اسی غیر جانبدارانہ طرزِ واقع نگاری نے ملک حیدر کو مؤرخوں کی صف میں ممتاز درجہ عطا کیا ہے۔

تاریخ کشمیر کا یہ آخری حصہ بہت ہی اہم ہے۔ مؤرخ خود چشم دید گواہ ہے۔ اور وہ خود کشمیر کی آزادی کو نیلام ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جس کے لئے امراء وقت کسی بھی قیمت پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ مگر اکبر اعظم کی عظمت و جلال نے یوسف شاہ چک کو خوف زدہ کیا تھا۔ اور وہ مغلوں کے سامنے سر جھکاتا ہے۔

اس اہم کشمکش کا نقشہ کھینچنے میں ہمارا مؤرخ بے حد کامیاب رہا ہے۔ مگر اپنی ۲۴ سالہ جلا وطنی اور مابعد کے واقعات کو بہت اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے

تاریخ ملک حیدر کی زبان بہت ہی سلیس اور سلجھی ہوئی ہے۔ وقتاً فوقتاً تلمیحات اور استعارات کا سہارا لیا ہے۔ واقعات کو واضح کرنے کیلئے۔ شعروں اور رباعیوں کا بھرپور فائیدہ اٹھایا ہے۔ جیوگرافیائی اصطلاحات۔ زمان و مکان اور دوسری مؤرخانہ باریکیوں کو وضاحت کے ساتھ رقم کیا ہے۔ تشکیل کو ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔

اس تاریخ کے چند ہی ایک نسخے میسر ہیں جو کہیں کہیں ایک دوسرے سے متضاد بھی ہیں محکمہ ریسرچ کا نسخہ مختصر سا ہے۔ مگر برٹش میوزیم کا نسخہ قریب قریب مکمل ہے۔ اور Bibliothie Nationale Paris میں موجود نسخہ غیر مربوط ہونے کے علاوہ واقعہ نگاری میں بھی دوسرے نسخوں سے متضاد ہے۔ * *

رشید اکرم بلی

عبدالوہاب شائق

کشمیر دنیا کا واحد خطہ ہے جو تقریباً پانچ ہزار [illegible] نی ایک مسلسل اور مستند تاریخ رکھتا ہے۔ یہ تاریخی مواد ہمیں انگریزی، فارسی، سنسکرت اور اردو وغیرہ کی تاریخوں اور دیگر تذکروں سے ملتا ہے۔

اگر کلہن سے پہلے بھی کچھ مصنفین ایسے گذرے ہیں جنہوں نے سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات پر کتابیں لکھی ہیں جن میں "رتناگر" کو بہت اہمیت حاصل ہے لیکن پھر بھی جو اہمیت "راج ترنگنی" کو حاصل ہے وہ اہمیت کسی اور تاریخی کتاب کو حاصل نہ ہو سکی، کلہن کی شہرۂ آفاق تاریخ "راج ترنگنی" کشمیر سے متعلق سب سے پرانی معتبر اور مستند تاریخ ہے اسی لئے کلہن کو مؤرخین کا ابو الآبا کہا جاتا ہے۔ تاکہ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ "بہارستانِ شاہی" از: سید محمد مہدی "تاریخ خواجہ اعظمی" از: محمد اعظم دیدہ مری "تاریخ فرشتہ" از: محمد قاسم "تاریخ کبیر" از: محی الدین مسکین "تاریخ کشمیر" از: پنڈت بیربل کاچرو "تاریخ کشمیر" از: حسن شاہ کھویہامی "تاریخ کشمیر" از: حیدر ملک چاڈورہ "منتخب التواریخ" از: نارائن کول عاجز "گوہر عالم" از محمد اسلم منعمی "گلدستہ کشمیر" از پنڈت ہرگوپال کول خستہ "تاریخ کشمیر" از: خواجہ حسن ملک۔ "اسرار الابرار" از بابا داؤد مشکواتی اور "تاریخ کشمیر" از: محمد الدین فوق وغیرہ تواریخ کسی کم اہمیت کی حامل نہیں۔

کشمیر نے مختلف زبانوں میں بڑے بڑے ادیب، بلند پایہ شاعر اور فلسفی، مصنّف اور محقّق، علما، حکما، اور مورخ پیدا کئے ہیں۔ جنہوں نے اپنی استعداد علمیہ سے نام پیدا کیا ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل کشمیر میں فارسی زبان کا بڑا چرچا تھا۔ فارسی زبان کو پھیلنے پھولنے اور ترقی کا سازگار ماحول میسر تھا۔ شاہمیری حکمران، سلطان سکندر، سلطان بڈشاہ زین العابدین مغل بادشاہ اور چک خاندان کے بادشاہوں کے دور حکومت میں اس پیاری زبان کو موافق حالات میں پرورش پانے کا سنہری موقع ہاتھ آیا۔ خود کشمیری بھی فارسی میں ہی لکھتے پڑھتے تھے۔ جو کچھ ادبی کام وجود میں آیا وہ فارسی میں ہی تھا۔ وقتاً فوقتاً بڑی بڑی علمی اور ادبی کتابوں کو فارسی زبان میں مرتب کیا گیا۔ اسوقت کے کچھ بڑے بڑے فارسی علمار و فضلا، نامور تاریخ دان اور مشہور شعرا میں ملّا احمد، ملّا غنی، ملا نادری، ملّا حسین غزنوی، ملّا ندیمی، ملّا فصیحی، ملّا جمیل، ملّا علی شیرازی، حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ، شیخ داؤد خاکیؒ، مرزا اکمل الدین بدخشیؒ، خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ، ملّا بہاؤالدین متو، ملّا حمید اللہ شاہ آبادی، فاتی، مظہری، سالم، اوجی، فروغی، نجمی، ملّا توفیق، لچھمن در سرور، نارائین داس خمیر، چندربان برہمن، بھوانی داس کاچرو، اور عبدالوہاب شائق وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آج سے لگ بھگ اڑھائی سو سال قبل خواجہ عبداللہ خان کو قتل کرنے کے بعد راجہ سکھ جیون مل کھتری ۱۱۷۶ھ میں کشمیر کا صوبیدار بنا۔ راجہ سکھ جیون، جہان خان (عالم گیر ثانی) کا نمک پروردہ تھا۔ اس نے مہانند پنڈت در کو ملک کا رئیس اور اپنا معتمد خاص بنا لیا۔ ابتدا میں سکھ جیون نے بڑے سلیقے اور عدل و انصاف سے حکومت کی۔ رعایا خوش تھی۔ سکھ جیون کافی سخن فہم اور سخی آدمی تھا۔ مسلمان علما و فضلائے اسلامیہ پر کافی مہربان اور انکا بڑا قدر دان تھا۔ خود بھی خوش طبع سخن فہم اور ایک اچھا شاعر تھا۔ اسکے دربار میں ہر وقت بڑے بڑے علمار اور شعرا موجود رہتے تھے جمعہ کے دن مسجد جامع میں حاضر ہوتا تھا۔ صبح سویرے مقبرے کی زیارت سے فائز ہوتا تھا۔ شعرا اور ادبار کے ساتھ علم و ادب پر بحث و مباحثے کرتا تھا۔ سنگوار کو مشاعرے منعقد کرتا تھا اکناف

واطراف سے شعراء آکر حاضر ہوتے تھے خود بھی مشاعروں میں شرکت کرتا تھا۔ عید اور نوروز کے جشن کمال شان و شوکت سے مناتا تھا۔ بڑے بڑے علماء کے ساتھ صحیح بخاری کا مطالعہ کرتا تھا۔ سکھ جیون کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز نہ برتا گیا۔ لیکن مہانند پنڈت در بڑا ہی متعصب آدمی تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ سکھ جیون ہندو مسلمانوں کو ایک ہی نظر سے دیکھ رہا ہے اور دونوں فرقوں کے ساتھ یکساں سلوک ہو رہا ہے اسکے بدن میں آگ لگ گئی وہ یہ زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا چنانچہ اس نے سکھ جیون کے کانوں میں مسلمانوں کے خلاف زہر بھر دیا راجہ نے مہانند پنڈت در کا مشورہ مان لیا اور اسی کی تحریک پر مسلمانوں کے ساتھ نامناسب اور بہت ہی برا سلوک کیا جانے لگا۔ مسلمانوں کی بے عزتی اور بے حرمتی ہونے لگی۔ ان کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی شروع ہو گی۔ مسجدوں میں اذان اور نماز پر پابندی لگادی گئی۔ گاؤ کشی کرنے والے کو سخت سزا کا مرتکب ٹھہرایا گیا۔ اس طرح مسلمانوں کو زبردست پریشان اور تنگ کیا گیا۔ چنانچہ احمد شاہ درانی نے جب یہ سارا ماجرا سنا اُس نے نورالدین خان بامزئی کی قیادت میں سکھ جیون کی سرکوبی کیلئے ایک بڑی فوج بھیجی۔ سکھ جیون کو میدان جنگ میں شکست ہوئی۔ گرفتار کر کے اسکو نورالدین خان کے پاس لایا گیا اور اس کے حکم سے سکھ جیون کی آنکھیں نکال دی گئیں۔ اسکے بعد اسکو ۱۷۶۵ء میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ جسوقت اسکی آنکھیں نکالی جا رہی تھیں اُس نے مندرجہ ذیل شعر کہے تھے۔

چشم از وضع جہاں پوشیدہ بہ — سر بسیر احوال آں دیدہ بہ
ہر کہ چوں من داشت جا بر فرق گل — عاقبت در خاک و خون غلطیدہ بہ

راجہ سکھ جیون نے کشمیر پر تقریباً ساڑھے آٹھ برس حکومت کی۔ لیکن یہ سارا وقت لڑائی جھگڑوں اور بیرونی حملہ آوروں کے ساتھ مقابلہ کرنے میں گذرا۔ وہ کوئی ایسا ادبی کارنامہ دنیا کے سامنے رکھنا چاہتا تھا جو اسکے بعد بطور یادگار رہتا۔ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کیلئے اس نے اپنے سات نامور شعراء محمد جان بیگ سامیؔ، رحمت اللہ بانڈے نویدؔ، مُلا ساطعؔ، متینؔ

حسنؔ[1]، ملا فضل محمد توفیقؔ اور ملا عبدالوہاب شائقؔ کو منتخب کر کے شاہنامہ فردوسی کی طرز پر شاہنامہ کشمیر (تاریخ کشمیر) فارسی نظم میں لکھوانے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے تاریخ کشمیر ابتدا سے اپنے دور حکومت تک لکھنے کیلئے مندرجہ بالا سات شعراء کو مامور کر دیا ہر ایک شاعر کو ایک ایک عہد (الگ الگ جزو) منظوم فارسی میں لکھنے کا حکم دیا گیا اور ہر نظم[2] کے ہر بیت کے لئے ایک ایک روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ راجہ سکھ جیون شاہنامہ کشمیر اپنی نگرانی اور سرپرستی میں لکھوا رہا تھا۔ ابھی اسکے چند ہی جزو تیار ہو گئے تھے کہ اسکو پیغام اجل آ پہنچا اور اسکا یہ منصوبہ ادھورا ہی رہ گیا۔ اس طرح شاہنامہ کشمیر مکمل نہ ہو سکا۔ "شاہنامہ کشمیر یا تاریخ کشمیر" لکھنے کے لئے جن سات نامور شعراء کو مامور کر دیا تھا۔ عبدالوہاب شائق کا نام ان میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

شائق شائقؔ کا اصلی نام ملا وہاب تھا۔ آپ ملا فیروز کے فرزند تھے۔ آج سے لگ بھگ تین سو سال قبل گنڈ و چھنہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ جب کشمیر تشریف لائے، آپکے ہمراہ کچھ سربرآوردہ بزرگ اور عالم تھے جو آپکے واپس لوٹنے کے باوجود یہاں ہی رہ گئے۔ ان سربرآوردہ بزرگوں میں میر حاجی قاری، سید جمال الدین عطائی، مولانا احمد سید کمال الدین، سید جمال الدین محدث، سید کمال الدین ثانی، سید فیروز، سید کاظم، سید رکن الدین

---

[1] "تاریخ کشمیر" مصنف حسن شاہ کھویہامی اور "تاریخ کشمیر" مصنف خواجہ حسن ملک میں شاعر حسن بھی سات منتخب شعراء میں شامل ہے۔ لیکن "کشمیر میں فارسی زبان کی تاریخ" مصنف پروفیسر عبدالقادر سروری میں شاعر حسن کا سات منتخب شعراء میں کہیں ذکر نہیں ہے بلکہ حسن کے بجائے ملا رفیع کا تذکرہ ہے۔ البتہ اتنا ذکر ہے کہ شاعر حسن بھی راجہ سکھ جیون کے دربار کا ایک نامور شاعر تھا۔ "تاریخ کشمیر" مصنف حیدر ملک چاڈورہ میں صرف ایسے پانچ شعراء کا ذکر ہے۔

[2] "کشمیر میں فارسی زبان کی تاریخ"، مصنف پروفیسر عبدالقادر سروری۔

سیّد فخرالدین، سیّد احمد قریشی، سیّد بہاؤالدین اور سیّد کبیر بیہقی کے نام قابل ذکر ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کے واپس جانے کے بعد سیّد احمد قریشی "گنڈ دچھنہ" چلے گئے۔ آپ کے ہمراہ ایک باکمال صوفی ملا میر بھی تھے۔ دونوں حضرات نے اسی گاؤں میں سکونت اختیار کی (یہ بھی[۱] کہا جاتا ہے کہ کشمیر آنے کے بعد سیّد احمد قریشی بیجبہاڑہ میں قیام پذیر ہوئے اور یہاں ایک بہت بڑی مسجد بھی تعمیر کرائی) گنڈ دچھنہ بانڈی پورہ سے پانچ کلومیٹر کی دوری پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اور سرینگر بانڈی پورہ راستے پر جھیل ولر کے کنارے واقع ہے۔ سیّد احمد قریشی جسوقت دچھنہ گاؤں میں پہنچے زین العابدین بڈشاہ اس وقت جھیل ولر میں زینہ لنک تعمیر کروا رہا تھا۔ گنڈ دچھنہ میں اسوقت کوئی آبادی نہ تھی۔ حضرت سیّد احمد قریشی کے اصرار پر ملّا میر نے شادی کی، ملّا فیروز والد بزرگوار عبدالوہاب شائق ملّا میر کی نسل سے ہیں۔ یہاں یہ لکھنا بے جا نہ ہوگا کہ ملہ[۲] احمد جو گنڈ دچھنہ میں رہتا ہے اور امامت اور زمینداری کرتا ہے اور جس کی عمر اس وقت ۸۵ سال کے قریب ہے اسکا کہنا ہے کہ وہ اسکا باپ ملہ سلطان، دادا ملہ ستار اور پڑدادا ملہ جمال، ملّا وہاب کی اولاد میں سے ہیں۔

گنڈ دچھنہ میں اسوقت بھی "ملہ ذات" کے لوگوں کی ہی اکثریت ہے یہ لوگ اپنے آپکو ملّا میر کی اولاد سمجھتے ہیں۔ حضرت سیّد احمد قریشیؒ کی زیارت یہاں موجود ہے اور انکا عرس ہر سال ماہ شعبان کی سترہ تاریخ کو دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ ملّا میر بھی اسی زیارت کے سامنے والے قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

بہرکیف! کسی تاریخی ثبوت کی عدم موجودگی میں وثوق کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا

---

[۱] "کشمیر میں فارسی زبان کی تاریخ" از:- پروفیسر عبدالقادر سروری

[۲] یہ مضمون لکھنے سے قبل راقم گنڈ دچھنہ چلا گیا۔ ملہ احمد نے جو کچھ اپنی ملاقات کے دوران بتایا وہ میں اوپر کی سطور میں درج کر رہا ہوں۔ گنڈ دچھنہ میں اور بھی کئی اصحاب سے ملا اور معلومات حاصل کیں

جا سکتا کہ آیا واقعی عبدالوہاب شائق، ملا میر کی اولاد سے ہیں یا نہیں اور کیا ملہ احمد کا شجرہ نسب واقعی عبدالوہاب شائق سے ملتا ہے ؛ لیکن جہاں تک آثار و قرائن، انسانی دماغ کے سوچ سمجھ، حالات کا تقاضا اور راقم کی تحقیق کا تعلق ہے تو پھر اس میں کوئی شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ عبدالوہاب شائق، ملاّ میر کی اولاد میں سے ہیں اور گنڈ وچھنہ میں موجود ملہ ذات کے لوگ ملاّ عبدالوہاب شائق کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ "ملاّ"، اب کشمیر میں ہر جگہ "ملہ" کہلاتا ہے۔

ملاّ فیروز کے والد بزرگوار عبدالوہاب شائق، پیر (ملاّ) خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اسلئے بچپن میں ہی اُن کو عربی اور فارسی کی تعلیم دی گئی۔ مرزا حیدرؒ[1] جیسے سرکردہ عالم کی صحبت میں رہ کر فیض پایا و سرشار ہوئے۔ قرآن شریف حفظ کر لیا۔ احادیث پاک کا مطالعہ جاری رکھا۔ اس کے باوجود کبھی جب ان کی علمی پیاس نہ بجھی تو حج بیت اللہ سے فیض یاب ہو کر آئے۔ اسکے بعد عالم دین کہلائے اور مفتی کشمیر ہو گئے۔ آپ کے شاگرد رشید یوسف الماس تھے۔ اپنے استاد کی صحبت میں رہ کر اسقدر کمال حاصل کیا کہ عارف کامل کہلائے۔ علم الیقین سے عین الیقین ہو گئے اور مفتی دوم بن گئے۔ کشمیر میں ان دنوں شیعہ سنی فساد زوروں پر تھا۔ لوٹ مار اور آتش زنی کا بازار گرم تھا سُنی و شیعہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ حسین شاہ چک کشمیر کا بادشاہ تھا وہ خود شیعہ عقیدے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ شیعہ فرقے سے ہمدردی رکھتا تھا اور سنی مسلمانوں کے تئیں اسکا رویہ غیر مناسب اور دشمنانہ تھا۔ اُس نے ہر دو مفتیان کشمیر ملاّ فیروز اور یوسف الماس کو شہید کرا دیا۔

تاریخ[2] شائق کے مندرجہ ذیل شعر سے پتہ چلتا ہے کہ جسوقت ملاّ فیروز والد بزرگوار،

---

[1] مرزا حیدرؒ سنی مسلمانوں کے سرکردہ عالم تھے۔ آپکا مقبرہ زینہ کدل (سرینگر) میں بڈشاہی ڈومٹھ کے بالکل قریب دریائے جہلم کے کنارے درخت کے سائے میں ہے

[2] "تاریخ شائق" مصنف عبدالوہاب شائق

عبدالوہاب شایقؔ کو شہید کر دیا گیا اسوقت ان کی عمر ستر سال سے زیادہ تھی۔

؎ فزون بود عمرش ز ہفتاد سال — چون ملائی فیروز گشتہ شہید

تاریخ شایقؔ میں اندراج حوالے کے مطابق ملا فیروز کوہ ماراں[1] پر مسجد سنگین[2] ملا شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے قریب دفن ہیں۔

ملا وہاب بچپن سے ہی بے حد ذہین اور شریف طبیعت کے مالک تھے۔ اپنے نامور عالم دین ملا فیروز سے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بچپن سے ہی صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند تھے۔ قرآن پاک اور احادیث شریف کے مطالعہ نے دل پر گہرا اثر چھوڑا۔ مسائلِ شریعت میں آپکو کافی عبور حاصل ہو گیا۔ چنانچہ آپ کی شہرت بہت جلد دور دور تک پہنچی۔ اور ملا وہاب کے بدلے آپکو ملا عبدالوہاب کے نام سے پکارا جانے لگا۔ ؎

بطفلی چو مرغوب نواب شُد — از آن نام او عبدالوہاب شُد

ملا عبدالوہاب کے آبا و اجداد کا پیشہ چونکہ پیر مریدی تھا۔ اسلئے آپ نے بھی اسی پیشے کو اختیار کیا۔ اور درویشانہ زندگی گذارنے لگے۔ کچھ وقت کیلئے اپنے ہی گاؤں میں امامت کرتے رہے اسکے بعد آپ راجہ سکھ جیون کے دربار میں پہنچ گئے۔ فارسی کے بہت بڑے شاعر اور عالم دین ہونے کے ناطے آپ نے شایقؔ کا تخلص اختیار کیا اور تب سے عبدالوہاب شایقؔ کے نام سے مشہور رہیں۔ اگرچہ راجہ سکھ جیون کے درباری شعراء میں ملا لعل محمد توفیقؔ کا نام سرِ فہرست

---

[1] قلعہ ہاری پربت کی پہاڑی کو کوہ ماران کہتے ہیں۔

[2] زیارت حضرت مخدوم صاحبؒ کے قریب جو مسجد شریف اس وقت غیر آباد ہے اور فن تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے یہ مسجد سنگین یا مسجد ملا شاہ رحمۃ اللہ علیہ کہلاتی ہے۔ اس مسجد شریف کو مسجد دارا شکوہ بھی کہتے ہیں۔ دارا شکوہ اور اسکی بہن جہاں آرا ملا شاہ کے عقیدتمندوں میں سے تھے۔ ملا شاہ ان ہی کے اصرار پر کشمیر آئے راقم ملا فیروز کے مقبرے پر خود بھی گیا یہ مقبرہ مسجد ملا شاہؒ کے اوپر کوہ ماراں پر حضرت مخدوم صاحبؒ کی زیارت کی اوپر والی مردانہ پارک کے باہر ہے۔

تھا اور بقول حسن شاہ کھویہامی ” مُلّا توفیق سر برآوردہ شعراء میں سے تھے اور ملک الشعراء ہوئے ۔ غنیؔ کے بعد وہ کشمیر کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں “ لیکن سکھ جیون کے دربار میں ایک بہت بڑے عالم، عظیم شاعر، باکمال بزرگ، ایماندار اور راست باز ہونے کی وجہ سے آپکو جس عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا وہ کسی اور شاعر کو نصیب نہ ہو سکی ۔ راجہ سکھ جیون کے ساتھ آپکو خاص مراسم تھے ۔

عبدالوہاب شائقؔ کی زندگی کے بقیہ ایام کس طرح گذرے ؟ اگرچہ اس بارے میں کافی کوشش کی گئی لیکن ابھی تک باوجود کافی کھوج اور تلاش کے کچھ معلوم نہ ہو سکا ۔ آپ نے کس عمر میں وفات پائی ؟ اسکے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ۔ البتہ آپ ملّا توفیق کے ہمعصر تھے ۔ ملّا توفیق نے ۱۱۹۷ھ میں وفات پائی ہے ۔ لہذا ایک حقیر اندازے کے مطابق آپ کا انتقال بارہویں صدی ہجری کے آخری سالوں میں ہوا ہے ۔ ” ریاض الاسلام “ ۱۱۷۷ھ میں مکمل ہوئی ۔ اس سے بھی یہی اندازہ صحیح ثابت ہوتا ہے ۔

عبدالوہاب شائقؔ نے موزون طبیعت پائی تھی ۔ انکی غزل میں اخلاق اور عرفان کی جھلک ملتی ہے ۔ راجہ سکھ جیون کے مجوزہ ” شاہنامہ کشمیر “ کے لئے انہوں نے سلطان العارفین اور ریشہ صوفی بزرگوں کے حالات میں مثنوی کا جو حصّہ مکمّل کیا تھا وہ ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے تاریخ گوئی میں بھی انہیں بڑا ملکہ تھا ۔ اسکے علاوہ تصوف، منطق اور معمّہ میں بھی کمال رکھتے تھے ان کی غزل کے دو اشعار یوں ہیں ۔

اعتمادِ ہستی موہومہ کردن ابلہی است
چو گذارد کس قدم بالائے ظلِ پل در آب

راستان را گر بزر اُلفت نباشد بہتر است
چوں الف با زر شود پیوستہ نقش آزر است

---

[1] ” کشمیر میں فارسی زبان کی تاریخ “ مصنف پروفیسر عبدالقادر سروری

عبدالوہاب شائقؔ نے تاریخ کشمیر کے لئے جو حصہ منظوم کیا تھا وہ تقریباً دس بارہ[1] سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر سطر میں دو، دو شعر لکھے گئے ہیں۔ ان کا نام انہوں نے "ریاض الاسلام" تجویز کیا ہے۔ سبب تالیف کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:-

> "سبب نظم کتاب مستطاب ریاض الاسلام و کیفیت مجلس شاعران راجہ فلک اقتدار گوگب احتشام و مشخص شدن نظم شاہنامہ کشمیری و تعین شاعران ارزوی تواریخ ارزہ ترنگ"

نظم میں شاعر نے اپنے اور اس سے قبل کے زمانے کی بہت تفصیلات لکھی ہیں۔ ابتدا میں سرور کائنات سرکار دو عالم حضرت محمدؐ عربی مصطفےٰ صلعم پر درود و سلام اور نذرانہ عقیدت کا اظہار نہایت ہی اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ معراج شریف کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسکے علاوہ کشمیر میں آغاز اسلام اور خاص طور پر حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ حضرت شرف الدین بلبل شاہ، میر سید علی ہمدانیؒ انکے رفقاء اور دوسرے بزرگوں کا حال تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ ایسے بزرگوں کے حالات نظم کرتے ہوئے شائقؔ نے کسی کسی جگہ انکے کلام کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یہ تفصیل رکن اول سے متعلق ہے۔ رکن دوم میں ریشیوں کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ نظم کے بیچ میں کسی کسی جگہ کچھ حکائیتیں نثر میں لکھی گئی ہیں۔ ملک سیف الدین کے ایک قاتل کے مجرم کا پتہ لگانے کی حکایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> "ملک بفراست دریافت و او را طلبانید و باو گفت ای مرد را چرا کشتہ؟ او انکار نمود بوز سود تا کار دار از کمرش کشیدند، خون آلود بود۔ آخر و گفت کہ برائی مہمانی باین کارد مرغی کشتہ ام۔ ملک کسان را بخانہ اش فرستاد، تحقیق کردند نہ مہمانی داشت نہ مرغی کشتہ بود ....."

---

[1] "کشمیر میں فارسی زبان کی تاریخ" مصنف پروفیسر عبدالقادر سروری

چک بادشاہوں کے وقت سُنی و شعیہ فساد کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

"حکومت چکاں در کشمیر جنت نظیر بمنصہ ظہور جلوہ گر گشتہ و کیفیت اختلاف مذاہب اہل تشیع و ارباب سنت و جماعت و محاربہ نمودن اُمرای سنی و شیعہ بایکدیگر حقیقت نسل چکان"

اسکے علاوہ زین العابدین بڈشاہ۔ چک خاندان کے بادشاہوں۔ جلال الدین اکبر کے ہاتھوں یوسف شاہ چک کی گرفتاری وغیرہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

تواریخ[۱] سیّد مہدی، خواجہ محمّد اعظم دیدہ مری، نرائن کول عاجز، محمّد اسلم منعمی اور رشید ملک چاڈورہ میں ملکہ کشمیر حبّہ خاتون کا کہیں کوئی تذکرہ نہ ملتا ہے۔ البتہ عبدالوہاب شائق کی تاریخ میں ملکہ حبّہ خاتون کا ذکر ان اشعار میں کیا گیا ہے:۔

؎ چو بوزہ است خاتون حبّہ بنام   یکی عارفہ بود صاحب مقام
سخن ہائے خوش داشت آں نغمہ سنج   بادشاہ صید او ہر روز کنج
کلامش بہ سوز و گداز آشنا   ہمی داد با مُردہ جان از نوا
سخن ہائے او پیش کشمیریاں   بود مشتہر زاں مکرو و بیان

صفت کشمیر کے عنوان سے شائق نے بہت کچھ لکھا ہے چند اشعار درج ذیل ہیں:۔

؎ مرا باد بوی بہار آمدہ   شمیم سرکوی یار آمدہ
دلم باز چوں غنچہ گل شگفت   دماغم ز کیفیت مل شگفت
نسیمی ز جنت ذریدہ دگر   شمیمی مرا ہوش بردہ سر
شنو وصف کشمیر جنت سرشت   کہ در چار فصل است روی بہشت
ہمہ سال باشد ہوا معتدل   نوای عنادل بجوشد ز دل
بہارش بہار و خزاں ہم بہار   بہار بہار است و خرم بہار

آگے کشمیر کے پھولوں، اشجار، ثمر، آبشاروں، جھیلوں، دریاؤں اور دوسری اہم خصوصیات

۱؎ کاشر ادبچ تاریخ جلد ۱ گوڈ ص ۱۳۷ مصنف اوتار کرشن رہبر

کا ذکر کیا ہے۔ کشمیر کے حسن اور خوبصورتی کو بیان کرتے ہوئے شائق نے فارسی اساتذہ کے وہ اشعار بھی لکھ دیئے ہیں جو کشمیر کی تعریف میں کہے گئے ہیں۔

عبدالوہاب شائق کے مندرجہ ذیل شعر سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ تاریخ شائق لکھنے کا کام سال سنہ ۱۱۷۴ھ میں شروع ہو گیا۔

ع ہزار و صد و سال ہفتاد و چار شد از ہجر پیغمبرِ کردگار

اور "ریاض الاسلام" سنہ ۱۱ھ میں مکمل ہوئی۔

عبدالوہاب شائق نے رسالہ "تعریف فی التصوف" اور "شرح مواقف" بھی لکھے ہیں اسکے علاوہ "شرح شمسیہ منطق" پر حاشئے بھی لکھے ہیں۔

تاریخ شائق جو شاہنامہ کشمیر کا ایک حصہ ہے وہ دنیائے ادب و تاریخ کا ایک عظیم شاہنامہ ہے اس معرکۃ الآرا تصنیف نے فاضل مصنف کی عظمت اور شہرت کو چار چاند لگا دئے اور اُسے زندہ جاوید بنا دیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کلچرل اکادمی کی لائبریری میں کتاب نمبر ۳۰ اور ۱۳۱ کی صورت میں موجود ہے۔ لیکن یہ قلمی نسخہ بھی مکمل نہیں ہے۔ تاریخ شائق کے کچھ اجزاء مختلف گھرانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ غرض عبدالوہاب شائق کے عظیم الشان رتبہ، بلند مرتبہ اور ادبی شخصیت سے بہت کم حضرات واقف ہیں۔ انکو بڑے بڑے تواریخ دانوں اور مشہور و معروف شاعروں اور عارفوں پر فوقیت حاصل ہے۔

"تاریخ شائق" کو آپ نے بڑی محنت، لگن، ہمت اور علمی بصیرت سے تیار کر کے اپنے خون جگر سے کتابی صورت بخشی، عوامی ادب کے اس بیش قیمت اور نادر نمونے نے آپکو نہ ختم ہونے والی شہرت عطا کی۔ آپ بلا مبالغہ ایک عظیم شاعر، اعلےٰ پائے کے محقق اور صف اوّل کے مؤرخ ہیں۔

◯

وُزراء

ارجن دیو مجبور

شری بھٹ

شری بھٹ کی زندگی کے کارناموں کا جائزہ لینے سے قبل کشمیر کے نادر تاریخ ساز بادشاہ بڈشاہ کا ذکر کافی اہم ہے کیونکہ اگر زین العابدین جیسا بادشاہ شری بھٹ کی خوبیوں کو بھانپنے والا نہ ہوتا تو شری بھٹ اپنی قابلیتوں اور قوتوں کو پروان چڑھا نہ پاتے۔ جے۔ پی۔ فرگوسن نے بڈشاہ کے بارے میں لکھتے ہوئے کہا ہے کہ بے شک تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کم ملینگی جہاں بیٹے نے باپ کی پالیسیوں کو اسطرح یکسر بدل کر رکھ دیا ہو جیسے زین العابدین نے سلطان سکندر کی۔ یہ بات ایک بیان ہی نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ کشمیر کی تاریخ میں بڈشاہ کا دور ایک تمدنی احیائے نو کی حیثیت رکھتا ہے۔

بڈشاہ کا دور تعلیم، فنون لطیفہ، صنعت و حرفت، تمدنی تال میل مذہبی رواداری اور ترقی و خوشحالی کا دور مانا جاتا ہے۔ تمدنی تال میل کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے Comprehensive History of India حصہ پنجم میں محمد حبیب اور خالق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ زین العابدین کا "عام تعلیم" اور قومی یکجہتی والے تمدن کے سلسلے میں اہم حصہ تھا مادری زبان میں تعلیم کو عام کرنیکا جذبہ بڈشاہ کے اسی جذبے کا غماز تھا کہ ہندو اور مسلم تمدنوں کے درمیان ربط و مفاہمت تب ہی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ جب ہندوؤں کی ہر دلعزیز تصانیف کو فارسی میں اور اسی طرح مسلم تصانیف کو سنسکرت اور کشمیری میں ترجمہ کیا جائے اس لئے اس نے ہر فن مولا اور متبحر عالم ملا احمد کو مہا بھارت

دشس اوتار، اور کلہن کی راج ترنگنی کا فارسی ترجمہ کروانے پر مامور کیا۔ اسی طرح سوم پنڈت نے زینہ پرکاشس، کا ترجمہ کشمیری نظم اور بھٹ اوتار جس نے فردوسی کے شاہنامہ کا مطالعہ کیا تھا، "زینہ ولاس" یعنی تاریخ کشمیر کو فارسی لازم ناموں کے نمونے پر تحریر کیا۔ جون راج نے کلہن کی راج ترنگنی کو ۵۸ لہ تک مکمل کرلیا۔

بڈشاہ کے انسان دوست عزائم کو، شری بھٹ کی شخصیت، فراست، قابلیت اور ایثار نے بلتیں یہ کام تکمیل تک پہنچانے میں بڑی مدد دی،

شری این، کے، رتشی، سلطان زین العابدین آف کشمیر میں جونراج کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بڈشاہ کے بازو میں ایک خوفناک پھوڑا نکل آیا اور اسکے ٹھیک ہونیکا کوئی امکان نظر نہ آیا۔ آخر سرکاری حکام اتفاقیہ طور پر ایک خوفزدہ طبیب جس کا نام شری بھٹ تھا کی خدمات اس شرط پر حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے کہ اس کے جسم و جان کی حفاظت کی جائے گی۔ اس برہمن طبیب نے کامیابی سے بادشاہ کا علاج کیا اور بڈشاہ کی صحت بحال ہوئی۔ بادشاہ نے شری بھٹ کی خدمات کے پیش نظر انہیں کافی دولت پیش کی لیکن شری بھٹ نے اسی طرح یہ دولت لینے سے انکار کیا جس طرح جذبات پر قابو یافتہ شخص خوبصورت عورتوں کی طرف دیکھتا تک نہیں۔ شری بھٹ نے دولت اور عطیہ لینے سے کیوں انکار کیا اسکی صاف وجوہات جونراج کی تاریخ میں درج نہیں لیکن فارسی تواریخ کی روشنی میں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ شری بھٹ نے انعام واکرام کے بدلے ہندوؤں کو پھر سے لبسانے کی استدعا کی جسے بادشاہ نے منظور کیا اور شری بھٹ کے ہاتھوں اس کام کی تکمیل ہوئی۔

اس طرح شری بھٹ نے اپنی قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے بڈشاہ کا اعتماد حاصل کیا اور کشمیر میں ہندوؤں کے مسمار شدہ مندروں کی بحالی، ہندوؤں کو مذہبی تعلیم دینے کیل سکول کھولنے کی آزادی، جزیہ کی بھاری کمی اور انہیں نوکریوں میں مناسب نمائندگی دلوا کی اجازت حاصل کی۔ اس طرح ہندوؤں میں خوف و ہراس کا خاتمہ ہوا اور وہ ملکی تعمیر

برابر کا حصہ ادا کرنے لگے۔ شری بھٹ کی جائے پیدائش اور اُن کی تاریخ پیدائش کے بارے میں مختلف تواریخوں میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ ان کی وفات ۱۴۵۹ عیسوی میں یعنی بڈشاہ کی وفات سے گیارہ سال قبل ہوئی۔ لیکن شری بھٹ نے جو کارہائے نمایاں ادا کئے اور بڈشاہ نے جس فراخدلی سے انکی تمناؤں اور قابلیتوں کی آبیاری کی اس کا تذکرہ ہمیں جگہ جگہ ملتا ہے۔

شری بھٹ بحیثیت وزیر

شری این، کے، زتشی کے مطابق شری بھٹ کو بڈشاہ کا اعتماد حاصل کرنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا اس کی وجہ یہ تھی کہ شری بھٹ بڈشاہ کا فدائی تھا۔ جسکا مظاہرہ شری بھٹ نے نقدی عطیات کے صاف انکار سے کیا۔ اور اس طرح وہ بڈشاہ کے دربار کا بااعتماد وزیر منتخب ہوا۔ چنانچہ بادشاہ ہر اہم معاملے میں اس کی صلاح لیتا تھا۔ اور اس صلاح پر عمل کرتا تھا چنانچہ اُس نے سلطان کی سرپرستی میں مختلف علاقوں میں مٹھوں کی تعمیر کا کام سرانجام دیا۔ تِلک آچاریہ (بودھ) شری بھٹ (براہمن) اور دریا خان (مُسلم) یہ تینوں بڈشاہ کے دربار کے بااثر وزرا تھے۔ شری بھٹ کی نگرانی میں ہندو سادھوؤں اور بودھ بھکشوؤں کیلئے بے شمار مٹھ اور وِہار تعمیر کئے گئے۔ کشمیر کے ہر پرگنے میں بڑے بڑے مٹھ تعمیر کئے گئے۔

دھرم ادھیکار کا عہدہ سلطان سکندر کے عہد میں قاضی اور شیخ الاسلام کے قبضے میں آگیا تھا لیکن جونراج کے مطابق بڈشاہ کے دور میں یہ عہدہ شری بھٹ کو تفویض کیا گیا۔ وہ نہ صرف عدالتِ انصاف کی نگرانی کرتا تھا بلکہ مقدموں کی سماعت بھی کرتا تھا۔ اور بحیثیت شاہی کونسل کے ایک رُکن کے سلطنت کی اعلیٰ عدالت کی کاروائیوں میں بھی شریک ہوتا شری بھٹ بادشاہ کے خاص معتمدوں میں سے تھا جس کے ساتھ بادشاہ ہندوؤں کے قانونی اور مذہبی معاملات پر مشورہ کرتا تھا۔ اس طرح شری بھٹ نے شاہی اعتماد کی بنا پر اپنی

برادری کا درجہ بھی بلند کیا اور عوام کو صحیح انصاف بھی دیتا رہا۔

شری بھٹ نے نہ صرف بادشاہ کا کامیابی کے ساتھ علاج کیا بلکہ وہ اپنے زمانے میں ادویات کا بے مثال عالم تھا۔ چنانچہ اپنی ذہانت اور بادشاہ کی حوصلہ افزائی سے اس نے اس علم کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس زمانے میں آیورویدک اور یونانی طریقہ علاج دونوں رائج تھے۔ اس سے شری بھٹ کی ذہنی قوتوں کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک وزیر اور صلاح کار ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں علم طب کیلئے رغبت اور صلاحیت ہی موجود نہ تھی بلکہ وہ اس علم کا عالم بھی تھا اور اس میدان میں وہ ترقی کی راہیں سر کرنے کیلئے سرگرداں رہتا تھا۔

مارتنڈ کنال کی تعمیر بھی شری بھٹ کی نگرانی میں پایہ تکمیل کو پہنچی اس کا تذکرہ جونراج کی تاریخ میں ملتا ہے۔ جس سے شری بھٹ کی قابلیتوں کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک پختہ کار انجینئر تھے۔ کیونکہ مارتنڈ کنال جسے کشمیری میں "شاہ کول" بھی کہتے ہیں کافی بلندی پر پہاڑوں کے دلوں کو چیرتی ہوئی گذرتی ہے اور بے شمار زمینوں کو سیراب کرتی ہے۔ یہ نہر بڈشاہی دور میں تعمیر شدہ کاکاپور نہر، چکدر نہر کرال نہر، اونتی پور نہر، شاہ کول (صفاپور) نہر، زینہ گنگا، لال کول نہر اور نالہ مار جیسی اہم نہروں میں شامل ہے۔

محب الحسن "Kashmir Under Sultans" میں شری بھٹ کا نام شِو بھٹ درج کرتا ہے شاید انہیں بجے اسی دتا کے جونراج کی تاریخ کے ترجمے سے نام کی غلطی ہوئی ہے یا پھر کوئی اور وجہ ہو جو بہر حال تاریخی تسامح ہے۔

شری بھٹ کی وفات سے بڈشاہ کو انتہائی دکھ ہوا۔ چنانچہ اس کی وفات پر بڈشاہ جیا بھٹ کے ذریعے شری بھٹ کے فرزندوں میں ایک کروڑ دینار کی گراں قدر رقم تقسیم کرواتا ہے۔ بڈشاہ کو آخری عمر میں جن رفیقوں، وزیروں اور رشتہ داروں کی جدائی نے ستایا۔ انہیں اس کا چھوٹا بھائی محمد اس کے وزراء اور درباری شری بھٹ دریا خان، میر

خوشس احمد اس کی بہن کالڑ کا قیام الدین اور اس کی تین بیویاں شامل ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ شری بھٹ کی جدائی کا اسے کتنا دکھ تھا۔ یہ بات اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ شری بھٹ کا خلوص، اس کا ایثار، اس کی ہمہ پہلو قابلیت اور اس کی انصاف پسندی نے بادشاہ کے دل میں جگہ پالی تھی۔

سنہ ۱۴۵۹ عیسوی میں کشمیر کا وہ بلند خصلت اور نیک کردار ستارہ غروب ہوتا ہے جس نے ہندو بودھ اور مسلم تمدنوں کے اشتراک سے کشمیر کے بیش بہا تمدن کی آبیاری کی اور اس تمدن کو تعصب، جہالت اور تنگ نظری کی آندھیوں سے بچا کر پروان چڑھایا اور اس کے عوض اس نے ذاتی جاہ وجلال، حشمت اور دولت کو کنکوا کی طرح ٹھوکر لگا کر آنے والی نسلوں کے لئے ایک ایسی شاہراہ تعمیر کی جس پر آج بھی کشمیر کی تہذیب اور تمدن ناز کر سکتی ہے۔ سیکولرازم کا علمبردار شری بھٹ نہ صرف تحقیق کا موضوع ہے بلکہ دلیش بھگتی کا وہ مجسمہ ہے جو ہماری نئی نسلوں کیلئے راہیں روشن کرتا رہیگا۔

محمد امین رفیقی

سید مبارک خان بیہقیؒ

حضرت سید شرف الدین عبدالرحمان الملقب بہ بلبل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قریباً ساٹھ سال بعد حضرت میر سید علی الہمدانی قدس اللہ سرہٗ اور انکے فرزند ارجمند حضرت میر محمد ہمدانیؒ قدس اللہ سرہٗ یکے بعد دیگرے علماء و مبلغین کی ایک کثیر جماعت کے ہمراہ بغرض اشاعت اسلام و تبلیغ دینِ متین وارد کشمیر ہوئے۔ ان کے ہمراہ ساداتِ بیہقی کا ایک شخص سید محمد بیہقی نامی تھا۔ سید محمدؒ موضع بیہق علاقہ خراسان کا رہنے والا تھا۔ یہ بیہق سے ختلان بغرض تلاش مرشد کامل گیا تھا وہاں حضرت امیر کبیر میر سید علی الہمدانیؒ سے دست بیعت کی اور حضرت امیرؒ کے زمرہ خلفاء میں شامل ہو کر اپنے مرشد کامل کی خدمت میں رہنے لگا اور بیہقی نسبت سے پکارا جانے لگا۔ جب حضرت امیر وادی کشمیر میں بغرض تبلیغ آئے تو یہ شخص بھی انکے ہمرکاب تھا۔ سید محمد بیہقیؒ ایک جید عالم بلند مرتبہ متقی اور صالح ہونے کے علاوہ اعلےٰ پایہ کا سیاست دان بھی تھا۔ یہاں آکر یہ تبلیغ دین اسلام میں ہمہ تن مصروف رہا اس کے زہد و تقویٰ کو دیکھ کر بادشاہ وقت سلطان سکندر بھی اسکا معتقد ہوا۔ سید محمد بیہقیؒ کا ایک بیٹا سید ناصر بیہقی اور ایک بیٹی مخدومہ خاتون نامی تھی بادشاہ نے مخدومہ خاتون کا نکاح اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ شاہی خان سے کیا جو کہ بعد میں سلطان زین العابدین کے نام سے مشہور ہوا۔

خاندان بیہقی کی شاہمیر خاندان سے یہ پہلی قرابت تھی۔ مخدومہ خاتون یعنی بیہقی بیگم کے بطن سے سلطان زین العابدین کی ایک بیٹی تھی اس کا نکاح سید ناصر بیہقی کے بیٹے سید حسن بیہقی سے ہوا ان رشتوں سے بیہقی خاندان شاہی خاندان کے بالکل نزدیک آیا اور امور مملکت میں بیہقی ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ اور ملک میں ان کا اقتدار روز بروز بڑھنے لگا۔

۸۷۰ھ مطابق ۱۴۶۵ء میں بیہقی بیگم کا انتقال ہوا اس کا مقبرہ مزار کلاں میں ہے ۔ قبر پر یہ کتبہ تحریر ہے

؎ وفات مخدومہ خاتون   کہ سال ہشتصد و ہفتاد بگذشت

سید حسن بیہقی کا بیٹا سید محمد بیہقی سلطان محمد شاہ کا سپہ سالار تھا اور ایک بیٹی تھی جسکا نام حیات خاتون تھا سید محمد بیہقی کے تین بیٹے تھے ۔ سید مرتضٰے ، سید یعقوب اور سید ابراہیم ۔ سید ابراہیم باپ کے بعد سلطان محمد شاہ اور سلطان فتح شاہ کا وزیر اعظم تھا ۔ سید ابراہیم کا بیٹا سید مبارک خان بیہقی تھا ۔ سید مبارک بیہقی کو شاہی دربار سے خان کا خطاب ملا تھا اسی وجہ سے اس کے نام کے ساتھ لفظ خان لکھا جاتا ہے ۔

۱۵۵۵ء میں غازی چک نے اپنے داماد حبیب شاہ کو جو کہ خاندان شاہمیر کا ۱۹ واں فرمان روا تھا تخت شاہی سے برطرف کیا اور خود تخت نشین ہوا اس طرح ۲۱۶ سالہ شاہمیری حکمران خاندان کا چراغِ شاہی گل ہوا اور کشمیر میں چک دور کا آغاز شروع ہوا ۔ چکوں کا مورث اعلے لنکر چک زردستان سے ہجرت کر کے کشمیر آیا اس کے دو بیٹے تھے ۔ حُسین چک اور ہلمت چک ۔ حسین چک شیعہ عقاید کا پیرو تھا مگر ہلمت چک سُنی عقاید پر ہی مستحکم رہا ۔ یہ چک فرقہ کپوارہ کا مورث اعلے ہے اس وقت اسی کی ذریت چک کے بجائے ملک کہلاتے ہیں ۔ حُسین چک کے تین بیٹے تازی چک ، کاجی چک ، حسن چک اور ایک بیٹی صالحہ خاتون تھی ۔ اسکا نکاح سلاطین شاہمیر کے گیارہ ویں فرمانروا محمد شاہ سے ہوا تھا ۔ تاریخ میں یہ نیک خاتون صالحہ موجی کے نام سے یاد کی جاتی ہے ۔ حُسین چک جوانی میں ہی فوت ہوا اسکے مرنے کے بعد اسکا ایک بیٹا غازی چک پیدا ہوا غازی چک کی ماں نے حسین چک کے مرنے کے بعد کاجی چک سے شادی کی اس کے پشت سے اسکو سات بچے پیدا ہوئے ۔ شنکر چک ، ابدال چک ، علی شاہ ، حسین شاہ ، مسعود چک ، محمد چک اور ایک بیٹی اس کا نکاح خاندان شاہمیر کے ۱۶ ویں فرمانبروا سلطان اسماعیل شاہ سے کیا تھا ۔ اسی کے بطن سے حبیب شاہ پیدا ہوا غازی چک نے اپنی بیٹی کا نکاح حبیب شاہ سے کیا تھا اور اسی کو بعد میں غازی چک نے معزول کیا اور خود حکمران بن بیٹھا ۔

غازی چک ایک سفاک طبیعت کا حکمران تھا۔ معمولی جرائم پر عضو کٹوانا آنکھوں میں گرم سلائی پھیرنا اس کی عادت تھی۔ دوران حکومت ہی وہ شدید مرض کوڑھ میں مبتلا ہوا جس سے اسکی آنکھوں کی بینائی ختم ہوئی۔ اس نے اپنی زندگی میں اپنے سوتیلے بھائی حسین چک کو اپنا جانشین بنایا۔ حسین چک نہایت حلیم الطبع اور منصف مزاج حکمران تھا۔ قلیل عرصہ کے بعد وہ مرض دق میں مبتلا ہو کر عین عالم شباب میں اس دنیا سے چل بسا اس کے بعد اس کا بھائی علی شاہ ۱۵۷۰ء میں تخت نشین ہوا اس کے دو بیٹے حسین چک، یوسف چک اور ایک بیٹی تھی اسکا نکاح علی شاہ نے سید مبارک خان بیہقی کے بیٹے سید ابو المعالی سے کیا تھا۔ یہ رشتہ علی شاہ نے محض اپنی سلطنت و حکمرانی کو مضبوط بنانے کیلئے کیا تھا۔ علی شاہ نے سید مبارک خان کو مدار المہام سلطنت کے ممتاز عہدہ پر فائض کر کے منصب اور جاگیر بھی عطا کی۔ چنانچہ اس واقعہ کو مصنف بہارستان شاہی نے ان الفاظ میں تحریر کیا ہے۔

"علی شاہ سید مبارک خان را برخود منفق ساختہ برائے تقویت و تمشیت سلطنت خود عہد و پیمانی مستحکم ساختہ بود و در حین جلوس بر سریر سلطنت جہت وفای عہود خود تمام مدار حکومت بر ذات سید مشار الیہ قائم داشتہ دختر خود بعقد نکاح فرزند او شاہ ابو المعالی داد۔"

علی شاہ رعیت پرور، صلح پسند حکمران تھا علماء و صلحا کی بڑی قدر و تعظیم کرتا تھا۔ یہ حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدومی کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بابا ہردی ریشی کا سخت معتقد تھا۔ چنانچہ اکثر ان کی خدمت بابرکت میں جاتا تھا۔ اس کا عینی شاہد حضرت بابا داؤد خاکیؒ قصیدہ لامیہ میں میں یوں رقمطراز ہے۔

والیِ دوران علی شاہ دوستدار صالحاں
پور او شاہزادہ یوسف شاہ با جاہ و جلال
ہر دو ایشاں صحبت ایں پیر را دریافتند

هر دو کردندے دعائے خیر خود از وی سوال
او دعا گفتی و الیشاں را مبارک آمدے
ہم دریں اشفاق الیشاں کرد از یں جا ارتحال

مبارک خان نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سید ابراہیم سے پائی کسب سلوک کیلئے وہ حضرت شیخ حمزہ مخدوم قدس اللہ سرہٗ کی خدمت با برکت میں جاتا تھا وہ ایک متقی اور عالم باعمل ہونے کے ساتھ ایک نڈر اور بہادر فوجی سپہ سالار بھی تھا۔

علی شاہ قریباً نو سال حکومت کرنے کے بعد ایک روز حسب عادت میدان عیدگاہ میں چوگاں کھیلنے کیلئے گیا چوگاں کھیلتے گھوڑے سے گر گیا شاہی محل میں پہنچتے ہی فوت ہوا۔

پروفیسر محب الحسن نے اپنی تالیف "Kashmir Under Sultans" میں لکھا ہے کہ علی شاہ نے مرنے سے پہلے ہی اپنے بیٹے کو تخت نشین کیا چنانچہ پروفیسر صاحب یوں لکھتے ہیں:۔

"But one early 1579 during a game he was mortally injured. He returned to the palace and realizing that his end was near, he crowned his eldestson, Yousf Khan as sultan."

پروفیسر صاحب کا یہ بیان بالکل بے بنیاد ہے چنانچہ ہمعصر مورخ مصنف بہارستان شاہی نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں مفصل بیان کیا ہے جس سے پروفیسر صاحب کے بیان کی تردید ہوتی ہے:۔

"علی شاہ در ایام حکومت و سلطنت خود چنانے مقرر نمودہ کہ ہر روز صباح و مساء در میدان عیدگاہ بسیر و چوگان بازی حاضر می شد بابا خلیل اللہ از اسرار عالم غیب واقف شدہ نزد علی شاہ بمبالغہ و الحاح گفتہ فرستاد کہ ازیں بیشتر در چوگان بازی پا و خطرہ خورد دارد چوں روز دوم فراموش آں کردہ بچوگان بازی در آمد ناگاہ بتقدیر الٰہی سنہ نہصد و ہشتاد و ششم ہجری کہ با ہمہ امراء و سپاہ حاضر شدہ در میدان چوگان بازی

"قاصد" اذا جاء اجلهم لا یستاخرون الساعة ولا یستقدمون" از بیچون بوی رسید پیشتر از بردن گوی از میدان عیدگاه صولجان قضا گوی جانش از میدان زندگانی بجوار سبحانی برد شاه عدالت شعار خواست که بضرب چوگان گوی از میدان بیرون برد از خم گردن پشت شکمش بر پشک زین خورد. روده اش پاره شد و جگرش برهم خورد و عنان اسپ بگردانید بمنزل مراجعت نمود اول چاشت بود که بخانه خود رسید بمجرد رسیدن جان بجهان آفرین تسلیم کرد۔"

اس واقعہ کی خبر پاتے ہی اس کے چھوٹے بھائی ابدال خان نے اپنے مشیروں کی ایک جماعت تخت حاصل کرنے کی غرض سے منظم کی کیونکہ خاندانی روایات کے پیش نظر چک خاندان میں بھائی نے بھائی سے تخت حاصل کیا تھا۔ اسی بنا پر ابدال خان نے محلہ نوہٹہ میں بغاوت برپا کی۔ سید مبارک خان ایک تو علی شاہ کا قدیم دوست دوسرا ذمہ دار سلطنت تیسرا علی شاہ کا سمبندھی بھی تھا ان قرابتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سید مبارک خان نے علی شاہ کی لاش جامع مسجد میں رکھوائی اور لشکرکشی سے قبل چند معتبر اشخاص ابدال خان کے پاس بامصالحت بھیجے ان میں خاص طور ابدال خان کا خسر محمد چک اور بابا خلیل شامل تھے کیونکہ بابا خلیل کو اسوقت یہاں کے شیعہ فرقہ میں ممتاز مقام حاصل تھا۔ ابدال خان کو حکمرانی کا بھوت سوار تھا اس کو ان کی نصیحت کا بالکل اثر نہ ہوا بلکہ وہ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے تخت حاصل کرنے کا خواہشمند تھا۔ سید مبارک خان نے جب وفد کی ناکامی کی خبر سنی تو اس نے سرسری طور یوسف شاہ کی رسم تاج پوشی انجام دی اور ساتھ ہی لشکر شاہی لیکر محلہ نوہٹہ میں ابدال خان کے مقابلہ کے لئے صف آرا ہوا طرفین میں جنگ چھڑ گئی اور سید ابوالمعالی نے ابدال خان کو تیر کا نشانہ بنایا یہ تیر ابدال خان کے سر میں جا لگا اور وہ تیر کھاتے ہی گھوڑے سے گر پڑا ادھر سے حسین خان نے موقعہ کو غنیمت جان کر ابدال خان کا سر تن سے جدا کر دیا اور فتح کے نعرے بلند کئے۔

یوسف شاہ نے تخت شاہی پر بیٹھتے ہی عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنا شروع کی۔ وہ موسیقی کا سخت شوقین تھا گانا بجانا خود بھی جانتا تھا یہ حال دیکھکر ایک روز سید مبارک خان اپنے

تینوں بیٹوں کے ہمراہ یوسف شاہ کے پاس آیا اور کہا کہ اب میں باقی عمر یاد خدا میں گذارنا چاہتا ہوں میں نے علی شاہ مرحوم کو بھی یہ کہا تھا لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا اب میں بحیثیت ایک وفادار سلطنت کے ان تینوں بیٹوں کو آپ کی ملازمت میں رکھتا ہوں یوسف شاہ نے بغیر کسی سوچ سمجھ کے رضامندی کا سر ہلایا چنانچہ اس واقعہ کو مصنف "بہارستان شاہی" نے یوں بیان کیا ہے:-

"یوسف شاہ پدر بزرگوار خویش علی شاہ را بر داشتہ بلجدستان آبا و اجداد رسانیدہ بتاریخ نہصد و ہشتاد و ششم ہجری بر سریر سلطنت و مسند حکومت نشست

چنیں است آغاز فرجام جنگ — یکی تاج یابد یکی گور تنگ

و مسند وکالت بہ محمد بٹ سپرد و بعد از چند روز این واقعہ سید مشار الیہ سید مبارک خان دم از فروتنی و نیستی زدہ فرزندان خود را دست گرفتہ بحضور کلان تران این دیار بہ یوسف شاہ سپرد کہ این ہر سہ فرزندان شرائط اخلاص و اعتقاد در ملازمت شما بجا خواہند آورد و ما بقیۃ العمر فارغ البال بودہ در گوشۂ عزلت بطاعت و عبادت حق تعالیٰ اشتغال خواہم کرد و این حال بر ہمگنان بلکہ بر عالم و عالمیان روشن و برہن است کہ مدت مدید و عہد بعید است کہ این ہوس در سر عزیمت و این اندیشہ در خاطر ہمت من رسوخ داشت اما چون خاطر فیض ماثر مغفرت پناہ علی شاہ ہمہ وقت بار عزیز گرامی بود این التماس من بر منصۂ ظہور از خاطر الیشان عز جہد و رنجی یافت باستماع این سخن یوسف شاہ سر رضا جنبانید و میران سید مبارک خان اظہار بہجت و سرور نمود متوجہ منزل شد و بالکلیہ ملاقات یوسف شاہ ترک نکردہ گاہ گاہ در صحبت مصاحبت او آمد و شد میکرد"

یوسف شاہ عیش و عشرت میں محو و مشغول رہ کر امور سلطنت سے بے خبر رہا محمد بٹ حتی الوسع انتظام مملکت کرتا رہا یہ دیکھ کر اعیان و امراء مملکت بغاوت و شورش برپا کرنے لگے ان میں خاص کر ابدال بٹ

تھا جو کہ شروع سے ہی وزارت کا خواہشمند تھا اس نے موقع غنیمت سمجھکر علی چک، لوہر خان، علی ملک، اندر شمس چک کیوارہ کو ہمراہ لیکر تخریبی کاروائیاں شروع کیں ۱۶ ماہ ربیع الثانی ۹۸۸ھ مطابق ۲۱ مئی ۱۵۸۰ء کو آدھی رات کے وقت اس نے شہر کے پلوں کو کاٹ کر راہ آمد و رفت کو مسدود بناکر علم بغاوت بلند کیا۔ اس سے قبل یہ سید مبارک خان کے پاس بغرض مدد گیا تھا لیکن سید موصوف نے مدد دینے سے انکار کیا ساتھ ہی ابدال بٹ کو بغاوت و تخریبات سے منع کیا۔ ادھر سے مبارک خان نے یوسف شاہ کی نادانی کو مدنظر رکھتے ہوئے بابا خلیل کو یوسف شاہ کے پاس یہ خبر لیکر بھیجا کہ ابدال بٹ ایک کثیر جماعت کے ہمراہ بغاوت پر آمادہ ہوا ہے بہتر ہے کہ اس کے ساتھ ہر ممکن طریقہ سے مصالحت کی جائے ورنہ حکومت ہاتھ سے جانے کا اندیشہ ہے۔ یوسف شاہ امور سلطنت سے بے خبر تھا اور عیاشی نے اس کو معذور کیا تھا۔ جس سے وہ مصالحت کیلئے تیار نہ ہوا بلکہ بابا خلیل کو کہا کہ اگر سید مبارک خان مخالفوں کی جماعت کو آج ہی میرے پاس پابہ زنجیر کر کے بھیج دے گا تو میرے نیک خواہوں میں سے ہے ورنہ اس بغاوت کا ذمہ دار سید موصوف ہی ہو گا۔ مبارک خان نے یہ جواب سنتے ہی گوشہ نشینی اختیار کی اس کے دوسرے ہی دن یوسف شاہ نے شاہی لشکر کے ہمراہ زالڈگر میں ڈیرہ جمالیا اور ایک فوجی دستہ عیدگاہ کی طرف سید مبارک خان کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ سید مبارک خان یہ خبر پاتے ہی مجبوراً بذات خود گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ میدان جنگ میں مقابلہ کیلئے نکلا۔ دونوں فوجوں میں ٹکر ہوئی تو یوسف شاہ کے سپاہی سید موصوف کے بہادرانہ حملہ کی تاب نہ لاکر میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ شکست کی خبر سنتے ہی یوسف شاہ نے حواس باختہ ہو کر اپنے مشیروں کو ڈانٹا ساتھ ہی ملا حسن اسود کو سید مبارک خان کے پاس باصلح روانہ کیا۔ سید مبارک خان نے کہا کہ قبل اس کے میں نے صلح کیلئے ملا خلیل کو یوسف شاہ کے پاس روانہ کیا تھا اس میں مجھے کچھ ذاتی غرض نہ تھی لیکن بوجہ کبر و نخوت یوسف شاہ نے اپنی کوتاہ اندیشی سے میرے مخلصانہ مشورہ کو ٹھکرا کر بغیر کسی اشتعال کے میرے خلاف جنگ و جدل کیلئے صف آرا ہوا اب جبکہ اس لڑائی میں

ناحق میرے جانبازوں کی جانیں تلف ہوئیں اس کے پیش نظر بحیثیت ایک فاتح کے میرے لئے صلح کرنا بزدلی اور ناانصافی ہے۔ یوسف شاہ کو چاہیئے کہ وہ کچھ مہینوں کیلئے پہاڑی علاقوں اور مرغزاروں کی سیر و سیاحت کیلئے جائے حالات سازگار ہونے پر میں خود تخت شاہی یوسف شاہ کے حوالہ کروں گا مجھے نہ ہوس ملک گیری ہے نہ حکمرانی۔ ملا حسن اسود یہ جواب لیکر یوسف شاہ کے پاس گیا۔ یوسف شاہ نے جواب سنتے ہی تاج شاہی بابا خلیل کے ہاتھ مبارک خان کے پاس بھیجا۔

سید مبارک خان کو حضرت محبوب العالم شیخ حمزہ مخدومی قدس سرہ کی تربیت نے ایک صوفی و درویش صفت انسان بنایا تھا ان عادات کے ہوتے ہوئے سید موصوف نے تاج شاہی کو سامنے رکھکر اس طرح مخاطب کیا۔

> ”اے نفس دنیاوی جاہ و حشمت پر اعتماد نہ کر کیونکہ یہ عجب و کبر پیدا کرتا ہے یہ تاج شاہی تمہارے لئے زیب نہیں دیتا۔“

یہ کہکر اس مرصع تاج شاہی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے فقیروں، محتاجوں اور سپاہیوں میں تقسیم کر دیا سنہ ۹۸۸ھ مطابق ۱۵۸۰ء میں مبارک خان بیہقی مسند شاہی پر بحیثیت حکمران کے جلوہ افروز ہوا۔ سید مبارک خان پابند شرع اور منصف مزاج حکمران تھا۔ اس نے چک شاہاں کے رائج کردہ بدعات کو فوری طور منسوخ کر دیا دوران حکومت اس نے ملک کیلئے آئین مرتب کیا جو کہ دستور العمل کے نام سے مشہور ہے بدقسمتی سے یہ دستور العمل دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہا بلکہ اس وقت اس کا صرف نام ہی تواریخ میں پایا جاتا ہے۔ مبارک خان لہو لعب اور ناچ گانے سے نفرت کرتا تھا اس کے عادات سادہ تھے بدعات بد کا سخت مخالف تھا چھ ماہ گذرنے کے بعد مفاد پرستوں نے سید مبارک خان کے خلاف یوسف شاہ کے ساتھ پہاڑی علاقہ کے لوگوں کو اپنے ساتھ متفق کیا ۲ ماہ شعبان سنہ ۹۸۸ھ مطابق ۱۲ ماہ دسمبر ۱۵۸۰ء کو کوہستان برتل میں یوسف شاہ نے ایک کثیر جماعت کے ہمراہ علم بغاوت بلند کیا۔ سید موصوف بھی اس کے

مقابلہ کیلئے نکلا۔ سید مبارک خان کو ہوس حکمرانی نہ تھی۔ اس نے داؤد میر کو بطور ایلچی خط لیکر یوسف شاہ کے پاس روانہ کیا خط میں صرف یہ مختصر منظوم عبارت تحریر تھی ؎

شہا فقر و فنا از ما و ملک و عز و جاہ از تو
کہ دنیا را وفائی نیست شاہ از ما و خواہ از تو

داؤد میر جب یہ پیغام صلح و مسرت لیکر یوسف شاہ کے پاس پہنچا تو وہ خط دیکھنے کے بعد صلح کو لڑائی سے بہتر جان کر آمادۂ صلح ہوا۔ اپنے دو بیٹوں یعقوب چک و ابراہیم چک کو ملا حسن اسود کے ہمراہ سید مبارک خان کے پاس جانے کو کہا۔ اور خود بھی سید موصوف کے پاس جانے کے لئے آمادہ ہوا۔ ابدال بٹ یہ خبر سنتے ہی یوسف شاہ کے پاس آیا اور اس کو مبارک خان کے پاس جانے سے روکا اور کہا کہ سید مبارک خان کی نیت صاف نہیں ہے بلکہ وہ آپکو اس چال سے قید کرنا چاہتا ہے یوسف شاہ نے شک و شبہ میں الجھ کر سید مبارک خان کو جواباً لکھا ؎

کہ خاں را ندانیم ازیں گفتگو   چہ باشد غرض باشہ صلح جو
بما از ضرورت صفا می کند   نہ از مہر بل از وفا می کند
بہ بلید اگر سیف مارا بخواب   شود زہرہ اش آب از اضطراب
گدا یک غوغا بسے کرد تیز   بگفتا کہ ای فتنہ خفتہ خیز
چوں بشنید این حرفہای درشت   فرستادہ را غم دو تا کرد پشت
خجل باز گردید ازاں سلسلہ
دہاں پر شکایت زباں پر گلہ

جبکہ داؤد میر یوسف شاہ کا خط اور اس کے مصاحبوں کی اشتعال انگیز خبر لیکر سید مبارک خان کے پاس واپس آیا سید مبارک خان یہ سنتے ہی آگ بگولہ ہو کر لشکر کے ہمراہ یوسف شاہ پر یلغار کیلئے نکلا دونوں لشکروں میں مقابلہ ہوا یوسف شاہ کے چیدہ چیدہ فوجی بہادر مثل

گدا بیگ ترکمان فوجی سپہ سالار تمر خان افغان لڑائی میں قتل کئے گئے شنگی میر چاڈورہ کو کچھ سپاہیوں کے ہمراہ گرفتار کیا گیا۔ یوسف شاہ کے محافظ نجی رینہ کے گھر کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ یوسف شاہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر کوہ برتل کی گھاٹیوں میں روپوش ہوا۔

اگرچہ امرا کشمیر نے یوسف شاہ کو معزول کر کے سیّد مبارک خان کو تخت شاہی پر حکمران بنایا تھا لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ وہ اپنے اوپر کسی کو حاوی نہیں ہونے دیتا ہے نہ ہی یہ چاپلوس پسند آدمی ہے بلکہ یہ امن اور انصاف پسند پابند شرع ہے۔ باوجود امن پسندی کے یہ تلوار اس وقت تک میان سے نہیں نکالتا تھا۔ جب اسکے بغیر کوئی چارہ نہ رہ جاتا تو امرا نے مبارک خان کو اپنی غرضمندانہ باتوں میں نہ آتے ہوئے اسکو حکومت سے برطرف کرنے کی سازشیں شروع کیں۔ چنانچہ ابدال بٹ کی منافقانہ چالوں سے مبارک خان نے چکوں کو حکومت واپس سونپ دی۔ یوسف شاہ کبھی تخت حاصل کرنے میں ناکام رہا تو لوہر چک کو کشمیر کا بادشاہ بنایا۔ سیّد مبارک خان گوشہ نشینی اختیار کر کے سیاست سے کنارہ کش رہا۔ یوسف شاہ لوہر خان کی خبر سنتے ہی اکبر بادشاہ کے پاس بأمدد گیا۔ اکبر کی حریص آنکھیں ہر وقت کشمیر پر تھیں اور مغلوں کو کشمیری بہادروں نے ہر وقت پسپا کر دیا تھا یہ بھی اکبر جیسے عظیم بادشاہ کے لئے کسر شان تھا مختصر یہ کہ مغلوں کو کشمیر فتح کرنے کیلئے بہانہ ہاتھ آیا یوسف شاہ اور اس کے بیٹے یعقوب شاہ کی نادانی اور کوتاہ اندیشی سے مغلوں نے کشمیر فتح کیا پھر بھی کشمیری اپنی آزادی کی خاطر مغلوں پر چھاپہ مارنے اور مغل افواج کو تہس نہس کرنے میں باز نہ رہے۔ اکبر نے چیدہ چیدہ کشمیری بہادروں کو کشمیر سے جلائے وطن کر کے مغل دربار کے زیر نگراں رکھا انہی میں سیّد مبارک خان، محمد بٹ اور بابا خلیل بھی تھے۔

قاسم خان میر بحر مغلوں کا پہلا صوبیدار کشمیر تھا۔ بہادر کشمیریوں کی تخریبی کاروائیوں سے شاہی لشکر کو تباہ و خراب دیکھتے ہوئے یہ سخت پریشان ہوا تو اس نے بادشاہ اکبر کو لکھا۔ بادشاہ نے کشمیریوں کو زیر کرنے کیلئے محمد بٹ، بابا خلیل اور سیّد مبارک خان بیہقی کو شاہی لشکر

کے ساتھ کشمیر جانے کا حکم دیا۔ سید موصوف نے شاہی عنایات و حکم شاہی کو بہانہ سازی سے ٹال دیا اس پر بادشاہ سید مبارک پر سخت ناراض ہوا اور اس کو شہباز خان کبنوہ صوبیدار بنگال کے پاس جانے کا حکم دیا۔ شاہی حکم کی تعمیل میں سید مبارک خان شہباز خان کبنوہ کی ملازمت میں بنگال چلا گیا۔ ایک سال گذرنے کے بعد ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۹۰ء میں شہباز خان کبنوہ سید موصوف کو ہمراہ لیکر واپس دار الخلافت دہلی آیا تو فیروز آباد پہنچنے پر سید مبارک خان اس دنیا سے چل بسا اور وہیں سپرد خاک کیا گیا۔ مورخ حسن شاہ نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"مرزا قاسم خان از تباہی و خرابی لشکر شاہی عاجز و دلگیر شدہ احوال حسرت و نکال بحضور معروضداشت۔ عرش آشیانی سید مبارک خان و محمد بٹ و بابا خلیل را ذمہ دار کہ ایشان ہمراہ عسکر شاہی در کشمیر رفتہ اطفای نایرہ فساد و عناد بر نہجے کہ مے رانند نمایند سید مبارک خان قبول این امر خطیر ننمود موجب آن پادشاہ ازو متغیر المزاج شدہ نزد شہباز خان بصوبہ بنگالہ فرستاد۔ چون در علاقہ فیروز پور رسید از جان درگذشت و در انجا مدفون است۔"

ہمعصر مورخ مصنف 'بہارستان شاہی' یوں رقمطراز ہے:۔

"حضرت خلافت پناہ از ارکان دولت تدبیر دفع این فتنہ استفسار فرمود ہمہ متفق اللفظ والمعنی چنین معروض داشتند کہ بغیر توجہ میران سید مشار الیہ سید مبارک شاہ فتنہ و فساد مردم این دیار ارتفاع پذیر نیست بناءً علیہ حضرت خلافت پناہ میران سید مشار الیہ را بانواع التفات بادشاہانہ ممتاز فرمودہ مامور گردانید کہ برفاقت میرزا یوسف خان وغیرہ در ان دیار رسید برفع و دفع این فتنہ قیام نمائید۔ ہر چند بادشاہ جہان پناہ درین باب تکلیف و مبالغہ بسیار فرمود میران سید مشار الیہ مقدمات عذر درمیان تمہید نمودہ قبول

ایں امر نمود لاجرم حضرت خلافت پناہ متغیر المزاج گردیدہ میران سید مشارٌ الیہ را نزد شہباز خان کنبوہ بصوبہ بنگالہ فرستاد بعد از مدت یک سال چون شہباز خان بعزم عتبہ بوسی درگاہ خلافت پناہ مراجعت نمودہ بموضع فیروز آباد رسید ہاتف غیبی ندای ارجعی بگوش ہوش میران سید مشارٌ الیہ رسانید و بجواب لبیک تلقین نمود و تاریخ رحلت ایشان بریں نہج یافتہ اند"

سہ ہزار حیف سید مبارک دین دار   چو آفتاب فرو رفت از سر کہسار
برحمت و کرمش از سر فانی برد   بسوی جنت باقی مہیمن غفار
ز فرقتش دل احباب و دوستان خون شد   کہ بود دولت و پناہ ہمہ صغار و کبار
چو سال رحلت او عاقلی ز من پرسید   خرد بدانش گفتا "شہید رفت" ناچار ۹۹۹ھ

مصنف "بہارستان شاہی" اور مؤرخ پیر حسن شاہ مبارک خان کے سال وفات ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۹۰ء پر متفق ہیں لیکن میر عبد الرزاق نے شہباز خان کے دہلی واپس آنے کا واقعہ یوں بیان کیا ہے:۔

"چون در سال بیست و ہشتم خان اعظم (کہ از ہوای بنگالہ دیدن گرفتہ بود) استدعای خدمت دیگر ناحیہ نمود شہباز خان بپاسبانی آن دیار با امرای بسیار رخصت یافت"

اگر یہ سال بیست و ہشتم دین الٰہی کا لیا جائے تو پھر یہ ۹۹۱ھ آتا ہے قاسم خان میر بحر دوسری دفعہ ۹۹۴ھ مطابق ۱۵۸۵ء میں کشمیر پر لشکر کشی کرتا ہے۔ اسوقت مبارک خان کشمیر میں ہی تھا اگر یہ سال جلوس میں لیا جائے تو پھر یہ ۹۸۴ھ آتا ہے ۹۸۸ھ میں مبارک خان خود کشمیر کا حکمران تھا اس کے بعد یوسف شاہ اکبر بادشاہ کے پاس بامدد جاتا ہے۔ غرض شہباز خان کنبوہ کی بنگال سے واپسی اور سید مبارک خان کی وفات ماثر الامراء نے غلط دی ہے اسمیں صحیح سال وفات مصنف "بہارستان شاہی" کا ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ حالات اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ یہ شخص آخری سلاطین کشمیر کے ہمرکاب رہا ہے۔

★★★

مجاہدِ آزادی

بلدیو پرشاد شرما

باوا جتّو

آج سے پانچسو بیس (۵۲۰) سال پہلے جب جموّں کے علاقہ میں جاگیرشاہی کا دور دورہ تھا اور کسان کے خون پسینہ کی کمائی جاگیردار کی نذر ہو جاتی تھی ۔ ایک غریب مزارعہ نے اپنی جان کی قربانی دیکر جاگیرشاہی کی چولیں ہلا دیں ۔ اسکا نام تھا جیت مل جسے عام طور باوا جتّو کہا جاتا ہے ۔ یہ مقام جہاں باوا جتّو نے یہ بیش بہا قربانی دی جموں شہر سے ۱۵ کلومیٹر اکھنور کی جانب واقع ہے ۔ ایک روایت کے مطابق اس مقام پر راجہ عجائب دیو والیٔ جموّں نے باوا جتّو کی یاد میں ایک مندر تعمیر کروایا تھا[۱] ۔ مگر یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی ۔ اس مقام پر دراصل دو سمادھیاں ہیں[۲] ایک باوا جتّو کی اور دوسری اسکی بیٹی کی ۔ دوسری روایت کے مطابق یہ دونوں سمادھیاں سیالکوٹ کے سُدھ اور بُدھ نام کے دو بھائیوں نے تعمیر کروائی تھیں[۳]

جتّو کے متعلق لٹریچر

باوا جتّو کی شہادت کی داستان چارسو سال سے زیادہ عرصہ تک سینہ بہ سینہ ہی چلتی رہی اور یہ ایک "کارک[۴] "

---

[۱] "تاریخ جدید ڈوگرہ دیش" مرتبہ نرسنگداس نرگس ۔ صفحہ ۷۰

[۲] مشہور اور قابل تعظیم ہستیوں کی یادگار میں تعمیر کئے گئے مندر کو سمادھی کہتے ہیں ۔

[۳] "جِت مل چرترم" مصنفہ شکدیو شاستری شلوک ۲۳

[۴] ڈوگری زبان میں "کارک" اس لوک گیت کو کہتے ہیں جس میں کسی درویش یا سنت کا تذکرہ ہو ۔

(ballad) مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں پہلی بار پنڈت نیل کنٹھ نے ملی جلی ڈوگری دھندی بھاشا میں "کتھا باوا جتو دی" لکھی۔ یہ چھوٹی سی پستک جواب نایاب ہو چکی ہے۔ سنہ ۱۹۴۱ بکرمی میں شری رگھناتھ پریس جموں میں چھپی تھی۔ پروفیسر رام ناتھ شاستری نے اس نایاب کتابچہ کو اپنی تصنیف "باوا جتو" میں حرف بحرف شائع کر کے اسے آئندہ نسلوں کے نئے محفوظ کر دیا ہے[1]۔ شری شام لعل شرما نے اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "باوا جتو کی کارک" بھی مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانہ میں شائع ہوئی تھی۔ اسکے بعد شری شکدیو شاستری نے سنسکرت زبان میں "جت مل چریتم" نام کا ۵۵ صفحات کا کتابچہ شائع کیا اور پنڈت اننت رام شاستری نے "باوا جتو ہندی امر کتھا" ڈوگری زبان میں تصنیف کی جسے ڈوگرہ منڈل جموں نے شائع کیا۔

ریاست کی کلچرل اکادمی نے ڈوگری کے لوک گیت جمع کر کے شائع کرنیکا جو سلسلہ جاری کر رکھا ہے اس نے ڈوگروں کے بیش بہا کلچرل سرمایہ کو آئندہ نسلوں کیلئے محفوظ کر دیا ہے ابھی تک اکادمی نے ڈوگری لوک گیتوں کے گیارہ مجموعے شائع کر دئے ہیں اور بارہواں مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ لوگ گیتوں کے دوسرے مجموعہ میں "کارکاں تے باراں" (BALLADS) شائع کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۶۵-۶۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور اسکے صفحات ۵۳ تا ۷۲ میں باوا جتو کی وہ "کارک" دی گئی ہے جسے جوگی[2] گایا کرتے ہیں۔

باوا جتو کے متعلق شائع شدہ لٹریچر میں ایک اہم اضافہ پروفیسر رام ناتھ شاستری نے کیا ہے۔ یہ کتاب انہوں نے کافی کھوج کے بعد مرتب کی ہے جسے ڈوگری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جموں نے شائع کیا ہے۔ شاستری جی نے باوا جتو کی پیدائش سے لیکر شہادت تک کے تمام واقعات

---

[1] "باوا جتو" مصنفہ پروفیسر رام ناتھ شاستری۔ شائع کردہ ڈوگری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جموں سنہ ۱۹۷۳ء

[2] ڈوگر میں جوگی ایک فرقہ ہے جس کا آبائی پیشہ سنت مہاتماؤں اور شور بیروں کے گیت گا کر سنانا ہے۔

کے متعلق کافی تحقیق کر کے انہیں صحیح رنگ میں پیش کیا ہے ۔

تاریخ پیدائش

باوا جتو کی تاریخ پیدائش کا یقین کرنا نہایت مشکل ہے "جیت مل چرتم" کے مطابق باوا جتو ماہ کاتک کے اندھیرے پکھس کی اشٹمی بروز اتوار پیدا ہوا ۔ اس میں سال کا ذکر نہیں ہے ۔ اسی طرح "کارک" میں پیدائش کے متعلق لکھا ہے

"ایک نیک ساعت میں جتو کا جنم ہوا ۔"

کٹڑہ ویشنو دیوی سے تقریباً ۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر ریاسی جانیوالی سڑک پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جسکا نام اگھار ہے اب اسے باوا جتو کے نام سے منسوب کر کے اگھار باوا جتو کہتے ہیں ۔ اسی گاؤں میں ایک برہمن کسان مسمی روپو کے گھر جتو نے جنم لیا ۔ اسکے بچپن میں ہی اسکے ماں باپ انتقال کر گئے ۔ اور اسکی دیکھ بھال کی ذمہ داری اسکی چاچی جوجاں نے سنبھالی ۔ جوجاں خود سات بیٹوں کی ماں تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ڈائن وِدیا جانتی تھی ۔ "کارک" کے مطابق وہ خود اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ "جب جتو کی عمر ابھی اکیس دن تھی اور وہ میری گود میں کھیل رہا تھا تو میں نے اسے گڑ کے ساتھ زہر ملا کر کھلایا مگر یہ سخت جان پھر بھی نہ مرا ۔"

ویشنو دیوی کی بھگتی

سات برس کی عمر میں جتو نے تعلیم شروع کی اور نو سال کی عمر میں گاؤں کے مندر کے پوجاری کا کام سنبھالا ۔ بڑا ہو کر وہ ویشنو دیوی کا بھگت بن گیا اور روزانہ پہاڑی چڑھ کر درشن کرنے چلا جاتا ۔ شادی ہو جانے کے بعد اولاد کے متعلق اسکی خواہش کا تذکرہ "کارک" میں اس طرح کیا گیا ہے :۔

> "ویشنو دیوی کے گپھا کے اندر کھڑے ایک دن باوا جتو کو ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی نظر آئی ۔ اسکو دیکھتے ہی جتو کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اسکے گھر بھی ایسی ہی خوبصورت لڑکی پیدا ہو ۔ ماتا ویشنو نے اسکو بردان دیا کہ اسکی خواہش جلد پوری ہوگی چنانچہ کچھ عرصہ بعد جتو کی بیوی نے ایک لڑکی کو جنم دیا جس کا نام کوڑی رکھا گیا[1] اسے پیار سے بوا کوڑی کہتے ہیں

---

[1] ڈوگری لوک گیت جلد دوم ص ۵۷

جوجان کی کرتوت

جتو کی بیوی تھوڑے عرصے کے بعد ہی مر گئی اور کوڑی کی پرورش چاچی جوجان کے ذمہ آئی۔ اُسے جتو اور اسکی بیٹی ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ چنانچہ "کارک" کے مطابق جب ایک دن لُوا کوڑی اپنی سہیلیوں کے ساتھ ندی پر نہانے گئی تو جوجان نے مناسب موقعہ جان کر اپنی ڈائن ودیا کا استعمال کیا۔ کوڑی کے کلیجہ میں درد اٹھا اور وہ وہیں لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اسکے چہرے کا کمل مرجھا گیا۔ سہیلیوں کی پوچھ تاچھ پر کوڑی نے بتایا کہ اسے بیہوشی کی حالت میں اپنی چاچی ہی ایک خوفناک شکل میں نظر آئی تھی۔[۱]

باوا جتو اس وقت پوجا پاٹھ میں مصروف تھا۔ جب اسے اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ دوڑتا ہوا موقعہ پر پہنچا اور اپنی لاڈلی بیٹی کو اٹھا لایا۔ اور منتر پڑھنا شروع کر دیا ایک جوگی کو بلایا گیا جس نے آتے ہی ڈھول بجانا شروع کر دیا۔ تھر تھر کانپتے ہوئے جتو نے اپنی بیٹی کو جب دو چار تھپڑ مارے تو چاچی جوجان اپنے گھر میں بیٹھی چیخنے چلانے لگی اور ننگے پاؤں دوڑتی آئی۔ شرمسار ہو کر معافی کی خوستگار ہوئی۔[۲]

مگر گھر واپس جا کر اس نے تریا چرتر رچا اور اپنے ساتوں بیٹوں کو بہکایا کہ باوا جتو نے اسے ڈائن ہونے کی تہمت لگائی ہے۔ ساتوں بھائیوں نے جتو پر حملہ کر دیا۔ مگر اسکی ایشور بھگتی نے اسکی جان بچا دی۔

جتو اپنے بھائی بندوں کے مظالم سے تنگ آ چکا تھا۔ جنہوں نے اسکو جدّی وراثت سے بھی محروم کر دیا تھا اور اسکی چہیتی بیٹی کی جان تک لینے کے درپے تھے۔

اگھار سے ہجرت

جتو نے اپنے گاؤں سے دور چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جہاں اپنا کوئی نہ ہو۔ جب اس نے اپنی لاڈلی بیٹی کو اپنا فیصلہ سنایا تو اُسنے

---

[۱] ڈوگری لوک گیت حصّہ دوئم۔ صفحات ۵۸، ۵۹

[۲] ڈوگری لوک گیت حصّہ دوئم صفحہ ۵۹

اپنے باپ کو بہت سمجھایا کہ ہم پردیس جانے کی بجائے روکھی سوکھی کھا کر گذارہ کر لیں گے مگر جتّو اپنی عہد پر قائم رہا۔ اپنے شرکا کا ستایا ہوا غیور جتّو اپنی لاڈلی بیٹی کو ساتھ لیکر کاندھے پر ہل اٹھائے اپنی بیلوں کی جوڑی کے ہمراہ جموں شہر کی طرف روانہ ہوا۔ چلتے وقت اس نے ایک حسرت بھری نظر سے اپنے گاؤں کی طرف دیکھا اور پھر ترکٹا دیوی[1] کی طرف نظر اٹھا کر دل ہی دل میں پرنام کر کے دعا مانگی کہ "ماتا تو ہی میری لاج رکھنا"

مہتہ بیر سنگھ سے ملاقات

مہتہ بیر سنگھ جموں کے راجہ کا ماموں تھا اور اسکا وزیر بھی۔ مہتہ بیر سنگھ کے دربار میں حاضر ہو کر جتّو نے عرضداشت کی کہ اسے ایک قطعۂ اراضی دیا جائے جسے کاشت کر کے وہ اپنا گذارہ کر سکے۔ "کارک" کے مطابق مہتہ بیر سنگھ نے اکھنور کے نزدیک شیاما چک گاؤں میں ایک بنجر قطعۂ اراضی باوا جتّو کو دیکر یہ تحریر لکھائی کہ فصل کی پیداوار کا ¼ حصہ مہتہ بیر سنگھ کو دیگا اور ¾ حصہ خود لینے کا حقدار ہوگا۔ دوسری روایت کے مطابق مہتہ بیر سنگھ سے جتّو کی ملاقات موضع کانہ چک میں ہوئی تھی اور یہ تحریر بھی وہاں ہی لکھی گئی تھی۔

ہری جن سے بھائی چارہ

باوا جتّو نے شیاما چک پہونچکر اس بنجر زمین کو دیکھا جو صدیوں سے ویران پڑی تھی۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ روایت ہے کہ اس نے وہاں کے ایک ہریجن کو جسکا نام الیسو میگھ تھا اپنا حصہ دار بنا لیا اس طرح باوا جتّو نے اس زمانہ میں برہمن اور ہریجن کے بھائی چارہ کی ایک مثال قائم کر دی۔ الیشور کا نام لیکر باوا جتّو نے بنجر زمین کو ہموار کرنے اور اس میں ہل چلا کر قابل کاشت بنانے کا کام شروع کر دیا۔ کڑی محنت کے بعد جب زمین تیار ہو گئی

---

[1] وشنو دیوی کا پرانا نام ترکٹا دیوی ہے اسکی گپھا ترکوٹ پربت کے اندر واقع ہے۔ ترکوٹ پربت کا ذکر ویدوں اور پرانوں میں بھی ملتا ہے۔

تو باوا جتو کے سامنے ایک نئی مشکل پیش آئی کہ بیج کہاں سے حاصل کرے۔ چنانچہ وہ موضع کانہپک کے ایک گوسائیں کے گھر گیا جہاں سے بقدر چار "پاتی"[1] گندم ادھار لی اور ماہِ کاتک ۱۵۱۴ء بکرمی اُسنے اپنے کھیتوں میں گندم بو دی

کھیت لہلہانے لگے "کارک[2] کے الفاظ میں:

"گن گن راجہ اندر برسے۔ کنک جتو دی پالی"۔ بارش و باراں کے دیوتا اندر نے اپنی رحمت سے باوقت بارش برسا کر باوا جتو کے کھیتوں کو ہرا بھرا کر دیا۔

ماہ بیساکھ ۱۵۱۵ء بکرمی میں باوا جتو نے گندم کاٹ کر انبار لگوا دئے۔ الیسو سیگھ کو اسکی رکھوالی پر مامور کیا اور خود جموں جا کر مہتہ بیر سنگھ کو اطلاع دی کہ فصل نہایت عمدہ ہوئی ہے۔ اور وہ موقعہ پر آ کر اپنا حصہ لے لیں۔ مہتہ بیر سنگھ کی باچھیں کھل گئیں اور وہ فوراً بیل۔ بوریاں اور سپاہ کو لیکر شیاما چک کی طرف چل پڑا۔ گندم کے ڈھیر دیکھ کر مہتہ کی نیت بدل گئی۔ اور اس نے فصل کے نصف حصہ کا مطالبہ کیا۔ مگر جتو نے دینے سے انکار کر دیا۔

"کارک" کے مطابق یہ ایکادشی کا دن تھا اور جتو نے برت[3] رکھا ہوا تھا۔ مہتہ بیر سنگھ نے اس سادہ لوح برہمن کو کہا کہ وہ گھر جا کر نہا دھو لے اور پھل پھول کھا لے اسکے بعد گندم کا بٹوارہ کیا جائے گا۔ جتو چلا گیا۔ گندم کے رکھوالے الیسو سیگھ کی مُشکیں کس لی گئیں اور مہتہ بیر سنگھ نے گندم بوریوں میں بھروانا شروع کر دیا۔ جب جتو کو اس سینہ زوری کی اطلاع ملی تو وہ کٹار لیکر چھلانگیں لگاتا ہوا کھلیان میں جا پہنچا۔ اس نے بھری ہوئی بوریاں کاٹ ڈالیں اور پھر سے گندم کا انبار لگا دیا۔ مہتہ بیر سنگھ بضد تھا کہ وہ فصل کا نصف حاصل کرے گا اور باوا جتو

---

[1] "پاتی" لکڑی کے ایک پیمانہ کو کہتے ہیں جس میں ۶ سیر گندم سماتی ہے۔ صوبہ کشمیر میں بھی اسی طرح کے لکڑی کے پیمانے مثلاً "ٹوپہ" ہوا کرتے تھے۔

[2] ڈوگری لوک سنگیت۔ حصہ دوئم۔ صفحہ ۶۳

[3] ہندو عقیدہ کے مطابق ایکادشی کے دن برت رکھنا بہت نیک ہوتا ہے۔ اس روز برت رکھنے والا صرف پھل اور دودھ کا استعمال کر سکتا ہے۔

کی چیخ و پکار کسی نے نہ سنی تو باوا جتو گندم کے انبار پر کھڑا ہو کر چلّایا

"اُڈّی گیا دھرم ٹھواڑا مہتے تُرّٹی ینرا چیارے
رُکھّی کنک نہیوں کھائیاں مہتیا دِناں ماس رلائی
رامو رام وِھیا ندا باوا تے پیٹے کٹاری لائی
بوہلا دے وِچ تڑ پھے باوا کامیمنے رولا پائی"

(اے مہتہ! تو نے تو اپنا دھرم چھوڑ دیا اب ہماری دوستی بھی ختم ہی سمجھو۔ روکھی گندم تمہیں کھانے کو دینے کی بجائے میں اسی میں اپنا ماس بھی ملا دیتا ہوں۔ رام رام کا بھجن کرتے ہوئے باوا جتو نے اپنے پیٹ میں کٹار ماردی اور گندم کے انبار پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ ہر طرف شور برپا ہو گیا)

اس طرح باوا جتّو نے بیش بہا قربانی دے کر جاگیر شاہی کی چولیں ہلا دیں مگر اس نے ناانصافی اور جبر کے سامنے اپنی گردن نہ جھکائی بلکہ اپنی جان کی قربانی دے کر ایک ایسی مثال قائم کی جو اس زمانہ میں ملک کے کسی دوسرے حصّہ میں نہیں ملتی۔

جاگیردار کی انسانیت سوز حرکت جتّو کی موت کے بعد جاگیردار اسے خون پسینہ کی کمائی (گندم) کھانے سے تو محروم ہو گیا کیونکہ اسکا رنگ شہید کے خون سے سرخ ہو چکا تھا مگر پھر بھی وہ اپنی انسانیت سوز حرکت سے باز نہ آیا۔ ایک تواریخ دان کے مطابق باوا جتّو کا سر اسکے جسم سے علیحدہ کر کے چمڑے میں مڑھوا کر ایک درخت سے لٹکا دیا اور اس کی نعش کو جلا ڈالا۔[2] "کارک" کے مطابق اسکے سر کو ایک درخت کی کھوہ میں چھپا دیا گیا۔

جتّو کی آٹھ سالہ بیٹی بُوا کوڑی کو جب باپ کے بلیدان کا پتہ چلا وہ بھی دوڑی آئی اور

---

[1] ڈوگری لوک گیت۔ حصّہ دوئم۔ صفحہ ۶۸

[2] تاریخ جدید ڈوگرہ دیس۔ مرتبہ نرسنگھ داس نرگس۔ صفحہ ۶۹

اپنے باپ کے سر کو اپنی گود میں لیکر اپنے آپکو زندہ جلا بیٹھی۔ اس طرح جموں کی دھرتی کی ایک معصوم بیٹی نے بھی جاگیرشاہی کے مظالم کے خلاف ایک لامثال قربانی دے کر ظلم ڈھانے والوں کی نیند حرام کر دی۔

"کارک" کے مطابق اس کے بعد ایسو میگھ نے بھی چتا بنا کر اپنے آپکو جلا ڈالا۔

روایت ہے کہ ظلم ڈھانے والا سارے کا سارا مہتہ خاندان نشٹ ہو گیا اور کئی لوگوں نے اپنا نام تبدیل کر کے دور جا کر پناہ لی۔ چنانچہ اس واقعہ کے چار ماہ بعد یعنی سمت ۱۵۱۵ بکرمی کے ماہ کاتک کی پورنماشی کے دن باوا جتو اور بوا کوڑی کے موہرے[1] بنوا کر اس مقام پر مندر تعمیر کروائے جسے "جھڑی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

اس مقام پر شہیدوں کی یاد میں ہر سال ماہ کاتک کی پورنماشی کو میلہ لگتا ہے۔ جس میں بلا لحاظ مذہب و ملت دور و نزدیک کے کسان شامل ہو کر شہید کسان کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

"جھڑی" کا میلہ صحیح معنوں میں کسانوں کا میلہ ہے جو بدستور آٹھ یوم جاری رہتا ہے۔ اس میلہ میں جوگی اور گارڑی لوگ ڈھول بجا کر باوا جتو کا آواہن کرتے ہیں اور اسکی لوک کتھا (کارک) گاتے ہیں۔ کنتھا سن کر چیلے ناچتے ہیں اور لوگوں کے پرشنوں (سوالوں) کا جواب دیتے ہیں۔ عام خیال ہے کہ باوا جتو اور بوا کوڑی کی روحیں ناچنے والے چیلوں میں پرورش کرتی ہیں اور چیلا لوگ غیب کی باتیں بتاتے ہیں[2]۔

صدیاں گذر گئیں مگر باوا جتو کی قربانی کی یادگار محض اس سالانہ میلہ تک ہی

---

[1] ڈوگری زبان میں موہرا اس بت کو کہتے ہیں جو کسی کی یاد میں بنوا کر کسی مندر یا مکان میں قائم کیا جائے۔

[2] تاریخ [illegible] ڈوگرہ دیس۔ مرتبہ نرسنگھ داس نرگس۔ صفحہ ۷۰

محدود رہی جب جاگیر شاہی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ باواجتوؒ کی شہادت کے بعد ۹۰ سال سے بھی زائد عرصہ تک جاگیر شاہی کے کسی منسٹر نے باواجتوؒ کی سمادھی کا رخ تک بھی نہ کیا کیونکہ انکی نظروں میں وہ باغی تھا۔

آخر ایک مرد مجاہد پیدا ہوا جو خود بھی جاگیر شاہی کی نظروں میں باواجتوؒ کی طرح باغی ہی قرار دیا گیا تھا اور وہ مرد مجاہد شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ ہے جس نے نہ صرف شخصی راج کا ہی بلکہ اسکے ساتھ ساتھ تمام جاگیرداروں و چکداروں وغیرہ کا خاتمہ کر دیا۔

جاگیر شاہی کا خاتمہ کرنے کے بعد شیخ صاحب بحثیت وزیر اعظم ریاست جموں و کشمیر ۱۹۵۱ء میں باواجتوؒ کی سمادھی پر گئے آپ کے ہمراہ مرزا محمد افضل بیگ (منشیر مال) سردار بدھ سنگھ (انفارمیشن و براڈکاسٹنگ منسٹر) و مولانا محمد سعید مسعودی (جنرل سیکرٹری آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس بھی تھے) ۱۵ جنوری ۱۹۵۱ء کو چھوٹی باواجتو کے قریب موضع کلیان پور میں ایک پبلک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے بیگ صاحب نے کہا: — "شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ چھوٹا باواجتوؒ ہے جس نے ابھی تک ۵۵ لاکھ کنال زمین جاگیرداروں سے چھین کر کسانوں میں تقسیم کر دی ہے۔" شیخ صاحب نے اپنی تقریر میں کہا: — "آج ہم اپنی تیس سالہ جدوجہد میں کامیاب ہو گئے ہیں اب جو کوئی کسانوں پر ظلم کرے گا اس کے خلاف اِنصاف کی تلوار چلے گی۔" باواجتوؒ کی قربانی کا ذِکر کرتے ہوئے آپ نے کہا: — "ہم نے آج اس ظلم کا ناش کر دیا ہے جس ظلم کے خلاف باواجتوؒ نے بغاوت کی تھی۔ باواجتوؒ نے اِس ظلم کو برداشت نہ کیا اور اپنی جان قربان کر دی۔" باواجتوؒ کی سمادھی پر گل باری کرتے ہوئے شیخ صاحب نے کہا: —

"ہم نے آج باواجتوؒ کے اُس عظیم عزم کو پورا کیا ہے جس کی خاطر انہوں نے آج سے کوئی پانچ سو سال پہلے اپنی جان کی قربانی دی تھی"[1]

---

[1] ہفتہ وار [illegible] جموں، مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۵۱ء

مُہم جو

عبدالغنی شیخ

رسول گلوان

شرپا قلیوں سے متعلق یہ مثل مشہور ہے کہ ان کے بغیر کوہ ہمالیہ کی بلند چوٹیاں سر نہیں کی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو کوہ پیماؤں کے بستر خیمے وغیرہ لیکر تقریباً چوٹی تک جاتے ہیں اور کوہ پیماؤں کو چوٹی پر قدم رکھنے کے قابل بناتے ہیں لیکن بہت کم شرپا قلیوں کو آج تک چوٹی پر قدم رکھنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔

اسی طرح انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں تبت، لداخ، وسط ایشیا اور پامیر کے دشوار گزار خطوں کو مسخر کرنے میں لداخ کے مخلوط النسل مسلمانوں یعنی آرغون قلیوں اور رہبروں کا تعاون یورپی مہم جوؤں کیلئے ناگزیر تھا۔ چنانچہ اس دور کے نامور مہم پسند اور محقق یورپیوں جیسے ینگ ہاسبنڈ، ڈینمور، ہیڈین، ڈیزی، ڈریو، برُوس، فلیپو فلیپی وغیرہ نے عام طور پر لداخیوں اور خاص طور پر لداخی ارغون قلیوں اور رہبروں کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ کئی ایک نے اپنی کتابوں میں ان کی تصاویر شائع کی ہیں۔

ان ارغون مہم جو رہبروں میں محمد عیسیٰ، شکور علی، رمضان علی، رسول گلوان اور قلم رسول بہت مشہور رہیں۔ یہ پانچوں ہم عصر تھے۔ تاہم رسول گلوان اور قلم رسول ان سے عمر میں چھوٹے تھے اور بعد میں سفر پر نکلے تھے۔

رسول گلوان کا پورا نام غلام رسول گلوان تھا۔ لیکن وہ لداخ اور لداخ سے باہر رسول گلوان کے نام سے مشہور ہے۔ کئی باتوں میں رسول کو اپنے ہم عصر ساتھیوں میں انفرادیت

حائل ہے۔ اُس نے اپنی محنت سے انگریزی زبان سیکھی اور ترقی کر کے بعد میں لبیبہ کا اقسقال بن گیا۔ اقسقال وسط ایشیا سے لداخ آنیوالے تاجروں کا نگران ہوتا تھا۔ یہ ترکی لفظ ہے۔ جسکا مطلب سفید ریش والا یا بزرگ ہے۔

رسول گلوان نے کم سنی میں ہی انگریز اور یورپی مہم جو سیاحوں کے ہمراہ سفر کیا۔ اسکو شہرت اپنی خود نوشت سوانح عمری SERVANT OF THE SAHIBS کیوجہ سے ملی۔ یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں کیمبرج میں نفاست اور اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں اُنکی تصویر بھی دی گئی ہے۔ بقول محمد یوسف ٹینگ وہ پہلا کشمیری یا لداخی ہے جس نے انگریزی زبان میں اپنی خود نوشت سوانح عمری لکھی ہے۔ رسول گلوان نے یہ کتاب ایک امریکی محقق اور سیاح رابرٹ براٹ کی تحریک پر لکھی تھی۔ وہ رسول کے کارناموں سے متاثر لگتا ہے۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ رسول اپنے مشاہدات اور تاثرات کو کتابی صورت میں پیش کرے۔ چنانچہ رسول نے اپنے الفاظ میں اپنی زندگی اور سفر کے کچھ احوال اور کوائف دئے ہیں۔ زبان اور گرائمر کی غلطیوں کی تصحیح کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

رسول گلوان متعدد یورپی محققوں اور مہم جو سیاحوں کے ہمراہ تبت، وسط ایشیا، پامیر، اکسائی چین وغیرہ گھوما تھا لیکن اس کی خود نوشت سوانح عمری میں رسول کی سیاحت اور صحرا نوردی کی طویل زندگی کا ایک اجمالی خاکہ ملتا ہے۔ ان میں سے بعض محققوں اور سیاحوں کے سفرنامے اور رپورٹ رسول گلوان کی کتاب کے مقابلے میں زیادہ ضخیم اور جامع ہیں حالانکہ رسول نے انفرادی طور ان سب کے مقابلے میں بہت زیادہ سفر کیا تھا۔ تاہم اپنی جگہ اس کتاب کی افادیت مسلّمہ ہے۔ یہ رسول گلوان کی شخصیت کے مخفی اور دلچسپ گوشوں کو بے نقاب کرتی ہے اور اس دور کی کئی اہم باتیں منظرِ عام پر آتی ہیں۔

رسول گلوان کا دادا خیرا گلوان تھا۔ جو دلچسپ روایتوں کا جنم داتا ہے اور جس کے کارنامے الف لیلوی داستان کے کسی اہم کردار کی یاد دلاتے ہیں۔ وہ جہاں ایک بدنام

رہزن اور ڈکیتی مار تھا۔ وہاں غریبوں کا مددگار اور رحم دل انسان تھا۔ آج بھی وادی کشمیر میں اس کے کارناموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ خیرا گلوان نے سکھ گورنر میاں سنگھ کرنیل (۱۸۴۱ - ۱۸۴۳ء) اور اس سے پہلے کے گورنر کی حکومت کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔

خیرا کو گلوان قبیلے میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ مورخ محمد الدین فوقؔ نے گلوان کو گلہ بان بتایا ہے۔ سر والٹر لارنس اپنی کتاب IMPERIAL GAZETTER OF INDIA میں ان کے بارے میں رقم طراز ہے۔

گلوان چک خاندان کی اولاد ہیں۔ انکی طبیعت میں ایک قاہرانہ بے چینی پائی جاتی ہے۔ پہلے وہ گھوڑے پال کر گزارہ کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے گھوڑے چرانے کا پیشہ اختیار کیا کیونکہ ان کے لئے یہ کام زیادہ آسان تھا۔ سکھوں کے دور حکومت میں انہوں نے بڑی دہشت پھیلا رکھی تھی۔ بہت ساری روائیتوں کے ہیرو خیرا گلوان کو سکھ گورنر میاں سنگھ نے تختہ دار پر لٹکایا۔ گلاب سنگھ نے گلوان کے خلاف اپنی مہم جاری رکھی اور ان کو بھی جلا وطن کیا۔

رسول کا باپ محمدؔ گلوان بھاگ کر بلتستان آیا۔ ان کے بھائی کا نام غفور گلوان تھا۔ غالباً اسی زمانے میں محمدؔ گلوان کو کشمیر سے جلاوطن کیا گیا تھا۔ یا وہ خود سکھوں کی دستبرد سے سے بچنے کیلئے بھاگ گیا تھا۔ رسول گلوان کی ماں بلتستان سے لیہہ آئی تھی۔ جہاں ان کی شادی اپنے قبیلے کے ایک آدمی سے ہوئی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان دنوں لیہہ میں گلوان پہنچا تھا۔

آج کل لیہہ میں رسول گلوان کے دو بیٹے، ان کی اولاد اور گلوان نام کے کئی گھرانے آباد ہیں۔

رسول گلوان کی پیدائش لیہہ میں ہوئی۔ بتایا گیا ہے کہ کتاب کی تصنیف کے وقت رسول گلوان کی عمر پینتالیس سال تھی۔ اس حساب سے وہ لگ بھگ ۱۸۷۸ء میں

پیدا ہوا تھا۔ اگر اس سن کو مصدقہ قرار دیا جائے تو رسول گلوان بارہ سال کی عمر میں بطور قلی ینگ ہاسبنڈ کے ہمراہ وسطِ ایشیا کی مشہور مہم پر روانہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے ایک ڈاکٹر ٹرال TRALL کے ساتھ سفر کیا تھا۔ رسول نے خود بھی لکھا ہے کہ اس نے کم سنی میں سفر کیا تھا۔

اس زمانے میں تبت اور وسط ایشیا کے بے آب و گیاہ علاقوں اور لق ودق خطوں کی مسافت انتہائی صبر آزما اور جان جوکھوں کا کام تھا۔ گھوڑے اور انسان سردی اور برفانی طوفان سے مرجاتے تھے۔ راستے میں رہزنوں کا خطرہ تھا۔ کئی دفعہ دل گردہ والے مہم جو بھی ہمت ہار جاتے تھے۔ چنانچہ صحرائے گوبی میں سفر کرتے ہوئے ینگ ہاسبنڈ نے لکھا ہے۔

"ایک رات میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں کتنا احمق ہوں کہ جو یہ سفر کر رہا ہوں۔ اور میں نے قسم کھائی کہ آئندہ میں روئے زمین کے ایسے ویران علاقوں میں پھر کبھی سفر نہیں کرونگا"

ایک قلی کا کام زیادہ مشکل تھا۔ اسے کپڑے دھونا، کھانا پکانا، ایندھن جمع کرنا اور حتیٰ کہ کبھی سامان بھی اٹھانا پڑتا تھا۔ وہ عموماً پا پیادہ سفر کرتا تھا۔ کئی یورپی چھوٹی غلطیوں پر اُن کو سزائیں دیتے تھے۔

رسول گلوان کے سفر کی تاریخوں اور دوسری جزئیات کی تمام کڑیوں کو ملانا بہت مشکل ہے کیونکہ جن سیاحوں کے ساتھ رسول نے سفر کیا تھا ان میں سے اکثر وں کے سفر کے ریکارڈ دستیاب نہیں ہیں۔

رسول گلوان نے ۱۸۹۰ء میں ینگ ہاسبنڈ کے ساتھ سفر کیا ۱۸۹۲ء میں وہ لارڈ ڈنمور کے ہمراہ دنیا کے بلند ترین مقام پامیر گیا۔ ۱۸۹۵ء میں جارج، آر، لیٹل ڈل کے ساتھ دشوار گزار علاقوں سے ہوتا ہوا وہ تبت کی راج دھانی لہاسہ کے نزدیک پہنچا اس سال ارتھر نیوے کے ہمراہ قراقرم اور بلتستان کے بالتورو اور سیاچن کے مشہور گلیشروں کے سفر پر روانہ ہوا۔ اس دوران مسٹاسیر کی ۲۵ ہزار فٹ بلند چوٹی

سر کی گئی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں وہ فلپس اور چیرچ کے ساتھ شکار کی ایک مہم پر وسط ایشیا گیا۔ مہم سے واپس آ کر فلپس اور چیرچ نے لیہہ میں رسول کو ایک تقریب میں دستار بندی کی اس کے بعد یکے بعد دیگرے وہ کئی مہمات میں شامل ہوا۔ ان میں مارٹاٹن، ہاورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر رونالڈ ڈکسن، روبرٹ براٹ وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۴-۱۹۱۳ء میں اطالوی محقق ڈاکٹر فلیپو فلیپی کی مہم قراقرم میں وہ میر کارواں تھا۔ کئی مہمات میں اسے اپنی ذہانت، دیانت، اور تجربے کی وجہ سے کارواں لیڈر بنایا گیا تھا۔ جن کی تفصیلات کہیں بھی دستیاب نہیں ہیں۔

یہاں رسول گلوان سے متعلق ینگ ہاسبنڈ کے تاثرات کا ذکر کرنا مناسب رہے گا۔ وہ لکھتا ہے۔

”رسول گلوان ایک محنتی، جفاکش اور تنومند انسان ہے۔ اس پر بڑے بڑے کوہ پیماؤں کو ناز ہو سکتا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک دانشمند اور نہایت ہی وفا شعار انسان ہے۔ میں نے اس جیسا شکر گزار آدمی اپنی زندگی میں شاید ہی کوئی اور دیکھا ہے۔“

لارڈ ڈینمور کی مہم پامیر اہم سیاسی نوعیت کی تھی۔ اُن دنوں لداخ کی سرحد روس، چین، افغانستان اور برطانیہ کی سیاسی سرگرمیوں اور ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بنی تھی۔ لداخ کی طرف روسی پیش قدمی کی باتیں ہو رہی تھیں چنانچہ برطانوی ہند کو بڑی تشویش ہوئی اور ینگ ہاسبنڈ اور ڈینمور کو روسی فوج کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کیلئے یکے بعد دیگرے پامیر روانہ کیا گیا۔

پامیر میں ایک روز رسول گلوان کا سامنا اچانک چند روسی فوجیوں سے ہوا۔ انہوں نے رسول سے باز پرس کی۔ رسول نے اپنی حاضر جوابی سے روسیوں کو قائل کیا اور انہوں نے اسے سگریٹ پیش کیا۔ رسول گلوان نے اس مقام پر افغان فوج کی چند لاشیں دیکھیں۔ یہ فوجی روسیوں کے ساتھ مڈبھیڑ میں مارے گئے تھے۔ واپس آ کر رسول نے ڈینمور کو صورتحال

سے آگاہ کیا۔ ڈینمور بہت خوش ہوا اور رسول کو انعام دیا۔

اس سفر کے دوران چین اور ہند کی سرحد پر واقع ایک وادی کا نام رسول گلوان کے نام پر ’گلوان وادی‘ رکھا گیا۔ یہ وہی گلوان نالہ ہے جسکا اخبارات اور ریڈیو میں ہند اور چین کی جنگ کے دوران بہت چرچا ہوا۔ ’گلوان وادی‘ کی وجہ تسمیہ سے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ پامیر جاتے ہوئے خراب موسم اور دھند کی وجہ سے ڈینمور کا قافلہ راستے سے بھٹک گیا اور ایک دشوار گزار علاقے میں پہنچا۔ قافلے کے ہر فرد کی آنکھوں کے سامنے موت ناچنے لگی۔ رسول گلوان جیسے نوعمر مہم جو کیلئے یہ امتحان کی گھڑی تھی جس میں وہ پورا اترا۔ وہ راستے کی تلاش میں نکلا اور ایک نئی وادی میں وارد ہوا جہاں سے ایک راستے کا سراغ ملا۔ چنانچہ وہ سارے قافلے کو وہاں لے آیا۔ ڈینمور اس دریافت پر بہت خوش ہوا اور اس نے اس وادی کا نام ’گلوان‘ وادی رکھا جس سے آج کل گلوان نالہ بھی کہا جاتا ہے۔

ڈینمور نے رسول کو اپنی کتاب میں OLD FRANC ATELLI کا خطاب دیا ہے۔ اس سے کیا مراد ہے، معلوم نہیں ہو سکا۔

اپنی کتاب THE PAMIR کے پیش لفظ میں ڈینمور نے رسول گلوان اور قافلے کے دوسرے لداخیوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

”یہ میرے لئے ناشکرا پن ہوگا اگر میں اس دیباچے میں ان جفاکش اور ممتاز لداخیوں کو خراج تحسین پیش کئے بغیر ختم کردوں جو رمضان (رمضان علی ایک ارغون جو اس مہم میں کاروان لیڈر تھا) کے تحت میرے ہم سفر تھے۔ انہوں نے اس مہم میں پاپیادہ ۲۲۰۰ میل لمبا سفر طے کیا۔ اس دوران میں ۹ لم دریا اور ام پہاڑی درّے عبور کئے جن میں بہت سارے دنیا کے بلند ترین درّے تھے۔“

وہ آگے لکھتا ہے :۔

”ہمارے ساتھ بلاشبہ دنیا کے بہترین PONEY MEN. گھوڑے والے تھے۔ یہ نے

ان جیسے جفاکش اور محنتی آدمی کبھی نہیں دیکھے۔ انہیں اپنے کام کا پورا علم ہے۔ جب کبھی ان پر کوئی آفت آتی ہے تو یہ گانا گاتے ہیں۔"

اس سفر کے دوران انہوں نے ایک وادی میں انسانوں اور گھوڑوں کی بہت ساری ہڈیاں دیکھیں۔ اس وادی کا نام انہوں نے "رُوسپا لولگیا" یعنی ہڈیوں کی وادی رکھا ۱۸۲۵۰ فٹ بلند ایک درّے پر انہوں نے ایک تتلی دیکھی اور اسی نسبت سے اسکا نام "بے ما لیپچے لا" یا "تتلی درّہ" رکھا۔

رسول گلوان نے اپنی کتاب میں برطانوی مہم جو سیاح جارج، آر، لیٹل ڈل کے ہمراہ تبت کے سفر کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان دنوں یورپیوں کو تبت میں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ لیٹل ڈل کے قافلے نے اصلی راستہ چھوڑ کر شمال کی جانب سے سفر کیا اور اکا دکا تبتیوں کی مزاحمت کا سامنا کرتا ہوا وہ تبت کی راج دھانی لہاسہ کے قریب پہنچا۔ اسی دوران کئی جگہوں پر تبتیوں سے جھڑپ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ جب لہاسہ صرف ۳۴ میل دور رہا تو تبتیوں نے قافلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ قلم رسول اور رسول گلوان گھوڑے پر سوار قافلے سے آگے جا رہے تھے کہ تقریباً ایک ہزار گھوڑ سوار مسلح تبتیوں نے ان دونوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر قافلے کے کیمپ تک واپس پہنچایا۔ یہاں سے قافلے کو واپس لداخ کی طرف لوٹنا پڑا۔ اس دفعہ انہوں نے عام راستہ اختیار کیا۔ رسول گلوان نے تبتی لامے کا بھیس بدلا اور قلم رسول نے ایک چینی لامے کا روپ دھارا اور جگہ جگہ انہوں نے تبتیوں سے کہا کہ وہ دلائی لامہ کے نمائندے ہیں جو قافلے کی حفاظت کیلئے لداخ تک جا رہے ہیں۔ سیدھے سادے تبتی انکی چال میں آ گئے اور قافلے کو بار برداری کیلئے یاک اور ضرورت کا سامان مفت فراہم کیا۔

مسلسل کئی مہینے کے کٹھن سفر کے بعد جب رسول گلوان لیہہ پہنچا تو ایک رات گھر

بر گزارنے کے بعد دوسری صبح اسکو سرینگر جانا پڑا۔ اتنی جلدی اپنی نوجوان چہیتی بیوی سے جدائی پر اس کو ذہنی کوفت ہوئی۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔

"بھاری دل کے ساتھ میں دوسری صبح کشمیر روانہ ہوا۔"

تبت کے سفر میں لٹل ڈِل کی بیوی بھی اپنے شوہر کے ہمراہ تھی۔ مسز ڈِل کی خواہش پر رسول گلوان نے اپنی بیوی کو لیہہ میں اس کے پاس ملاقات کیلئے لیا۔ رسول گلوان نے کتاب میں درّہ مستانگ کے منظر اور اسکی تسخیر کا دلکش نقشہ کھینچا ہے۔ محمد یوسف ٹینگ نے رسول گلوان پر ایک طویل مضمون میں ینگ ہاسبنڈ کے حوالے سے لکھا ہے کہ رسول گلوان شاید پہلا شخص تھا جو چین اور روس کی سرحد پر واقع اس ہیبت ناک درّے پر پہنچا۔ جہاں سال بھر برفانی طوفان کے جھکڑ چلتے ہیں اور انسان کا یہاں پہنچنا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے

رسول گلوان پیدائشی مہم جو تھا۔ سیاحت کا شوق اس کی گھٹی میں تھا۔ وہ کسی لالچ یا مجبوری کی وجہ سے سفر نہیں کرتا تھا۔ بلکہ مہم جوئی کا عشق اور سفر کا جنون اسے صحرا صحرا گلشن گلشن لے جاتا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔ چینی ترکستان میں میرے ایک رشتہ دار نے مجھے دولت کی پیشکش کرتے ہوئے۔ کہا کہ سفر کے مصائب کیوں جھیلتے ہو۔ یہ مال و دولت لے لو۔ جو تمہاری ضروریات کیلئے کافی ہے۔ لیکن میں نے مال و دولت ٹھکراتے ہوئے جواب دیا مجھے حقیقی سکون بادہ پیمائی اور سیاحت میں ملتا ہے۔

ینگ ہاسبنڈ نے رسول گلوان کی کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے۔

"یہ افراد مہم جوئی کے اتنے ہی دلدادہ ہیں جتنے ان کے EMPLOYERS مالکان ہیں وہ کسی لالچ سے نہیں بلکہ اپنے ذوق کی تکمیل کیلئے سفر کرتے ہیں۔"

رسول گلوان اور ان کے ساتھیوں کو نئے نئے مقامات دیکھنے، اجنبی لوگوں سے ملنے اور ان کے رہن سہن رسم و رواج وغیرہ جاننے کا بڑا شوق تھا۔ اپنے مشاہدات اور تجربات کو وہ لیہہ آکر دوستوں کو بڑے چاؤ سے سناتے تھے۔ بچپن میں میں نے لیہہ میں کئی آدمی دیکھے

ہیں جو قلم رسول، صابر مالک، محمد عیسی وغیرہ کے سفر کی آپ بیتی اور احوال سناتے تھے۔ جو انہوں نے ان مہم جوؤں سے سنے ہوتے تھے۔ ان دنوں لوگوں کو بڑی فراغت تھی۔ وہ سفر کے احوال سنانے کیلئے مہم جوؤں کو دعوتیں دیتے اور دوستوں کی محفلیں جمی تھیں۔

رسول گلوان میں کسی چیز کو دیکھنے اور جاننے کا تجسس رہتا تھا۔ پامیر کے سفر کے دوران اس نے ایک مرتبہ اپنے کئی ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود محض اس لئے ایک جنگل کو آگ لگادی کہ وہ لپکتے شعلوں کا منظر دیکھنا چاہتا تھا۔ جب ڈینمور نے خفگی سے پوچھا کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی تو رسول گلوان صاف صاف بولا۔

"میں تماشا دیکھنا چاہتا تھا۔"

رسول گلوان خدا پرست، سادہ لوح اور نیک انسان تھا۔ لیکن زاہد خشک نہیں تھا۔ وہ اچھا گویا تھا۔ اور بنجور (ایک ساز) بڑے چاؤ سے بجاتا تھا۔ اس کے مہم جو ارغون دوست بھی بڑے دلچسپ اور زندہ دل تھے۔ وہ سفر و حضر دونوں میں اپنے ناچ گانوں سے لوگوں کا من بہلاتے تھے۔ خاص کر سنکیانگ کے شہر یارقند اور کاشغر لیہہ کے بعد ان کے تفریحی مشاغل کا مرکز تھے۔ یہ لوگ اپنے آپکو جنگ باشی، یا جنگا مٹی کہتے تھے اور جنگا مٹی بور و لونگی خوب لالہ، گاتے ہوئے والہانہ انداز میں رقص کرتے تھے۔ "جنگ باشی" کے لفظ کا مفہوم اور ماخذ معلوم نہیں ہو سکا۔ کسی نے مجھے اس کا مطلب جنگجو بتایا۔ لیہہ میں یہ گروپ تیر اندازی اور دوسری تفریحی تقریبات میں اپنے رقص و سرور سے رونق لاتے تھے۔ اس گروپ کے ایک زندہ دل اور COLOURFUL آدمی قلم رسول نے لداخیوں کو چینی کھیل 'امبان اور کشتی' سے روشناس کیا۔ قلم رسول اور رسول گلوان نے یہ کھیل کاشغر میں دیکھا تھا۔ امبان اور کشتی کا کھیل پہلے پہل قلم رسول نے رسول گلوان کی دوسری شادی پر لیہہ میں دکھایا۔ رسول کی پہلی بیوی چل بسی تھی۔ تب سے لیہہ کی تفریحی تقریبات میں یہ کھیل، ۱۹۴۷ء تک باقاعدگی سے پیش کیا جاتا تھا۔

سول گلوان جوانی میں بڑا رومان پسند لگتا ہے۔ لیہہ میں وہ اور قلم رسول اپنے دوستوں کے سامنے اپنی بیویوں اور محبوباؤں کا تذکرہ بڑے طمطراق سے کرتے تھے۔ اس نے اور قلم رسول دونوں نے یارقند میں متعہ کیا تھا۔ ان دنوں وہاں متعہ کی رسم عام تھی۔

رسول گلوان کی خود نوشت سوانح عمری میں جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ رسول کی سادگی، سچائی اور صاف گوئی ہے۔ وہ اس زمانے کے ایک مثالی لداخی کیطرح لگی لپٹی کے بغیر ہر بات صاف صاف کہتا ہے اور اپنی کمزوریوں کا ذکر کرنے سے گریز نہیں کرتا ہے۔

سینکیانگ سے لداخ آتے ہوئے وہ ایک دفعہ ایک انگریز سپاہی کے ہاں ٹھیرا تھا۔ انگریز کی خوبصورت بیوی اس پر فریفتہ ہوئی تھی اور وہ اُس کو کسی نہ کسی بہانے روک رہی تھی۔

رسول گلوان اس کے ساتھ اپنے تعلقات کا ذکر فحش انداز میں کرتا ہے۔ اور یہ اعتراف کرتا ہے کہ ایک دن انگریز نے دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور اسکی خوب مرمت کی

کمسنی میں اپنی غریبی کا نقشہ وہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے:-

"میں بکری کی کھال پہنتا تھا۔ اور چند بچوں کے ساتھ گوبر اور برٹسے (ایک سوکھی جھاڑی) چننے جایا کرتا تھا۔ ان میں ایک قلم رسول تھا۔ اپنے پھٹے ہوئے پاپوش سلانے کیلئے ہم سُوا اور دھاگا ساتھ رکھتے تھے۔ جب پیاس لگتی تو پتھر پر برف پگھلا کر اسے کھال پر ڈال کر پی لیتے اور اپنی پیاس بجھا لیتے تھے۔"

رسول کو پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

"مجھے تعلیم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اُن دنوں لیہہ میں کوئی سکول نہیں تھا۔ امیر لوگ گھر پر استاد رکھتے تھے۔ .... بعد میں مہاراجہ نے لیہہ میں ایک مدرسہ کھولا۔ میں اپنا شوق پورا کرنے کیلئے سکول گیا۔"

لیہہ کے اس پہلے پرائمری سکول میں رسول نے کہاں تک تعلیم حاصل کی اس سے متعلق کوئی ذکر نہیں ہے۔ غالباً غربت کی وجہ سے وہ سکول باقاعدگی سے نہیں جا سکا تھا۔ رسول گلوان میں کہانی گوئی کا اچھا فن ہے۔ ینگ ہاسبنڈ نے بھی اسکا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔ "رسول اپنے انداز بیان سے معمولی واقعات کو ادب پارے بنا دیتا ہے۔ کتاب میں جا بجا دلچسپ واقعات کا تذکرہ ہے۔ ایک جگہ تحریر ہے۔ "بچپن میں جب کسی بات پر ماں مجھ سے خفا ہو جاتی تو وہ میرے بدن کی زور سے چٹکی لیتی تھی۔ وہ کبھی سر یا بدن پر ہاتھ نہیں اٹھاتی تھی۔ کیونکہ ماں کا خیال تھا کہ چٹکی لینے سے بچے کو کوئی جسمانی ضرر نہیں پہنچتا۔ (بچہ صرف درد سے بلبلاتا ہے اور سبق لیتا ہے۔)

رسول گلوان کو ترکی زبان میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ غالباً وہ تبتی بھی سے واقف تھا۔ جیسا کہ ان کے تبت کے سفر کی روئیداد سے پتہ چلتا ہے۔ رسول نے اپنی محنت سے انگریزی میں شُد بُد حاصل کی تھی۔ شکور علی نے ینگ ہاسبنڈ کو جب وہ سرینگر میں ریذیڈنٹ تھا ایک خط میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے مجھے خط لکھنے کیلئے کوئی منشی نہیں ملا اس لئے اپنے پرانے دوست رسول سے یہ خط لکھوایا ہے۔ اس لئے اسکی انگریزی تحریر پر ناراض نہ ہونا اور مجھے معاف کرنا۔ ... غریب رسول کا بہت بہت سلام،

مسز ڈیل ڈل رسول گلوان سے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتی ہے :۔

"رسول کا رنگ بہت سیاہ ہے اور شکل وصورت سے وہ بہت خوبصورت ہے۔ اسکی حرکات وسکنات پُر وقار اور اس کی مُسکراہٹ نہایت ہی دلکش ہے۔ اسکی آواز بہت شیریں ہے۔ میں نے ایسی میٹھی آواز آج تک نہیں سنی ہے۔ اسکو دیکھ کر ہر عورت پہلی نظر میں فریفتہ ہو سکتی ہے لیکن اس کا کردار بہت بلند ہے۔"

مذکورہ الفاظ ۱۸۹۵ء کے رسول گلوان کی شبیہ اور شخصیت کو پیش کرتے ہیں۔ اسکے ستائیس اٹھائیس سال بعد ۱۹۲۳ء کے رسول گلوان کی ایک اور تصویر یہ ہے

سامنے ہے جب وہ لیہہ کا استقبال تھا۔

ان کے سر پر ململ کی سفید پگڑی اور بدن پر ڈھیلا ڈھالا لمبا چوغہ ہے۔ اس کے کتابی چہرے پر داڑھی ہے اور ان آنکھوں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اس انسان نے زندگی میں بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔

رسول گلوان لیہہ کے پرانے قبرستان میں ابدی نیند سو رہا ہے۔ لداخ کا یہ عظیم مہم جو انسان ۱۳ مارچ ۱۹۲۵ء میں خدا کو پیارے ہوئے۔ وفات کے وقت انکی عمر پنتالیس سال تھی۔ حکومتِ وقت نے ان کے دو کمسن بیٹوں کو زمین کا ایک بڑا قطعہ کفالت کے لئے دیا۔ اس کی مہم جویانہ خدمات کے اعتراف میں ریاست کی کلچرل اکیڈمی نے کچھ مدت پہلے ان کے مقبرے پر ایک کتبہ لگوانے اور ان کی خودنوشت سوانح عمری دوبارہ شائع کرنے کی تجویز کی تھی۔

○

J & K ACADEMY OF ART CULTURE & LANGUAGES